حیاتِ اقبال

ایم۔ ایس ناز

عقیدت کے جذبے کی پرورش۔ اقبال کو جس لحاظ سے بھی دیکھا جائے، اس کی عظمت کا آفتاب ہمیشہ نصف النہار پر روشن رہے گا۔

ستاروں کی انجمن عروجِ آدمِ خاکی کو دیکھ کر سہمی رہی کہ اس ٹوٹے ہوئے تارے کو مہِ کامل بننا تھا اور وہ بن کر رہا۔ ضیا فروزیوں کی ایک وسیع و عریض دُنیا آج اس کے جلو میں ہے اور وہ خود ایک مقدس روایت اور ادبی فکر کا ایک جاندار محور بن کر آفاق میں جگمگا رہا ہے۔ "حیاتِ اقبال" کو آپ عقیدت کے جوش میں ڈوب کر پڑھیں یا تنقیدی جذبے کی نشتر زنی سے، اقبال کو آپ ہر رنگ و رُوپ میں ایک مہِ کامل ہی پائیں گے۔

"حیاتِ اقبال" ایم۔ایس ناز کی ایک تحقیقی کاوش ہے، جس میں ولادت سے لے کر رحلت تک حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کی زندگی کا ورق ورق ایک نئے اور فکر انگیز انداز میں نظر نواز ہوتا ہے۔ اس کتاب سے ایسے کئی مغالطے دُور ہو جائیں گے جو حیاتِ اقبال سے متعلق بعض فرسودہ اور عاقبت نا اندیش تحریروں سے نئی نسل کے ذہنوں کو مسموم کرنے کے لیے پیدا کیے جاتے رہے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ اقبال پر اصطلاحی معنوں میں موت طاری ہو چکی ہے کہ قضا و قدر کی گرفت سے تو خُدا کے برگزیدہ پیغمبر، صحابہ کرام اور اولیائے کرام اور باجبروت شہنشاہ بھی نہ بچ سکے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال کی سرمدی تعلیمات کے پیشِ نظر موت اُن کی حیاتِ جاوداں پر کبھی فتح نہ پا سکے گی۔ اقبال اُن عناصرِ مرتبہ کا اصطلاحی نام تھا، جو منتشر ہو کر اپنے اپنے مرکز میں جذب ہو گئے، لیکن حقیقی اقبال جس کی حیات افروز صدا یا نعرۂ غیب کی ندائے حق سے ہم آہنگ ہو کر ہمیں سنائی دے رہی ہے، مرنے کے لیے پیدا نہیں ہُوا تھا، وہ آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اقبال کی قدر و منزلت اُن کی زندگی میں بھی کافی ہُوئی، لیکن اُن کی عظمت و رفعت اور جلالت و شوکت کا حقیقی دَور اب شروع ہُوا ہے اور ہم ایسے اقبال کے نیازمند پہلے سے بھی فزوں تر عقیدت و محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر "حیاتِ اقبال" شائع کر رہے ہیں۔

حیاتِ اقبال

ایم۔ایس ناز

شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ

طابع : شیخ نیاز احمد ،
مطبع : غلام علی پرنٹرز ، اشرفیہ پارک ، فیروز پور روڈ ، لاہور
سے چھپوا کر چوک انارکلی ، لاہور سے شائع کیا ۔

مقامِ اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ ، پبلشرز
اَدبی مارکیٹ ، چوک انارکلی ، لاہور ۲

ابتدائی زندگی

انتساب

قائدِاعظم

محمد علی جناحؒ

کے نام

ابتدائی زندگی

سپرو، اقبال کی تحقیق ۱۲
اقبال کے جد اعلیٰ ۱۵
شیخ نور محمد، والد گرامی ۲۱
والدہ مرحومہ کی یادیں ۲۶
صحیح تاریخ پیدائش ۳۱
اقبال منزل ۴۰
بچپن کی یادیں ۴۴
پہلی شادی ۴۹
آفتاب اقبال ۵۰

یورپ سے واپسی تک ۵۳

اقبال کے استاد ۵۸
داغ دہلوی ۵۹
مولانا میر حسن ۵۹
ٹامس آرنلڈ ۶۳
مک ٹیگرٹ ۶۶
ای جی براؤن ۷۰
اقبال جرمنی میں ۷۱
مس بیک ۷۴
اقبال اور عطیہ بیگم ۷۵
یورپ سے مراجعت ۸۴
آثار اقبال ۸۷
پیشۂ وکالت ۹۳
دوسری شادی ۹۷
جاوید اقبال ۹۹
اقبال باکمال ۱۰۳
شکوہ، انجمن میں ۱۰۵
اقبال جاپان جائیں ۱۰۸
شمع و شاعر ۱۰۸
مہاراجہ الور کی ملازمت سے انکار ۱۰۹
مسجد کانپور کا سانحہ ۱۱۰
مولانا گرامی کا تعارف ۱۱۰
مرغ نامہ بر ۱۱۱

اقبال مصور پاکستان ۱۱۳

اقبال اور جوہر ۱۱۶

اقبال اور حسین احمد مدنی	۱۲۲
اقبال اور سر سکندر حیات	۱۲۸
اقبال اور ابوالکلام آزاد	۱۳۰
اقبال اور پنڈت نہرو	۱۳۴
اقبال اور قائد اعظم	۱۴۰
سیاسی زندگی کا تجزیہ	۱۴۵
سر کا خطاب کے بعد	۱۴۷
اقبال کا پاکستان	۱۴۹
اقبال کا سفرِ آخرت	۱۵۱
مرض کا آغاز	۱۵۴
تین ڈاکٹر	۱۵۵
مرض لا علاج	۱۵۶
۲۰ اپریل کی پہر	۱۵۸
نعت خواں کی تلاش	۱۵۹
زندگی کی آخری رات	۱۶۰
موت سے قبل	۱۶۲
اقبال اور بانو	۱۶۳
جاوید کی معنوی تشریح	۱۶۴
آخر شب دید کے قابل....	۱۶۵
پنجابی گیت کی فرمائش	۱۶۶
نسیمے از حجاز..	۱۶۶
انا للہ وانا الیہ راجعون	۱۶۷
ہر دل اداس، ہر آنکھ اشکبار	۱۶۸
نماز جنازہ	۱۶۹
تعزیتیں اور قرار دادیں	۱۷۰
قطعات تاریخ	۱۷۱
مزارِ اقبال	۱۷۳
تصنیفاتِ اقبال	۱۷۵
اقبال کا نثری سرمایہ	۱۸۱
علم الاقتصاد	۱۸۸
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ	۱۸۹
ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء	۱۹۰
اسرار خودی	۱۹۱
رموز بیخودی	۱۹۴
پیام مشرق	۱۹۹
بانگِ درا	۲۰۳
زبورِ عجم	۲۰۶
جاوید نامہ	۲۰۷
بالِ جبریل	۲۱۰
ضرب کلیم	۲۱۲
پس چہ باید کرد	۲۱۴
ارمغان حجاز	۲۱۶
درسی کتب	۲۱۷

خصائص اقبال

نماز اور قرآن ۲۲۷
عشق رسالتمآب ۲۳۰
آرزوئے حج ۲۳۳
غذا اور لباس ۲۳۶
اقبال، درون خانہ ۲۴۰
انداز گفتگو ۲۴۴
یاران محفل ۲۴۷
اقبال کے لطائف ۲۵۰
فیاضی و خودداری ۲۶۱
معیارِ زندگی ۲۶۵

اقبال، عوامی عدالت میں

مے نوشی؟ ۲۷۷
رنگ رلیاں؟ ۲۸۱
طوائف کا قتل؟ ۲۸۸
اقبال قادیانی تھے؟ ۲۹۴

مرقعِ اقبال

باپ کا خواب ۳۰۳
فیض تربیت ۳۰۳
استاد اور شاگرد ۳۰۵
وکالت کا پیشہ ۳۰۶
والہانہ استقبال ۳۰۸
ملازمت سے بیزاری ۳۰۹
درود و سلام ۳۱۰
احترام قرآن ۳۱۰
تلاوت قرآن ۳۱۱
عشق رسول ۳۱۲
احترام رسول ۳۱۳
خدا کی ہستی ۳۱۳
وجود باری ۳۱۴
حقیقت قرآن ۳۱۵
بارگاہ رسالت مآب میں ۳۱۶
لحن داؤدی ۳۱۸
بے مثال مومن ۳۱۸
توکل علی اللہ ۳۱۹
خوفِ خدا ۳۲۰
سوزِ عشق ۳۲۱
گدائے دردمند ۳۲۲
روحانی اضطراب ۳۲۳
شجاعت و دلیری ۳۲۳
انصاف یا فضل ۳۲۴
اقبال خود شناس ۳۲۵
صوفی اقبال ۳۲۵

اسلام اور آرنلڈ ۳۲۶
شعروں کا نیلام ۳۲۷
مغربی اقوام ۳۲۸
کون سے ڈاکٹر ۳۲۸
سائنس کی بے مائیگی ۳۲۹
ایٹمی توانائی کا راز ۳۳۰
پہلا انعام ۳۳۲
عوام کا اقبال ۳۳۲
پنجابی شاعری ۳۳۳
اور ایک پنجابی پہیلی ۳۳۳
نہر دی پوٹ ۳۳۴
دلشاد بہن ۳۳۴
چڑیا گھر ۳۳۵
ایک ہی درزی ۳۳۶
بانارِ حکیماں کی محفلیں ۳۳۷
فکرِ سخن ۳۳۹
تازہ کلام ۳۴۰
شہرت ۳۴۱
تزکیہ نفس ۳۴۱
فنا و بقا ۳۴۲
طرزِ گفتگو ۳۴۳
سادگی ۳۴۳

حقہ نوشی ۳۴۶
صحت اور مذہب ۳۴۷
غریب پروری ۳۴۸
زندہ دلی ۳۴۹
یادیں ۳۵۰
زندگی اور موت ۳۵۲
تبلیغ اسلام ۳۵۳
شعر اور قرآن ۳۵۴
ختم نبوت ۳۵۶
الارض للہ ۳۵۷
قطب پنجاب ۳۵۸
تکلیف برطرف ۳۶۰
باعث رحمت ۳۶۱
پیش گوئی ۳۶۲
حدیثِ جبریل ۳۶۳
اقبال اور گرامی ۳۶۴
غالب اور رومی ۳۶۶
تمنائے بیتاب ۳۶۷
آپریشن ۳۶۸
آخری لمحات ۳۶۹
تدفین ۳۷۰

علامہ اقبال اس کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے، جو سترھویں صدی عیسوی میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ یہ خاندان برہمن تھا۔ اس کی گوت سپرو تھی اور اس خاندان کے زیادہ تر لوگ سرینگر میں سکونت پذیر تھے۔ شرافت و نجابت کی وجہ سے اس خاندان کو معزز و ممتاز حیثیت حاصل تھی اور دوسری ذاتوں کے لوگ اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اقبال نسلاً کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے۔ یوں تو ہندوؤں میں برہمن اپنے مذہبی تقدس کی وجہ سے عموماً معزز سمجھے جاتے ہیں، لیکن کشمیری برہمن کشمیر میں علمی حیثیت سے بھی امتیاز رکھتے تھے۔ اس لیے اقبال نے اس شرف پر ایک جگہ خاکسارانہ لہجے میں خاص طور پر فخر کیا ہے، چنانچہ "ایک فلسفہ زدہ سید" کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں ؎

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کف خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میری آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

ذات پات کے لحاظ سے کشمیری برہمنوں کی جو مختلف قسمیں ہیں، اس کی رو سے اقبال کی گوت یعنی ذات سپرو ہے اور الہ آباد ہائی کورٹ کے مشہور وکیل سر تیج بہادر سپرو اور اقبال چار یا پانچ پشت اوپر ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے[1]۔ اسی طرح اقبال کے اوراشعار

---

[1] اقبال کامل، عبدالسلام ندوی، ص ۲، مطبوعہ اعظم گڑھ

بھی ہیں۔ جن کے سہارے مختلف سوانح نویسوں نے انہیں ان کے بقول کشمیری برہمن نزادہ قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائی روم و تبریز است

[زبور عجم ص ۱۷]

تنم گلی ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نواز شیراز است

[پیام مشرق ص ۲۰۳]

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسری محرمِ اسرار کجاست

سپرو، اقبال کی تحقیق

منشی محمد دین فوق کے علامہ اقبال سے قریبی روابط تھے۔ دونوں میں اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ علامہ اقبال کی زندگی ہی میں منشی صاحب نے ایک مضمون لکھا، جس میں انہوں نے اولین مرتبہ انکشاف فرمایا کہ شیخ صاحب کو کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے ...... شیخ صاحب کے جدِ اعلیٰ قریباً سو، دو سو سال ہوئے، مسلمان ہو گئے تھے۔ گوت ان کی 'سپرو' ہے[1]۔ کہتے ہیں کہ سپرو دراصل 'سب پڑھو' تھا۔ بکثرت استعمال پ ڑھ حذف ہو گئی اور ب پ سے بدل گئی اور سپرو بولا جانے لگا[2] اسی بات کو فوق صاحب نے اپنی تالیف میں دہرایا، جو مذکورہ مضمون کے دو سال بعد شائع ہوئی۔ اس کا حوالہ ڈاکٹر محمد باقر نے بھی اپنی ایک تحقیقی کاوش "اقبال کے اجداد کا سلسلہ عالیہ" میں دیا ہے۔ منشی محمد دین فوق

---

[1] نیرنگ خیال، ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء

[2] علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی، حامد الجلالی ص ۱۹

لکھتے ہیں، میں نے اس لفظ 'سپرو' کی مزید تحقیق کے لیے ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کو ایک خط لکھا۔ انہوں نے جواب میں ارقام فرمایا: مجھے معلوم نہیں 'لفظ سپرو' کے معنی کشمیری زبان میں کیا ہیں؟ ممکن ہے اس کے معنی وہی ہوں، جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں، یعنی وہ لڑکا، جو چھوٹی عمر میں بڑوں کی سی ذہانت دکھائے۔ البتہ کشمیری برہمنوں کی جو گوت 'سپرو' ہے، اس کے اصل کے متعلق جو کچھ میں نے اپنے والد مرحوم سے سنا تھا۔ وہ عرض کرتا ہوں۔

"جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا، تو براہمہ کشمیر مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف بوجہ قدامت پرستی یا اور وجوہ کے توجہ نہ کرتے تھے۔ اس قوم میں سے پہلے جس گروہ نے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل کر کے حکومت اسلامی کا اعتماد حاصل کیا، وہ 'سپرو' کہلایا۔ اس لفظ کے معنی ہیں، وہ شخص، جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے یا جس نے سب سے پہلے پڑھنا شروع کیا، سن تقدم کے لیے کئی زبانوں میں آتا ہے اور 'سپرو' کا روٹ وہی ہے، جو ہمارے مصدر "پڑھنا" کا ہے۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے ان بھائی بندوں کو از راہ تعریض و تحقیر دیا تھا، جنہوں نے قدیم رسوم و تعلقات قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان و علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نام ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا۔ دیوان ٹیک چند (ایم اے) جو پنجاب میں کمشنر تھے، ان کو تحقیق لسان کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ انبالہ میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ لفظ سپرو کا تعلق ایران کے قدیم بادشاہ شاہ پور سے ہے اور سپرو حقیقت میں ایرانی ہیں، جو اسلام سے بہت پہلے ایران کو چھوڑ کر کشمیر میں آباد ہوئے اور اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے برہمنوں میں داخل ہو گئے۔ واللہ اعلم۔ پنجاب میں جہاں تک مجھے معلوم ہے، کوئی گھر مسلمان سپرو خاندان کا نہیں ہے"[1]

---

[1] مکتوب بنام فوق محررہ ۱۶ جنوری ۱۹۳۴ء / تاریخ اقوام کشمیر ج ۲ ص ۴۴-۴۵

تحقیق کے یہی الفاظ تاریخ اقوام کشمیر کی دوسری جلد میں بھی شائع ہوئے - جہاں تک تاریخ اقوام کشمیر کی جلد دوم کا تعلق ہے ، یہ علامہ اقبال کے حین حیات شائع ہوئی - اس لیے یہ یقینی امر ہے کہ علامہ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والے 'نیرنگ خیال' کے مضمون اور پھر ۱۹۳۴ء میں منشی محمد دین فوق کی تاریخ اقوام کشمیر کو ضرور پڑھا ہوگا - اگر علامہ اقبال کو اپنی ذات سے اتفاق نہ ہوتا ، تو وہ اس کی ضرور تردید کرتے اور بالفرض محال غلطی کی صورت میں ایک مضمون کے بعد اس کا اعادہ ہرگز نہ ہوتا - اس لئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ علامہ اقبال برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی ذات 'سپرو' تھی - اس ضمن میں ۱۹۷۴ء میں لاہور کے ایک انگریزی روزنامہ میں اقبال پر ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا - مضمون نگار نے اپنی طرف سے یہ تحقیق پیش کی تھی کہ علامہ اقبال برہمن زاد تھے اور نہ ان کی گوت 'سپرو' تھی - مضمون نگار نے اندھیروں میں بیٹھ کر "اقبال کی ابتدائی زندگی پر نئی روشنی" کے عنوان سے "تحقیق" کی جو روشنی ڈالی ، اس کی حیثیت افسانہ طرازی یا غلط بیانی کے سوا کچھ نہ تھی - صاحب مضمون نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد اقبال کی پہلی شادی کے نکاح نامے پر رکھی ، جو ان کے بقول انہیں علامہ کی پہلی بیوی کے میکے سے قرابت داری کی وجہ سے دستیاب ہوا اور انہوں نے اسے مضمون کے ساتھ طبع بھی کرایا - اس نکاح نامے پر دو گواہوں میں سے ایک گواہ حاجی نور محمد ولد حاتم میر قوم کشمیری سکنہ سیالکوٹ ہیں ، جن سے صاحب مضمون نے بغیر کسی تحقیق کے یہ ثبوت داغ دیا کہ علامہ کے والد نے چونکہ اپنی ولدیت حاتم میر لکھوائی تھی ، اس لیے اقبال کا اپنے آباؤ اجداد کو 'سپرو' (کشمیری پنڈت) کہنا درست معلوم نہیں ہوتا -

اس تحقیق کو محض مفروضہ قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا ، کیونکہ اقبال اور ان کے خاندان کو جاننے والے آج سینکڑوں بزرگ سیالکوٹ اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی موجود ہیں - خود علامہ اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کا یہ متفقہ بیان ہے کہ اقبال کے دادا حاتم میر نہیں بلکہ شیخ محمد رفیق تھے - علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ حاجی نور محمد ولد حاتم میر اُن کے ایک قرابت دار بزرگ

تھے، جن کے بھتیجے فضل دین میرے ان کی رشتے کی بہن (شیخ نور محمد کے بھائی کی نواسی) کی شادی ہوئی تھی ۱؎ اس لحاظ سے شیخ نور محمد، والد گرامی علامہ اقبال اور حاجی نور محمد والد حاتم میر، دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ اگر ایسی صورت نہ ہوتی یا اقبال برہمن نژاد نہ ہوتے تو وہ اپنے اشعار میں اس کا برملا اظہار نہ کرتے اور نہ ہی یہ کہتے کہ ؎

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یادِ ایام گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکہ اقبالؔ
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

اقبال کے جدِ اعلیٰ

بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سید بزرگ کہیں باہر سے سری نگر تشریف لائے۔ علامہ کے جدِ اعلیٰ ان کی پاک نفسی کے باعث ان کے گرویدہ ہو گئے۔ صحبت و محبت نے اپنا کام کیا۔ برہمن نے سید کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور صالح نام پایا۔ سید صاحب نے اپنے دوست کی صالحیت کو دیکھ کر اپنی دختر نیک اختر سے اس کی شادی کر دی۔ اسلام لانے کے بعد صلاح و تقویٰ کی وہ منزلیں طے کیں کہ بابا صالح کے نام سے مشہور ہو گئے۔ رجوع عام ہوا، مزار کشمیر میں ہے، لیکن مقام معلوم نہیں ہو سکا ۲؎

علامہ اقبال کو اپنے خاندان کے برہمن اور گوت سپرو ہونے کے بارے میں ان کے والد گرامی شیخ نور محمد نے بتایا تھا اور علامہ ہر وقت تحقیق و تفحص اور اس روایت کی تصدیق میں لگے رہتے تھے۔ اپنے بھائی شیخ عطا محمد کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں ۳؎

۱؎ روزگار فقیر ج ۲ سید وحید الدین ص ۱۱۸

۲؎ روایت محمد نظیر صوفی، ذکر اقبال، سالک ص ۷

۳؎ یہ خط شیخ عطا محمد کے صاحبزادے شیخ اعجاز احمد کے پاس محفوظ ہے۔

لاہور ۵ ,اکتوبر ۱۹۲۵ء

برادر مکرم ، السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا۔جس سے بہت اطمینان ہوا۔الحمد للہ علی ذالک ۔ جاوید بالکل تندرست ہے، آج پورے ایک سال کا ہو گیا ہے۔اس کی والدہ آج قربانی دینے میں مصروف ہے۔آپ اور والد مکرم یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔حضرت بابا لولی حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ ان کا ذکر خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر، میں اتفاقاً مل گیا ہے ۔والدِ مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا۔ وہ بحیثیت مجموعی درست ہے۔ان کا اصل گاؤں لوجر نہ تھا، بلکہ موضع چکو پرگنہ آدوُن تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ تعلقات اچھے نہ تھے۔اس واسطے ترک دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔واپس آنے پر اشارہ غیبی پا کر حضرت بابا نصر الدین کے مرید ہوئے، جو حضرت نور الدین ولی کے مرید تھے ۔بقیہ عمر انہوں نے بابا نصر الدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں۔اب امید ہے کہ مزید حالات معلوم ہو جائیں گے۔ خواجہ اعظم کا تذکرہ مختصر ہے، مگر یہ مختصر نشان غالباً مزید انکشاف کا باعث ہو گا۔

ان حالات کے معلوم ہونے کا سبب بھی عجیب و غریب ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ایک کتاب 'کشمیری تہذیب و تمدن' پر لکھ رہے ہیں، میں ان کے ممتحنین میں سے ہوں۔ باقی دو ممتحن انگلستان اور آئرلینڈ کے پروفیسر ہیں۔اتفاق سے رجسٹرار صاحب کل آئے ہوئے تھے ۔انہوں نے کسی دوست کو ہدایت کی تھی کہ خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر کا قلمی نسخہ میرے مکان پر پہنچا دے ۔وہ شخص قلمی نسخہ تاریخ مذکور کا لایا ۔میں اس وقت فارغ بیٹھا تھا۔یہی کتاب دیکھنی

شروع کر دی - دو چار ورق ہی الٹے تھے کہ بابا صاحب کا تذکرہ مل گیا، جس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی - غالباً بابا نصر الدین کی اولاد کشمیر میں ہو گی - ان سے مزید حالات معلوم ہونے کی توقع ہے اور کیا عجب کہ ان کے پاس اپنے مریدوں کا سارا سلسلہ موجود ہو -

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے - والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کریں

محمدؐ اقبال

اس خط کے متن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی جستجو ایک روز رنگ لائی اور بالآخر وہ بابا لولی حج کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے، جو ان کے جد اعلیٰ تھے - بابا لولی حج کے اصلی نام کا تو علم نہیں ہوتا، البتہ اقبال کے بزرگوں کے بقول ان کے آبا میں ایک بزرگ نے اتنی مرتبہ پا پیادہ حج کیا کہ ان کا لقب ہی 'لولی حج' یعنی حج کا عاشق پڑ گیا - خود اقبال کو لولی حج اور اپنے خاندانی حالات کی جستجو کا کس قدر شوق تھا، اس کا اندازہ ان کے جذب و سوز سے ہوتا ہے، جو انہیں ورثہ میں ملا تھا اور اسی نے اس "برہمن زادے" کے لیے "رمز آشنائے روم و تبریز" ہونا مقدر کر دیا تھا - علامہ نے اپنے جد اعلیٰ کی نشاندہی اپنے خط میں جس انداز سے کی ہے، اس کا منبع تاریخ کشمیر اعظمی و واقعات کشمیر ہے، جس میں مولف نے ۱۱۶۹ھ بمطابق ۱۷۵۵ء میں باقاعدہ عنوان کے تحت درج ذیل عبارت لکھی ہے :

بابا لولی حاجی -

"از ساکنان موضع چکو پرگنہ آدون بود - زنی خواستہ بود - وقت صحبت زنش خوش نکردہ خلع بمیان آمد - این معنی موجب برودت دلش از دنیا شدہ راہ کعبہ گرفت دوازدہ سال سیاحت کردہ بہ کشمیر آمدہ باشارت غیبی مرید حضرت بابا نصر الدین شد و بقیہ عمر در خدمت و صحبت او گزرانید وقت رحلت، در آستانہ حرا[illegible] بزرگوار آسودہ[1]

---

[1] تاریخ کبیر کشمیر

'تاریخ کشمیر اعظمی' کی مذکورہ تفصیل جو مؤلف نے باب ریشیاں میں بیان کی ہے، وہ علامہ اقبال کے اُس خط کے عین مطابق ہے، جو انہوں نے اپنے بھائی شیخ عطا محمد کو لکھا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک نے محمد نظیر صوفی کی جو روایت 'ذکر اقبال' میں لکھی ہے، اسے اگر درست تسلیم کرلیا جائے، تو پھر علامہ اقبال کے جد اعلیٰ کا نام 'صالح' تسلیم کرلینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

بابا لولی حاجی کے یہی حالات قریب قریب ابو محمد حاجی محی الدین مسکین نے ۱۳۲۱ھ بمطابق ۱۹۰۳ء میں اپنی مشہور تالیف تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار (تاریخ کبیر کشمیر) میں صفحات ۱۲۳-۱۲۴ پر قلمبند کئے ہیں۔ ان ہر دو مؤلفین نے بابا لولی حاجی کا ذکر ریشی حضرات میں کیا ہے۔ لیکن ریشی دراصل کوئی ذات یا گوت نہیں تھی، بلکہ یہ زہاد کا طبقہ تھا، جسے اس نام سے پکارا جاتا تھا۔ جن ریشی حضرات کا ذکر تواریخ کشمیر میں محفوظ ہے ان میں سے کچھ لوگ راجپوت تھے، چند میر، بٹ اور زمیندار تھے، اس لئے علامہ اقبال کے جد اعلیٰ اگر ریش کہلائے تو اس سے ان کی گوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ ریشیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مسکین لکھتا ہے۔

"ریشی — از لفظ رکھی کہ در اصطلاحِ سنسکرت تارکِ دنیا و مشغول بیادِ خدا را گویند و آنکہ ایں لفظ را عربی و فارسی قرار دادہ است، در آں تلادت نمودہ و پی باصلیت این لفظ نبردہ است و معہذا این لفظ در زبان کشمیری مستعمل است و زبانِ کشمیر از لغات و السنۂ کثیر مرکب است۔ چونکہ پیشتر دریں خطہ زبانِ سنسکرت مروج بود، بنا بریں لغایت حال ہم اکثر الفاظ بر السنۂ ساکنان ایں دیار جاریست و اہلِ اسلام معنی آں لفظ بدینگونہ بیان کردہ اند کہ مراد از ریشی شخصی است کہ اولاد و ازواج و منال و متاع و امتعہ و اقمشہ و اراضی و مواشی وغیرہ را ترک دادہ زہد و ریاضت و تقویٰ و عبادات و محنت ہای شاقہ بکار برد۔ و در کوہ و غارہا سکونت نماید و کسی را از آدمیان و حیوانات و وحوش و طیور و ہوام بلکہ بہ ریشینا کہ از زمین میروید ایذا نرساند..."[1]

---

[1] تاریخ کبیر کشمیر، مسکین ص ۸۷-۸۸

اس عبارت کے خلاصہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریشی کا لفظ سنسکرت کے لفظ رکھی سے نکلا ہے، جس کے اصطلاحی معنی تارک الدنیا کے ہیں، جو علائق دنیا سے عزلت نشین ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہے۔ عربی اور فارسی سے یہ لفظ کشمیری زبان میں مستعمل ہوا ان تارک الدنیا لوگوں کے لیے جنہوں نے زہد و ریاضت اور تقویٰ و عبادت کی خاطر اپنے مال و منال کی قربانی دی۔

سلسلہ عالیہ ریشیاں کے مطابق علامہ اقبال کے جد اعلیٰ یعنی بابا لولی حاجی کا سلسلہ ارادت حضرت بابا نصر الدین سے ملتا ہے اور بابا نصر الدین کشمیر کے مشہور بزرگ حضرت شیخ نور الدین ولی کے چوتھے خلیفہ تھے۔ موضع کیموہ میں ۱۰ ذی الحجہ ۷۷۹ھ مطابق ۹ اپریل ۱۳۷۸ء کو پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام سدرہ حاجی تھا۔ روایت کے مطابق ولادت کے بعد حضرت شیخ نور الدین ولی ریشی نے اپنی والدہ کا دودھ پینے سے انکار کیا جس پر کشمیر کی مشہور خاتون للہ عارفہ نے آپ کو گود لیا۔ عنفوان شباب ہی میں آپ نے اللہ سے لو لگالی اور نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگے محمد اعظم دیدہ مری اور محی الدین مسکین نے آپ کے سن رشد، تحصیل علم و ہدایت اور کشف کرامات کے متعلق متعدد روایات قلمبند کی ہیں اور بتایا ہے کہ آپ نے ۲۶ رمضان المبارک ۸۴۲ھ بمطابق ۱۲ اپریل ۱۴۳۹ء میں رویہ دن میں وفات پائی۔ اس وقت قمری سال کے اعتبار سے آپ کی عمر ۶۳ سال اور شمسی سال کے حساب سے ۶۱ سال تھی۔ نعش مبارک کو رویہ دن سے چرار شریف لاکر ایک بڑے تالاب کے کنارے غسل دیا گیا اور پھر نفر ٹینگ ٹیلے پر ہزاروں لوگوں نے جن میں بادشاہ وقت سلطان زین العابدین بھی شریک ہوئے۔ نماز جنازہ ادا کی گئی اور بعد ازاں تکیہ سنگرام ڈار میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ جہاں آج بھی آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

حضرت شیخ نور الدین ولی ریشی کے چار خلیفے تھے۔ بابا بام الدین الشیخ زین الدین بابا لطیف الدین اور چوتھے خلیفہ بابا نصر الدین۔ یہی بابا نصر الدین ہیں، جن کا ذکر علامہ اقبال نے کیا ہے۔ آپ کے والدین صاحبان حشمت و ثروت تھے اور ہندو تھے مشرف بہ اسلام

ہونے سے پہلے بابا نصرالدین کا نام رُوتر تھا۔ کشمیری زبان میں روتر کے معنی پہلوان کے ہیں ، مگر دائے نصیب کہ بچپن میں وہ اکثر بیمار رہتے تھے ۔ ایک رات انھوں نے خواب میں عرفاء کی ایک مجلس دیکھی ۔ میرِ مجلس ملکوتی چہرے کے ایک بزرگ تھے ۔ روتر نے ان سے خوب باتیں کیں ۔ صبح جب آنکھ کھلی ، تو انہوں نے سارا ماجرا والدسے کہہ سنایا جو تحقیق کے بعد آپ کو کیموہ لے آئے ۔ یہاں روتر نے حضرت شیخ نورالدین ولی ریشی کو دیکھا اور انہیں فوراً ہی اپنے خواب کی تعبیر سامنے نظر آگئی ۔ حضرت شیخ نورالدین ولی ریشی کی دعا سے آپ صحت یاب ہوئے ۔ ان ہی کے دست شفقت کو چوم کر مشرف بہ اسلام ہو گئے اور نصرالدین نام پایا ۔ باقی زندگی ان ہی کی صحبت میں گزاری ۔ حضرت شیخ نورالدین ولی کی رحلت کے بعد ان کی مسند خلافت سنبھالی اور ۸۵۵ھ مطابق ۱۴۵۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ وفات کے بعد آپ کے سینکڑوں مریدان باصفا تھے ۔ ان ہی میں ایک بابا لولی حاجی تھے کہ جن کے متعلق کہا جاتا ہے ۔ کہ وہ برہمن زادے تھے ۔ ان کی گوت 'سپرو' تھی ۔ انھوں نے بابا نصرالدین کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا ۔

علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں سکونت پذیر ہوئے ۔ قرائن یہ ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں یا انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں یہ ہجرت ہوئی ہوگی اور ہجرت کرنے والے بزرگ یا تو علامہ کے دادا کے باپ شیخ جمال دین تھے یا ان کے چار بیٹے ، جن کے نام شیخ عبدالرحمٰن ، شیخ محمد رمضان ، شیخ محمد رفیق اور شیخ محمد عبداللہ تھے ۔ اس کا بھی امکان ہے کہ شیخ جمال دین نے اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لے کر ترک وطن کیا ہو ۔ بہرحال یہ تو ثابت ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چاروں بھائی سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے ۔ ان میں سے علامہ اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق اور ان کے دو بھائی شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ محمد رمضان تو سیالکوٹ میں رہتے تھے اور تیسرے بھائی شیخ عبداللہ موضع جیٹھی کے میں[۱] معتبر حضرات کا بیان ہے کہ پہلے پہل علامہ اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق نے یہاں سکونت اختیار کی ، لیکن عام کشمیری رواج کے مطابق جس میں رحمانا اور غفارا جیسے عرف مروج ہیں ، شیخ رفیقا کہلانے

---

[۱] : روزگار فقیر سید وحید الدین ج ۲ ص ۱۱۶-۱۱۷

تھے۔ کشمیری دھسوں کی تجارت کرتے تھے۔[1]

علامہ کے دادا کی پہلی شادی سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی تھی۔ اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور وہ وفات پا گئیں۔ دوسری شادی جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی۔ یہ بیوی بہت خوبصورت تھیں۔ اس لئے ان کا نام 'گجری' پڑ گیا تھا۔ ان سے شیخ محمد رفیق کے اوپر تلے دس لڑکے ہوئے اور سب کے سب فوت ہو گئے۔ علامہ کے والد شیخ محمد رفیق کی گیارھویں اولاد تھے۔ ان کی پیدائش پر گھر کی عورتوں نے بڑی منتیں مانیں پیروں فقیروں سے دعائیں بھی کرائیں۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کسی نیک دل بزرگ کی دعا قبول ہوئی اور علامہ کے والد نہ صرف زندہ رہے، بلکہ طویل عمر پائی۔ قمری حساب سے ان کی عمر ۹۶ سال اور شمسی حساب سے ۹۳ سال کی ہوئی۔ انہوں نے اپنے قابل فخر بیٹے اقبال کی شہرت، عزت اور مقبولیت کی بہاریں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔[2] علامہ کے والد کی پیدائش کے بعد ان کے والدین کے ہاں ایک اور لڑکا بھی پیدا ہوا، 'صاحب روزگار فقیر' نے اس کا نام غلام محمد اور صاحب 'ذکر اقبال' نے غلام قادر لکھا ہے۔ غلام محمد یا غلام قادر محکمہ نہر میں اوورسیر تھے۔ زیادہ عرصہ روپڑ ضلع انبالہ میں تعینات رہے۔ یہیں اللہ کو پیارے ہوئے۔ وفات سے قبل ہیضہ کا مرض لاحق ہوا۔ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ ان کی فقط دو بیٹیاں تھیں، جن کی اولاد اس وقت بھی موجود ہے۔

شیخ نور محمد، والد گرامی

علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ صاحب ثروت نہ تھے، لیکن شہر سیالکوٹ میں اپنی مذہبی اور اخلاقی پاکیزگی کی وجہ سے قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔ ان پر تصوف کا رنگ بہت زیادہ غالب تھا۔ اقبال نے

---

[1] ذکر اقبال، عبدالمجید سالک ص ۸

[2] روزگار فقیر ص ۱۱۶

اپنی اس آبائی بلکہ خاندانی خصوصیت کی طرف بعض اشاروں میں خود بھی اشارہ کیا ہے۔ ایک شعر میں اپنے فرزند جاوید سے کہتے ہیں

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اس کا مذاق عارفانہ

شیخ نور محمد علم ظاہری کی دولت سے بھی کماحقہٗ مالا مال نہ تھے، لیکن قلب و ذہن میں علم لدنی کا خزینہ رکھتے تھے۔ علما و اصفیاء کی صحبت پاک نے ان کے مس خام کو کندن بنا دیا تھا۔ متقی متورع اور زاہد شب زندہ دار تھے۔ غور و فکر کی عادت کے علاوہ چونکہ تصوّف میں درخور دانی رکھتے تھے، اس لئے بعض ہمعصر اکابرِ علم انہیں ان پڑھ فلسفی کہا کرتے تھے۔ سید ذکی شاہ اور مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کی روایات کے مطابق بعض لوگ تصوّف کی کتابیں پڑھ کر ان کے مشکل مطالب کی تشریح کے لیے شیخ صاحب کی طرف رجوع کرتے تھے۔

شیخ نور محمد کو عرف عام میں ان کی بزرگی اور تقدس کی وجہ سے احتراماً "میاں جی" کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔ میاں جی نہایت وجیہہ و شکیل بزرگ تھے۔ سرخ و سپید رنگ، ریش مبارک سفید، لباس سادہ پہنتے تھے۔ چلنے اور نشست و برخاست کے وقت چھڑی عموماً ہاتھ میں رکھتے تھے۔ نظریں ہمیشہ نیچی رکھتے تھے۔ نہایت متین، ذی عقل، سنجیدہ مزاج تھے۔ بزرگی اور سادگی کی وجہ سے چھوٹے بڑے سب ان کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق شیخ نور محمد کو عرف عام میں شیخ نتھو کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ولادت سے پیشتر ان کے والدین کے اوپر تلے دس لڑکے فوت ہو گئے۔ چنانچہ ان کی پیدائش پر بڑی منتیں مانی گئیں اور ان کے ناک کان چھدوا کر زیور پہنائے گئے۔ ناک میں نتھ ہونے کی وجہ سے وہ عرف عام میں نتھو مشہور ہو گئے۔[1]

علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ میاں جی بلند قامت ہونے کے ساتھ وجیہہ صورت بھی تھے۔ بڑھاپے میں ان کا رنگ کندنی تھا۔ سفید ریش نے چہرے کو

---

[1] اقبال درون خانہ۔ خالد نظیر صوفی ص ۱۵۴

اور ہلورانی بنا دیا تھا - میاں جی نے مرنجاں مرنج طبیعت اور صلح کل مزاج پایا تھا۔ ساتھ ہی عالی ظرف اور بردبار بھی تھے - ان کی زندگی میں کتنے ہی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اپنے مخالفوں اور ناحق ایذا پہنچانے والوں کو انہوں نے معاف کر دیا اور انتقام نہیں لیا - وہ بڑے اصول پسند اور طبیعت کے نیک اور سادہ تھے - انہوں نے کسی مکتب میں تعلیم نہیں پائی۔ بچپن میں وہ حرف شناس ہو گئے، مگر ان کی وہبی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ اردو اور فارسی کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھ سکتے تھے - علامہ اقبال کی جو تصانیف میاں جی کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں، وہ اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتیں - اکثر دیکھنے میں آیا کہ تنہائی میں کلام اقبال اونچی آواز میں پڑھ رہے ہیں اور روتے جاتے ہیں[۱]

اقبال کے والد گرامی گو صوفی منش بزرگ تھے - تاہم ان کا رنگ تصوف ایسا نہ تھا کہ انہیں رہبانیت کی طرف مائل اور زندگی کے فوائد سے بے پروا کر دے - ساری عمر زور بازو سے کمایا اور ہر آن خدا سے دل لگایا - "دل بہ یار و دست بکار" پر ان کا حقیقی معنوں میں عمل تھا - چنانچہ ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے ہاں خیاطی کی ملازمت اختیار کی - ڈپٹی وزیر علی بلگرامی ایک عرصہ تک سیالکوٹ میں رہے - ان کے نام سے ایک محلہ بھی موسوم ہے - سیالکوٹ میں رفاہ عام کے لیے انہوں نے ایک باغ اور ایک حوض بنوایا - بسنت کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ میلہ اسی باغ میں لگتا تھا - شیخ نور محمد نے سب سے پہلے ڈپٹی وزیر علی ہی کے ہاں پارچہ دوزی کی ملازمت کی - معتبر حضرات کا بیان ہے کہ شیخ نور محمد کی اہلیہ ان کی تنخواہ میں سے ایک حبہ نہیں لیتی تھیں، کیونکہ ان کے نزدیک ڈپٹی وزیر علی کی آمدنی کا کثیر حصہ شرعاً ناجائز تھا - ایک دوسری روایت کے مطابق شیخ نور محمد کی بیوی کو تحقیق نہیں، بلکہ صرف وہم ہوا کہ یہ سرکاری افسر شاید رشوت لیتا ہو - اس لئے ان کا معمول تھا کہ ہر مہینے شوہر کی تنخواہ آتے ہی جب تک اس روپے کو دوسرے روپے سے بدل نہ لیتی تھیں، کام میں نہ لاتی تھیں[۲] یہی وجہ ہے کہ تھوڑی مدت بعد شیخ نور محمد کو ڈپٹی وزیر علی

---

[۱] روزگار فقیر، سید وحید الدین ج ۲ ص ۱۲۵-۱۲۶

[۲] اقبال اور اس کی پہلی بیوی، ص ۱۵

بلگرامی کی ملازمت کو خیر باد کہنا پڑا اور برقعوں کی ٹوپیاں سی کر گزارہ کرنے لگے۔ یہ ٹوپیاں اس قدر خوشنما اور مضبوط ہوتی تھیں کہ تھوڑی ہی مدت میں بے حد مقبول عام ہوگئیں اور شیخ نور محمد کو متعدد خیاط ملازم رکھنے پڑے۔ شیخ صاحب کی پیرانہ سالی میں یہ کاروبار ان کے داماد نے سنبھال لیا، لیکن کچھ عرصہ بعد وہ بھی اس دکان کو بڑھا کر چلتے بنے۔ عمر کے آخری حصّہ میں شیخ صاحب کا معمول یہ تھا کہ تقریباً دو بجے رات کو بیدار ہو جاتے۔ حوائج سے فارغ ہو کر نماز تہجد ادا کرتے اور پھر فجر کی اذان تک تلاوت قرآن حکیم میں مشغول رہتے۔ نماز صبح سے فارغ ہونے پر قبرستان تشریف لے جاتے اور فاتحہ خوانی کے بعد واپس گھر چلے آتے۔ پھر ناشتا فرماتے اور اس کے بعد دینی رسائل بالخصوص رسالہ "نظام المشائخ" پڑھتے۔ قدرت نے ہر طرح کے آرام و آسائش سے نوازا تھا۔ ان کی رفیقہ حیات پاکیزہ سیرت و صورت کی مالک تھیں۔ دونوں میاں بیوی کی زندگی صحابہ و امہات المومنین کے اسوۂ پاک کی تقلید کا بہترین نمونہ تھی۔ اکل حلال و صدق مقال ان کے کردار و سیرت کی بنیاد اور عبادت و ریاضت حیات کے آخری لمحات تک ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

شیخ نور محمد شاعر تو نہ تھے، مگر طبیعت شاعرانہ ضرور تھی۔ اپنی رفیقہ حیات کی رحلت کا انہیں اس قدر صدمہ ہوا کہ شاعرانہ جذبات عود کر آئے۔ ایک دن شیخ اعجاز احمد سے کاغذ، قلم اور دوات لانے کے لیے کہا۔ وہ سمجھے کہ شاید علامہ کو خط لکھوائیں گے فرمایا: جو کچھ میں بولتا جاؤں اسے لکھتے جاؤ اور پھر میرے لکھے ہوئے کاغذ کو اپنے چچا کے پاس بھیج دو۔ میاں جی سوچ سوچ کر شعر لکھواتے جاتے تھے۔ غالباً دو نشستوں میں انہوں نے دس بارہ شعر قلمبند کرائے۔ ان اشعار کا کوئی مصرعہ بھی وزن سے خارج نہ تھا۔ ان شعروں میں بس ایک شعر یاد رہا ہے

یہ تنہا زندگی پیری میں نصف الموت ہوتی ہے
نہ کوئی ہم سخن اپنا، نہ کوئی رازداں اپنا

یہ اشعار اعجاز صاحب نے علامہ کو بھیج دیئے۔ انہوں نے کچھ عرصہ بعد اپنی نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں، کاتب سے خوشخط لکھوا کر میاں جی کے لیے ارسال کر دی۔ میاں جی اس نظم

کو اکثر پڑھا کرتے تھے اور پڑھنے میں گریہ طاری ہو جاتا اور زار و قطار رونے جاتے [۱]
اقبال اپنے والد گرامی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس بارے میں متعدد مستند روایات موجود ہیں، لیکن سب سے بڑا ثبوت وہ قطعہ تاریخ وفات ہے، جو ان کے لوح مزار پر کندہ ہے۔ اس میں علامہ نے شیخ نور محمد کو پدر و مرشدِ اقبال کے خطاب سے نوازا ہے قیاس اغلب ہے کہ ذیل کے اشعار اقبال نے اپنے شفیق والد کے تصور کو ذہن میں رکھ کر منظوم کئے تھے ؎

اس کی نفرت بھی عمیق، اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے، اللہ کے بندوں پہ شفیق

انجمن میں بھی میسّر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد معانی میں دقیق

اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

[ضرب کلیم]

شیخ نور محمد اقبال کے فی الواقع پدر و مرشد تھے۔ ایک طرف تو یہ دلچسپ امر ہے کہ میاں جی اکثر ململ کا کرتہ پہنتے تھے، ان کے استعمال شدہ کرتوں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ دور و دراز کے لوگ بھی عقیدت کے طور پر ان کے کُرتے لے جاتے۔ ان کا کرتہ نومولود بچے کو پہنایا جاتا۔ بڑی بوڑھیوں کا اعتقاد تھا کہ اس کرتے کی برکت سے بچہ میاں جی کی طرح نیک نظر، صاحب قلب و بصیرت اور نصیب کے علاوہ طویل العمر ہو گا اور دوسری طرف شیخ نور محمد کی حالت یہ تھی کہ وہ کسی سے باقاعدہ بیعت نہیں لیتے تھے۔ اقبال نے بچپن میں ان کی صحبت سے فیض پایا، وہ لفظاً نہ سہی، معنوی رنگ میں ان کے مرید تھے۔ اس لحاظ سے ان کا اپنے والد بزرگوار کو پدر و مرشد اقبال کہنا بالکل درست ہے۔

---

[۱] روزگار فقیر ج - ۲ - صـ ۱۲۶

والدہ مرحومہ کی یاد میں

علامہ اقبال کی والدہ کا نام امام بی بی تھا - اگرچہ علم سے بہرہ نہ پایا تھا، لیکن نہایت دانشمند اور اپنے محلے اور برادری میں بے حد محترم اور ہر دلعزیز تھیں[1] - اعجاز صاحب بیان کرتے ہیں کہ میاں جی کی شادی موضع سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی - شادی کے کچھ عرصہ بعد ان کے سسرال والے بھی سیالکوٹ ہی میں آکر سکونت پذیر ہو گئے - دادی جی (والدہ اقبال) کو سب 'بے جی' کہتے تھے - ان کے ایک ہی بھائی تھے - وہ کشمیری ٹوپیاں اور دُھسے مختلف شہروں میں لیجا کر فروخت کیا کرتے تھے - ایک مرتبہ اس سلسلے میں گئے تو پھر واپس نہ آئے نہ ہی ان کے متعلق کوئی خبر آئی - 'بے جی' کو عمر بھر بھائی کا غم رہا -

بے جی لکھنا پڑھنا بالکل نہ جانتی تھیں - صرف نماز آتی تھی، جو باقاعدگی سے پڑھا کرتی تھیں - ناخواندہ ہونے کے باوجود بڑی زیرک، معاملہ فہم اور مدبر خاتون تھیں، گھرداری کا سب انتظام وہ خود کرتی تھیں - 'میاں جی' کبھی اس انتظام میں دخل نہ دیتے تھے - اپنے حسن سلوک سے محلے اور برادری کی مستورات میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا تھا - برادری کے گھرانوں کے اکثر جھگڑے فیصلے کے لیے ان کے پاس لائے جاتے تھے اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے صلح صفائی کرا دیتیں - اکثر مستورات ان کے پاس زیور نقدی امانت رکھوا جاتی تھیں، جن کو وہ علیحدہ علیحدہ سرخ رنگ کے کپڑے کی پوٹلیوں میں باندھ کر رکھا کرتیں -

ان کے جذبہ ایثار کا ایک واقعہ ہے کہ میاں جی کے چھوٹے بھائی کے ہاں لڑکیاں ہی ہوتی تھیں - ان کی اہلیہ کو لڑکے کی خواہش تھی اور اس لیے بہت دل گیر رہتی تھیں - دونوں بھائی اکٹھے رہتے تھے - ایک مرتبہ دونوں بھائیوں کی بیویاں امید سے ہوئیں اس مرتبہ بھی بے جی کو اللہ تعالیٰ نے لڑکا عطا کیا اور دیور کی بیوی کے پھر لڑکی ہوئی -

---

[1] ذکر اقبال، سالک ص ۸

ان کے غم و اندوہ کو دیکھتے ہوئے بے جی نے ان سے کہا کہ لڑکا تم لے لو اور لڑکی مجھے دے دو۔ چنانچہ بچوں کا تبادلہ ہوگیا اور بے جی نے لڑکی کو پالنا شروع کر دیا اور ان کی دیورانی نے لڑکے کو۔ کچھ مہینوں کے بعد ایک دن صبح کے وقت دونوں بیدار ہو کر گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئیں۔ بے جی نے لڑکے کے متعلق دریافت کیا تو ان کی دیورانی نے کہا کہ ابھی دودھ پی کر سو گیا ہے۔ جب کافی دیر ہوگئی اور لڑکا بیدار نہ ہوا، تو جا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ فوت ہو چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہونٹوں پر دودھ لگا ہوا تھا۔ بے جی نے پھر وہ لڑکی اپنی دیورانی کو دے دی۔

بے جی نے غربت کے دن بھی دیکھے تھے۔ اس لئے حتی المقدور غرباء کی امداد پر ہمیشہ آمادہ رہتیں۔ یہ ان کا نمایاں وصف تھا کہ مستورات کو خفیہ طور پر نقدی دیتیں۔ دینے اور لینے والے کے علاوہ کسی کو علم نہ ہوتا تھا کہ کس کو اور کیا دیتی ہیں؟ میرے اباجی (علامہ اقبال کے بھائی) مذاق میں ایسی امداد کو "گپت دان" کہا کرتے تھے۔ رخصت پر گھر آتے تو "گپت دان" کے لیے بے جی کو علیحدہ رقم دیا کرتے تھے۔

بے جی کے امداد کرنے کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ محلے برادری کے غریب، مگر شریف خاندانوں کی دس بارہ سال کی عمر کی تین چار لڑکیاں اپنے گھر لے آتیں اور ان کی کفیل ہو جاتیں۔ یہ لڑکیاں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں اور ہماری مستورات سے قرآن کریم ناظرہ اور معمولی دینی تعلیم اردو لکھنا پڑھنا، کھانا پکانا، سینا پرونا سیکھتیں۔ تین چار سال رہنا سب رشتہ تلاش کر کے ان کی شادی کر دی جاتی۔ جتنا عرصہ وہ ہمارے ہاں رہتیں۔ ان کی غور و پرداخت بالکل ایسے ہی کرتیں۔ جیسے گھر کی بیٹیوں کی، اور شادی کے وقت بھی انہیں بیٹیوں کی طرح ہی رخصت کرتیں۔ شادی کے بعد بھی وہ لڑکیاں ہمارے ہاں اسی طرح آتیں، جس طرح لڑکیاں میکے آتی ہیں۔ اگرچہ ان لڑکیوں میں زیادہ تعداد محلے برادری کی لڑکیوں کی ہوتی، لیکن غیر برادری کے لوگ بھی اس سلوک سے مستثنیٰ نہ تھے۔ نواحی گاؤں کا ایک شخص بابا بوٹا ہمارے مکان کے سامنے سالہا سال سبزی فروخت کرتا رہا۔ جب اس کی بیوی فوت ہوئی اور اپنے پیچھے ایک کمسن لڑکی چھوڑ گئی تو بے جی اس کو بھی

گھر لے آئی تھیں اور جوان ہونے پر وہ ہمارے ہی گھر سے اپنی برادری میں بیاہی گئی تھی۔ ایک لڑکی کو بے جی نے سردار بیگم (والدہ جاوید) کے سپرد بھی کیا تھا۔ وہ لڑکی چچا جان کے ہاں لاہور میں پرورش پاتی رہی اور سردار بیگم نے ہی اس کی شادی کی تھی۔ ان لڑکیوں میں سے کچھ تو اب فوت ہو چکی ہیں، کچھ اپنے گھروں میں خوشحال زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ان کے دو ایک لڑکے اب بڑے اچھے عہدوں پر ہیں[1]

بے جی کی رحلت کا علامہ اقبال کو بے حد قلق ہوا اور وہ ایک عرصہ تک والدہ مرحومہ کی یاد میں چھپ چھپ کر آنسو بہاتے رہے۔ گھر میں جب کبھی اہل خانہ کا اجتماع ہوتا اور بے جی کی باتیں چھڑ جاتیں تو اقبال خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔ اس وقت ان کی آنکھیں پرنم ہوتی تھیں۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ مرحومہ ایک دیندار اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ انہوں نے ایک ماں بن کر علامہ کی مذہبی اور اخلاقی تربیت میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ علامہ اقبال نے والدہ مرحومہ کی یاد میں جو نظم لکھی، اس میں بھی اس کی طرف واضح اشارات ملتے ہیں:

خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے میں تری انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

علامہ اقبال کی والدہ مکرمہ کا انتقال ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو ۷۸ برس کی عمر میں اور والد مکرم کی رحلت ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو ۹۵ برس کی عمر میں ہوئی۔ دونوں کو امام صاحب سیالکوٹ کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔ اکبر الٰہ آبادی نے علامہ کی والدہ کی رحلت

---

[1] روزگار فقیر ج ۲ ص ۱۳۳ تا ۱۳۵

پر جو قطعہ تاریخ وفات کہا، وہ آج بھی مرحومہ و مغفورہ کے لوح مزار پر کندہ ہے:

مادرِ مخدومۂ اقبال رفت
سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر بادلِ پر درد و غم
"رحلتِ مخدومہ" تاریخِ وفات
۱۳۳۳ھ

بے جی کے بطن سے میاں جی کے ہاں تین لڑکے تولد ہوئے۔ بڑے صاحبزادے عطا محمد جب پیدا ہوئے، تو شیخ نور محمد کی عمر اس وقت تقریباً ۲۳ سال تھی۔ عطا محمد ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے اور وہ علامہ کے برادر بزرگ تھے۔ انہوں نے معمولی سی تعلیم پائی۔ راٹھوروں کے خاندان میں بیاہے گئے۔ سسرال والے سابق فوجی تھے انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر شیخ عطا محمد کو رسالے میں بھرتی کرا دیا۔ کچھ مدت بعد شیخ عطا محمد ملازمت ترک کر کے رڑکی انجینیرنگ سکول میں داخل ہو گئے اور امتحان پاس کر کے ایم ای ایس میں اوورسیر ہو گئے۔ کافی روپیہ کمایا اور اپنے بھائی اقبال کو اعلیٰ تعلیم دلوانے میں کافی مدد کی۔ حضرت علامہ بھی اپنے برادر بزرگ کے بے حد مداح تھے اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ شیخ نور محمد کے تیسرے صاحبزادے کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ یہ بچہ بے جی نے اپنی دیورانی کی گود میں دے دیا تھا۔ شیخ عطا محمد کے دو لڑکے اعجاز احمد اور مختار احمد تھے، جن کی اولاد آج بھی موجود ہے۔ شیخ صاحب نے ۸۲ سال کی عمر میں ۱۹۴۰ء میں وفات پائی اور سیالکوٹ میں امام صاحب کے قبرستان میں، دفن کئے گئے۔

شیخ عطا محمد اور اقبال کے علاوہ نور محمد کی تین لڑکیاں بھی تھیں۔ منظور احمد ہمشیرزادہ علامہ کے قول کے مطابق اقبال کی بہنوں کی تعداد چار تھی۔ سب سے بڑی فاطمہ بی بی پھر طالع بی بی اور دو چھوٹی محترمہ کریم بی بی اور محترمہ زینب بی بی۔

صحیح تاریخ پیدائش

اقبال کب پیدا ہوئے ؟

یہ سوال ایک عرصہ سے موضوع بحث ہے۔ سب سے پہلے یہ سوال اس وقت زیر غور آیا، جب حکیم الامت کی رحلت ہوئی۔ اخبارات و رسائل نے ان کی رحلت پر تعزیتی شذرات شائع کیے اور حالات زندگی کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی تاریخ و سن پیدائش کے متعلق مختلف اور متعدد روایات پیش کیں۔ لاہور کے سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۷ء لکھا، جب کہ 'انقلاب' نے علامہ کی تاریخ پیدائش دسمبر ۱۸۷۶ء شائع کی، مگر اپنی بعد کی ایک اشاعت میں معذرت کے ساتھ حسب ذیل شذرہ سپرد قلم کیا:

"انقلاب کی ایک سابقہ اشاعت میں اقبال کے جو مختصر حالاتِ زندگی شائع ہوئے تھے ان میں علامہ کی تاریخ پیدائش دسمبر ۱۸۷۶ء دی گئی تھی، جو علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے بیان کے مطابق تھی، مگر اب یہ تحقیق ہوئی ہے کہ علامہ کی تاریخ پیدائش دسمبر ۱۸۷۶ء نہیں، بلکہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳" مطابق ۲۴ ذی الحج ۱۲۸۹ھ" ہے [۱]

لیکن اس "اعلان تحقیق" کے باوجود بہت سے لوگ ایسے تھے، جنہوں نے اس پر صاد نہ کیا اور ان کے ذہنوں میں اقبال کی تاریخ و سن پیدائش کی مستند حیثیت کے بارے میں شدید شبہات پیدا ہو گئے۔ یہ ایک یقینی امر تھا، کیونکہ خود علامہ نے اپنے حین حیات اپنی صحیح تاریخ و سن پیدائش کے سلسلے میں شان بے اعتنائی برتی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف تو وہ زندگی بھر اپنے اجداد کا سلسلہ عالیہ مستند حوالوں سے تلاش کرنے کی جستجو میں مگن رہے اور دوسری طرف انہیں اپنی صحیح تاریخ و سنِ پیدائش کی تصدیق کرنے کا موقع ہی میسر نہ آسکا۔ شاید یہ کام وہ اپنے مداحوں اور نقادوں کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے یہ موضوع ان کی وفات کے فوراً بعد شروع ہوا، گو کہ پاکستان کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں نے باقاعدہ حکومت کی سرپرستی میں چند سال پیشتر تحقیق و تفحص کے متعدد

۱۔ روزنامہ 'انقلاب' لاہور ۷ مئی ۱۹۳۸ء

مراحل طے کرنے کے بعد اس نتیجے کا اعلان کیا کہ علامہ اقبال کی صحیح تاریخ و سن پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے لیکن محققین کے لیے یہ تحقیق حرف آخر کی حیثیت نہیں رکھتی - اس اعتبار سے یہ مسئلہ حل ہونے کے باوجود ابھی تک لاینحل ہے کہ علامہ اقبال کب پیدا ہوئے تھے -

علامہ اقبال کی تاریخ و سن ولادت کے متعلق زیادہ تر یہ تاریخیں اور سنین بتائے جاتے ہیں :

* ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء
* ۱۸۷۵ء
* دسمبر ۱۸۷۶ء
* ۹ نومبر ۱۸۷۷ء

لیکن راقم کی تحقیق یہ ہے کہ ان میں کوئی بھی صحیح نہیں ہے - علامہ اقبال کی اصل تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر اور سنہ ولادت ۱۸۷۳ء ہے - اس امر میں کلام نہیں کہ جب تک علامہ اقبال کے خاندان کی شہادتیں، شاعر مشرق کا تعلیمی ریکارڈ اور میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش و اموات کی تاریخیں سامنے نہ ہوں، اُس وقت تک کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہے - ۱۹۵۵ء میں 'ذکر اقبال' شائع ہوئی، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے شہر کی میونسپل کمیٹی کے اندراجات کو دیکھ کر اس بیان کی توثیق کر دی ہے کہ اقبال کی پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو ہوئی تھی [۱] اسی طرح آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا میں ۱۸۷۶ء کو سن ولادت قرار دیا گیا ہے [۲] مزید برآں حکومت افغانستان نے جو لاجوردی لوح مزار عطا کی، اس پر اقبال کا سال پیدائش ۱۸۷۵ء کندہ تھا - شاید یہی وجہ ہے کہ مشہور مصنف فوق نے ابتدا میں تو اقبال کا سن ولادت ۱۸۷۵ء لکھا، لیکن بعد میں انہوں نے خود ہی اس کی تردید کر دی اور بتایا کہ اقبال کا سال پیدائش ۱۸۷۶ء ہے [۳] - ہیل سخف خان گلاسنیپ

---

۱ - ذکر اقبال، سالک، ص ۱۰

۲ - آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا (بار سوم)، ص ۸۰۵

۳ - تاریخ اقوام کشمیر، فوق، ج ۲ ص ۳۲۵

نے بھی یہی سن پیدائش لکھا ہے[1] اور جی ٹیفریلی نے بھی اقبال کے مختصر سوانح حیات میں قلمبند کیا ہے کہ علامہ ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے[2] اقبال کو ۱۹۳۱ء میں جو بین الاقوامی پاسپورٹ ملا، اس میں ان کا سال ولادت ۱۸۷۶ء درج ہے جبکہ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے دستور کے مطابق مقالہ کی ابتدا میں جو خود نوشت حالات لکھ کر میونخ یونیورسٹی میں پیش کئے اس میں بھی انہوں نے اپنی تاریخ و سن پیدائش ۳ ذی الحجہ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۶ء) لکھا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں پراگ یونیورسٹی کے پروفیسر جان میرک نے ایک مفصل مضمون لکھا، جس میں انہوں نے یہ تحقیق کی کہ اقبال کی تاریخ و سن پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے[3] ڈی کو بیکو[4] اور جے ڈیلو فلوک[5] نے اپنی اپنی تحقیقی کاوش میں لکھا ہے کہ اقبال ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ گاٹفیلڈ سائمن نے اپنی کتاب میں اقبال کا سن ولادت ۱۸۷۷ء درج کیا ہے[6]

اقبال کی تاریخ ولادت کے مسئلے کو تحقیق و تدقیق سے سلجھانے کے لئے یورپی علماء کے بیانات پر اعتماد کرنا اس قدر مناسب نہیں، جس قدر کہ اقبال کے خاندان والوں کی شہادتوں اور میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے ریکارڈ پر انحصار کرنا ضروری ہے، کیونکہ یورپی مستشرقین نے اپنے بیانات کی بنیاد ان معلومات پر رکھی ہے، جو انہیں پاکستانی مصنفین نے مہیا کیں۔ دلچسپ امر تو یہ ہے کہ جی ٹیفریلی ایسا مستشرق کیسے قابل اعتماد مصنف ہو سکتا ہے، جس نے علامہ اقبال کی وفات بمبئی میں بیان کی ہے۔ حالانکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ اقبال کا انتقال لاہور میں ہوا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر اقبال کے خاندان کے معتبر افراد کی آراء

---

1. Orient Moder No Xiii, 1938, P. 322
2. Die Literaturen Indiens' Potsdrm, 1929, P. 227
3. Archiv Orientalni, P. 54.
4. Hovapeskon Literature, P. 144.
5. Muhammad Iqbal, P. 357.
6. Reform be we Guvgen in Islam, P. 437.

کو پرکھا جاسکتا ہے، لیکن افسوسناک بات تو یہ بھی ہے کہ خود علامہ کے اہل خانہ میں یہ سوال متنازعہ فیہ ہے کہ اقبال کی صحیح تاریخ و سن پیدائش کیا ہے۔ اب جہاں تک میونسپل اندراجات کا تعلق ہے، تو شرح پیدائش و اموات کے سلسلے میں کم از کم برصغیر پاک و ہند کی حد تک تو یہ مستند مانے جاتے ہیں، بشرطیکہ ان کے خلاف کوئی واضح شہادت اور ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو۔

حکیم الامت علامہ اقبال کی پیدائش کے متعلق جو متضاد تاریخیں اور سنین لکھے گئے ہیں، وہ غور و فکر کے حامل ہیں۔ پہلا حوالہ ' ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کا میونسپل کمیٹی کے اندراج کے مطابق روزنامہ' انقلاب' اور سالک مرحوم نے 'ذکر اقبال' میں دیا ہے۔ اگر انقلاب اور سالک کی دی ہوئی تاریخ پیدائش صحیح تسلیم کرلیں تو میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے وقت اقبال کی عمر ۲۱ سال ہوگی لیکن 'نقش اقبال' کے مصنف کی رائے ہے کہ برعظیم میں ایک طالب علم کی عمر میٹریکولیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کرتے وقت عام طور پر اوسطاً ۱۶ سال ہوتی ہے اور ہوشیار طلبہ کے متعلق یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اس امتحان میں نسبتاً بہت کم عمر میں کامیاب ہوئے ہیں۔ پھر جنوری ۱۹۳۸ء میں جب "مسلم اسٹوڈنٹس برادر ہڈ" نے شاعر اسلام کی زندگی میں یوم اقبال منایا تو اعلان کیا گیا کہ ان کی عمر ساٹھ سال ہے۔ لہٰذا یہ دونوں صورتیں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی تاریخ پیدائش کی صحت پر سے اعتقاد متزلزل کرنے کے لیے کافی ہیں[1]

اقبال کی ایک بہن کی یہ شہادت موجود ہے کہ وہ جمعہ کے دن علی الصبح پیدا ہوئے تھے۔ چونکہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو جمعہ نہیں تھا۔ اس لیے اسے اقبال کی تاریخ پیدائش تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے خلاف زبردست شہادت موجود ہے[2] شیخ اعجاز احمد کی والدہ نے انہیں یہ بتایا کہ جب ان کی شادی ہوئی تو اقبال ۵ ویں جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کی

---

[1] نقش اقبال، سید عبدالواحد ص ۱۲

[2] روزگار فقیر ج ۱ ص ۲۳۱

عمر دس بارہ سال کے درمیان تھے۔ اس لحاظ سے ان کی عمر ۱۸۹۳ء میں میٹرکولیشن کے وقت ۱۶ یا ۱۷ سال کی ہو گی۔ اس لئے ان کا سال پیدائش ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء ہونا چاہیئے۔ بہرصورت میں یہ شہادت بھی ۱۸۷۳ء کو اقبال کا سال پیدائش تسلیم کرنے کو خارج از بحث بنا دیتی ہے [1]

اس میں شک نہیں کہ میونسپل کمیٹی کے اندراج کے مطابق شیخ نور محمد کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا اور اس پر تمام مورخین و محققین اور خود اقبال کے خاندان کے ہر فرد کا فیصلہ ہے کہ یہ بیٹا شیر خوارگی کے دنوں ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۷۵ء دسمبر ۱۸۷۶ء اور نومبر ۱۸۷۷ء کے اندراج میں کہیں بھی شیخ نور محمد کے ہاں کسی فرزند کی ولادت کا ذکر نہیں ہے۔

اس سوال پر شیخ عطا محمد کی سب سے چھوٹی صاحبزادی جنہیں دو برس کی عمر ہی میں والدہ جاوید نے گود لے لیا تھا، کے صاحبزادے نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ میں نے تحقیق کا آغاز میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے دفتر پیدائش و اموات ہی سے کیا اور ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک کے رجسٹر پیدائش کی ذاتی طور پر کئی دن تک چھان بین کی اور ایک ایک اندراج کو بنظر غائر دیکھا۔ ان آٹھ برسوں میں شیخ نور محمد صاحب عرف نتھو کے چار بچوں کے اندراجات دستیاب ہوئے، جن کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ نہ تو ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو اور نہ ہی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے، بلکہ ان کی صحیح تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ہے۔ میری والدہ مکرمہ بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے اپنی والدہ ماجدہ (محترمہ مہتاب بی بی) اور اپنی دو پھوپھیوں (محترمہ کریم بی بی اور محترمہ زینب بی بی) سے بارہا یہ سنا ہے کہ حضرت علامہ کی بڑی ہمشیرہ محترمہ طالع بی بی ان سے تقریباً تین برس بڑی تھیں اور علامہ صاحب کی چھوٹی بہن مرحومہ کریم بی بی، ان سے کوئی تین برس چھوٹی تھیں۔ میں نے خود پھوپھی کریم بی بی صاحبہ کی زبانی سنا ہے کہ حضرت علامہ اقبال ان سے تین برس بڑے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت علامہ ان دونوں بہنوں کے درمیان پیدا ہوئے۔ میونسپل کمیٹی

---

[1] نقش اقبال، ص ۱۹ بحوالہ مکتوب شیخ اعجاز احمد

سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش میں جو اندراجات دستیاب ہوئے ہیں، ان کی رو سے دونوں بہنوں کے درمیان دو بھائی پیدا ہوئے، جن میں ایک وفات پا گئے اور دوسرے حضرت علامہ تھے، ان چاروں بہن بھائیوں کی پیدائش کے اندراجات میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش میں اس طرح سلسلہ وار موجود ہیں[1]

نمبر	تاریخ پیدائش	لڑکا یا لڑکی	ولدیت	محلہ	پیشہ/قوم ومذہب	اطلاع کنندہ
۳۳۴	۶ ستمبر ۱۸۷۰	یک لڑکی	نتھو	چوڑی گراں	کشمیری	رفیق
۱۴۰	۲۲ فروری ۱۸۷۳ء	یک لڑکا	نتھو	کشمیریاں	کشمیری	نتھو
۱۵۴۸	۲۶ دسمبر ۱۸۷۳	یک لڑکا	نتھو	چوڑی گراں	مسلمان خیاط	علی محمد ولد غلام محی الدین
۹۶۲	۱۴ نومبر ۱۸۷۶	یک لڑکی	نتھو ولد محمد رفیع[2]	کشمیریاں	مسلمان کشمیری	نتھو

بیان کیا جاتا ہے کہ ۶ ستمبر ۱۸۷۰ کو شیخ نور محمد کے ہاں طالع بی بی تولد ہوئیں، جو علامہ اقبال کی بڑی ہمشیرہ تھیں اور اندازاً تین برس بڑی تھیں۔ یہ اس طرح بھی صحیح ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کے اہل خانہ کے مطابق محترمہ طالع بی بی کا انتقال ۱۳ جولائی ۱۹۰۲ء کو ہوا اور ان کی عمر تقریباً ۳۲ برس تھی۔ طالع بی بی کے شوہر کا نام غلام محمد تھا۔ میونسپل کمیٹی سیالکوٹ ہی میں رجسٹر اموات میں ان کی فوتیدگی کا یوں اندراج ملتا ہے ۔

نمبر	تاریخ وفات	نام	زوجہ	مرد یا عورت	عمر متوفی	پیشہ/قوم ومذہب	محلہ	اطلاع کنندہ
۱۲۵۰	۱۳ جولائی ۱۹۰۲ء	طالع بی بی	غلام محمد	عورت	۳۰ سال	شیخ مسلمان	حکیم حسام الدین	تاج دین

رجسٹر اموات کے مطابق محترمہ طالع بی بی کی عمر تقریباً تیس سال بنتی ہے، جو کہ اطلاع کنندہ کے بیان پر مبنی ہے۔ بالفرض محال یہ عمر شمار کر لی جائے، تو طالع بی بی کا سن پیدائش ۱۸۷۲ء نکلتا ہے، جب کہ اس سال شیخ نور محمد کے ہاں کسی بچے کے تولد ہونے کا اندراج نہیں ہے۔ اس سے یہ بات قرین صحت ہے کہ محترمہ طالع بی بی ہی ۶ ستمبر ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئیں

---

[1] اقبال درون خانہ ص ۱۵۳۔ ۱۵۴

[2] شیخ نور محمد صاحب کے والد کا نام یہاں شیخ محمد رفیق کی بجائے سہواً محمد رفیع لکھا گیا ہے۔

اور ۱۳ جولائی ۱۹۰۲ء میں فوت ہوئیں۔ ان کے بعد شیخ نور محمد کے ہاں ایک لڑکے کی پیدائش کا اندراج ملتا ہے۔ یعنی ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء جو ایک عرصہ تک اور آج بھی بعض کتابوں میں علامہ کے تاریخ و سن پیدائش کے طور پر مشہور ہے۔ شیخ اعجاز احمد کے حوالے سے روزگار فقیر میں لکھا گیا ہے کہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہونے والا بچہ جسے والدہ اقبال نے اپنی دیورانی کی جھولی میں دے دیا تھا، شیر خوارگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ خالد نظیر صوفی نے بھی اپنے خاندان کی مصدقہ شہادتوں کے حوالے سے اسے درست قرار دیا ہے اور کہا ہے اللہ تعالیٰ کو شاعر مشرق کے والدین کا یہ بے لوث ایثار اتنا پسند آیا کہ اسی سال پورے سوا دس ماہ بعد ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو ایک باکمال فرزند عطا فرما کر ان کی دلجوئی فرمائی [لے] اس پر اگر یہ اعتراض ہو کہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہونے والے لڑکے کے باپ کا پیشہ خیاطی لکھا گیا ہے اور باقی تمام مندرجات میں کشمیری درج ہے، تو یہ اعتراض برائے اعتراض ہوگا، کیونکہ یہ خانہ تین قسم کے اندراجات یعنی پیشہ، قوم اور مذہب کے لئے ہے۔ بنا بریں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ شیخ نور محمد کپڑے کی ٹوپیاں بنانے کا کاروبار کرتے تھے اور علامہ کی ولادت کے وقت ان کا کاروبار عروج پر تھا۔ بقول مصنف "اقبال درون خانہ" اس ولادت کے اطلاع کنندہ علی محمد ولد غلام محی الدین رشتے میں نور محمد صاحب کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے ٹھیک تین سال بعد ۱۴ نومبر ۱۸۷۶ء کو ایک لڑکی کا اندراج متعلقہ رجسٹر میں ملتا ہے، جو علامہ کی چھوٹی ہمشیرہ کریم بی بی تھیں۔ ان کی شادی احمد دین صاحب سے ہوئی۔ یکم جولائی ۱۹۵۸ء کو ۸۲ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر اموات میں ان کی فوتیدگی کی تاریخ ۴ جولائی ۱۹۵۸ء اس طرح لکھی گئی ہے:

نمبر	تاریخ وفات	نام	زوجہ	مرد یا عورت	عمر	پیشہ، قوم و مذہب	محلہ	اطلاع کنندہ
۲۴۴	۴ جولائی ۱۹۵۸	کریم بی بی	احمد دین	عورت	۸۶ سال	کشمیری مسلمان	چوڑی گراں	افتخار احمد

لے اقبال درون خانہ، خالد نظیر صوفی ص ۱۵۷

مندرجہ بالا اندراجات کے مطابق محترمہ کریم بی بی کی عمر تخمیناً ۸۶ برس بنتی ہے۔ اس حساب سے ان کا سن پیدائش ۱۸۷۲ نکلتا ہے اور اس سن میں بھی میونسپل کمیٹی کے اندراجات میں شیخ نور محمد کے ہاں کسی بیٹے یا بیٹی کی پیدائش کا اندراج نہیں ہے۔ لہٰذا ۱۴ نومبر ۱۸۷۶ء یوم پیدائش اور ۴ جولائی ۱۹۵۸ء یوم رحلت، علامہ اقبال کی چھوٹی ہمشیرہ کریم بی بی سے متعلق ہیں۔

حضرت علامہ اقبال کی ہمشیرہ جو ان سے تین برس چھوٹی تھیں، ۱۴ نومبر ۱۸۷۶ کو پیدا ہوئیں۔ دلچسپ اور مضحکہ خیز صورت حال یہ ہے کہ صاحب روزگار فقیر کے مطابق شاعر مشرق کی پیدائش ان سے پورے ایک برس بعد ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو ہوئی[1] یعنی "روزگار فقیر" کے مصنف نے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ثابت کرنے کے لیے یہ خیال تک نہیں کیا کہ ان کی چھوٹی ہمشیرہ کب پیدا ہوئیں اور ان کا کب انتقال ہوا۔ اس بوالعجبی کے جواب میں "اقبال درونِ خانہ" کے مصنف کا کہنا ہے کہ ۱۸۷۶ء کی غلط فہمی دراصل اس طرح پیدا ہوئی کہ حضرت علامہ کی دونوں بڑی اور دونوں چھوٹی بہنوں کی عمروں میں تقریباً تین تین برس کا فرق تھا۔ فروری ۱۸۷۳ء میں پیدا ہونے والا لڑکا بھی اپنی بڑی بہن مرحومہ طالع بی بی جنت مکانی سے تقریباً تین برس چھوٹا تھا۔ اس پیدائشی قاعدہ کلیے کے پیش نظر مرور ایام کے ساتھ خاندان میں حضرت علامہ کو فروری ۱۸۷۳ء میں پیدا ہونے والے لڑکے کے تین سال بعد ۱۸۷۶ء میں پیدا شدہ سمجھا جانے لگا۔ بہن بھائیوں کی پیدائش کے ایک جیسے فرق نے اس خیال کو مزید تقویت بخشی۔ چونکہ اس زمانے کے سیدھے سادے لوگ زیادہ تردد میں پڑنے کے قائل نہ تھے۔ اس لئے یہ غلط فہمی آہستہ آہستہ صحیح تاریخ کے مقابلے میں مشہور ہوگئی اور کسی کو بھی اس کا خیال نہ رہا کہ ۱۸۷۶ء میں تو علامہ صاحب کی چھوٹی بہن پیدا ہوئی تھیں۔ چنانچہ حکیم الامت کو بھی اپنے بزرگوں کی اسی روایت کا سہارا لینا پڑا اور اس طرح انہوں نے اپنے تحقیقی مقالہ کے تعارفی نوٹ

---

[1] روزگار فقیر، سید وحید الدین ج ۱ ص ۲۳۰

اور پاسپورٹ میں اپنا سنہ پیدائش ۱۸۷۶ء ہی درج فرما دیا مزید براں حضرت علامہ علیہ الرحمہ کی پہلی بیگم محترمہ کریم بی بی (والدہ آفتاب) کی روایت بھی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو درست ثابت کرتی ہے کہ ۱۸۹۳ء میں شادی کے وقت علامہ صاحب کی عمر بیس سال سے کچھ کم تھی، لیکن نومبر ۱۸۷۰ء کی رو سے آپ کی عمر شادی کے وقت پندرہ سولہ برس تھی اور فروری ۱۸۷۳ء کے مطابق بیس سال سے زیادہ، البتہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے حساب سے اس وقت آپ کی عمر بیس برس سے کچھ کم بنتی ہے[1]

اگر دسمبر ۱۸۷۳ء کی ۲۹ تاریخ کو علامہ اقبال کا یوم ولادت تسلیم کر لیا جائے، تو سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے انیس برس سے زائد عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، جب کہ ۱۸۹۳ء میں کالج میں داخلہ کے وقت ان کی عمر ۱۸ برس لکھوائی گئی۔ اس حساب سے اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۵ء نکلتی ہے، جو کسی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ دور اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ دیندار بھی ہوتے تھے۔ وہ بچوں کو نصابی تعلیم دلوانے سے پہلے قرآنی اور دینی تعلیمات سے آراستہ کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے اس کا اعتراف خود اپنے تحقیقی مقالہ کے تعارفی نوٹ میں ان الفاظ میں کیا ہے!

My education began with the study of Arabic and Persian. A few years after, I joined one of the local school.

(میری تعلیمی زندگی کا آغاز عربی اور فارسی کے مطالعہ سے ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ایک مقامی سکول میں داخل ہوا)

اقبال کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک دیندار اور

---

[1] اقبال درون خانہ ص ۱۶۱

1- The development of Metaphysics in persia.

نیک گھرانے کے پاکیزہ ماحول میں پرورش پائی - والدگرامی نے انہیں شوالہ والی مسجد کے امام مولوی غلام حسین کے دینی مدرسے میں داخل کرادیا - پھر مولوی میر حسن شاہ کی نظر کیمیا اثر نے ننھے منے اقبال کی جبیں سے ان کی قابلیت اور شہرت کی چمک کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اقبال کا اقبال بلند ہوگا - چنانچہ مولوی میر حسن شاہ کی درخواست پر شیخ نور محمد نے اقبال کو دینی تعلیم کے لیے ان کے سپرد کر دیا - ظاہر ہے کہ اس تعلیم میں دو ایک برس لگے ہوں گے - اس کے بعد جب اقبال کو سکول میں داخل کروانے کا مرحلہ درپیش ہوا، تو ان کی عمر، اس فرق کو دور کرنے کے لیے یقیناً کم لکھوائی گئی ہوگی - اسی ضمن میں مرحوم غلام رسول مہر فرماتے ہیں :

"یہ مسلم ہے کہ علامہ مرحوم نے ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور ۱۸۷۳ء کو تاریخ ولادت مان لیا جائے، تو میٹرک پاس کرتے کے وقت ان کی عمر کم و بیش بیس سال کی تھی - وہ بڑے ہی ذہین اور محنتی تھے - یہ امر یقیناً تعجب انگیز سمجھا جا سکتا ہے کہ جو امتحان عموماً پندرہ سولہ سال کی عمر میں پاس کر لیا جاتا تھا، وہ کس وجہ سے بیس سال کی عمر میں پاس کیا؟ آیا انہوں نے کچھ مدت کے لیے تعلیم ترک کر دی تھی؟ میں مرحوم کے ابتدائی حالات کی جستجو میں دو مرتبہ سیالکوٹ گیا تھا اور ان تمام احباب سے ملا تھا، جن سے مرحوم کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم ہو سکتا تھا - سید نذیر نیازی اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی اس سفر میں میرے ساتھ تھے - شمس العلماء مولانا میر حسن مرحوم کے صاحبزادے سید تقی شاہ نے جو علامہ مرحوم کے ہم عمر تھے، بتایا تھا کہ ابتدا میں مرحوم کو دینی تعلیم کے لیے ایک مکتب میں بٹھا دیا گیا تھا - پھر ایک مرتبہ شمس العلماء مولانا میر حسن مرحوم اس مکتب میں گئے تو مرحوم کو مکتب سے اٹھا کر سکول میں داخل کرا دیا - شمس العلماء مرحوم، علامہ مرحوم کے والد ماجد شیخ نور محمد کے دوست تھے اور ان کے فیصلے کو بطیب خاطر قبول کر لیا گیا - یوں میٹرک کے امتحان میں دو تین سال کی تاخیر ہو گئی"[1]

---

[1] پیش لفظ اقبال درون خانہ، از مولانا غلام رسول مہر ص ۱۸-۱۹

اس استدلال اور مذکورہ بالا روایات کی بحث کے بعد "اقبال درون خانہ" کے مصنف کی تحقیق زیادہ قرین صحت معلوم ہوتی ہے کہ اقبال ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء بروز سوموار پیدا ہوئے اور انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۴ سال ۳ ماہ اور ۲۳ دن تھی۔

اقبال منزل

یہ وہ منزلِ سعید ہے، جہاں شاعر مشرق، حکیم الامت علامہ اقبال نے آنکھیں کھولیں اور کارجہاں دراز میں اولین سانس لی۔ یہ مکان سیالکوٹ کے تاریخی شہر کے قدیم ترین بازار 'چوڑی گراں' میں جسے اب اقبال سٹریٹ کہتے ہیں، برلب سڑک واقع ہے۔ اسی مکان کی نسبت سے سیالکوٹ کی شہرت دنیا کے دور دراز ملکوں میں ہے، اور اسے اقبال نگر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ سیالکوٹ کو جہاں یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی خاک نے کئی انقلاب دیکھے، وہاں اسے اقبال کی ولادت گاہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ یہی وہ شہر ہے، جہاں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جیسے جلیل القدر عالم نے علم و فضل کی شمع روشن کی، جس کی روشنی دربار مغلیہ تک پہنچی۔ اسی خاک نے مولانا میر حسن کو جنم دیا۔ اسی خطۂ زمین سے مولانا عبیداللہ سندھی اٹھے، جنہوں نے سب سے پہلے 'یوم اقبال' جو حضرت علامہؒ کی زندگی میں منایا گیا۔ صدارت فرمائی۔ حضرت علامہ کا بچپن اور اوائل شباب کا زمانہ اسی شہر میں گزرا۔

علامہ اقبال کے آباد اجداد جب کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں وارد ہوئے تو اول اول اس شہر کے محلہ کھٹیکاں کے ایک مکان میں اقامت گزیں ہوئے۔ فروری ۱۸۶۱ء میں علامہ کے دادا شیخ محمد رفیق نے موجودہ جدی مکان خرید کیا، جو اقبال منزل کے نام سے موسوم ہے۔ اس وقت یہ مکان ایک منزلہ تھا اور حویلی کی شکل میں تھا۔ اس میں فقط دو کوٹھڑیاں، ایک دالان، ایک ڈیوڑھی اور چھوٹا سا صحن تھا۔ مکان کچھ کچا اور کچھ پکا پرانے فیشن کا تھا۔ پہلے اس کا صدر دروازہ صرف محلہ وباب کی گلی میں کھلتا تھا، لیکن جب از سر نو تعمیر کیا گیا، تو اس کا بڑا دروازہ سڑک کی طرف بنا دیا گیا۔ اس مکان کی تعمیر نو اور

وسعت و توسیع کیونکر ہوئی۔ اس طرح کہ :

"دسمبر ۱۸۹۲ء میں اس مکان سے ملحقہ ایک دو منزلہ مکان، جس میں اُس وقت اوپر نیچے دو کوٹھڑیاں، ایک دالان اور ایک باورچی خانہ تھا، علامہ کے والد نے خریدا۔ پھر کوئی دو ڈھائی سال بعد مارچ ۱۸۹۵ء میں دو دکانیں جو پہلے مکانات سے ملی ہوئی بازار کی طرف تھیں، خرید کی گئیں۔ ان تینوں قطعات مکان واراضی کو ملا کر موجودہ مکان تعمیر ہوا۔ جب شیخ اعجاز احمد کے والد علامہ اقبال کے بھائی پنشن لے کر سیالکوٹ آ گئے، تو انہوں نے اس مکان کو از سر نو تعمیر کرایا، جو اب تک موجود ہے۔[۱]"

شاعرِ مشرق اسی مکان کے پرانے حصے میں جو ۱۸۶۱ء میں خریدا گیا، پیدا ہوئے۔ "قدیم حصے کی کونے والی کوٹھڑی کو جس کی دو کھڑکیاں گلی میں کھلتی ہیں، آپ کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے۔[۲] یہ مکان برلب سڑک ہے اور جدی ورثہ تھا، جس کی توسیع علامہ کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد مرحوم نے کی۔ پہلے اس مکان کا صدر دروازہ صرف محلہ وہاب کی گلی میں کھلتا تھا، اب بھی وہ دروازہ موجود ہے، لیکن جب شیخ عطا محمد مرحوم نے مکان کو از سر نو تعمیر کیا، تو اصل مکان میں ساتھ کی ایک عمارت بھی شامل کی۔ اب جو بڑا دروازہ سڑک کی طرف ہے، وہ اسی ملحقہ عمارت کا حصہ ہے۔ دروازے کے ساتھ ہی سیڑھیاں ہیں جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی ہیں، وہاں اصل مکان اور بعد میں شامل کئے ہوئے حصۂ مکان کے دروازے بالمقابل کھلتے ہیں، دروازے کے اوپر ایک تختی نصب کی گئی ہے۔ یہ تختی ۱۹۵۶ء میں اس وقت کے ڈپٹی کمشنر شیخ منظور الٰہی صاحب کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ شیخ صاحب کو علامہ مرحوم سے یک گونہ عقیدت ہے۔ اسی عقیدت کی بنا پر شیخ صاحب کو سیالکوٹ کے شہریوں نے اس کارِ خیر پر مائل کیا اور ایک پُر وقار تقریب اس مقصد کے لیے منعقد

---

[۱] روزگار فقیر ج ۲ ص ۱۲۴

[۲] اقبال درون خانہ، ص ۱۱۱

کی گئی - تختی پر مندرجہ ذیل مضمون کندہ ہے :

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

وہ منزل سعید جس میں
شاعر مشرق ، ترجمان حقیقت ، لسان اسلام
حکیم الامت علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے جنم لیا[1]

اس تختی سے ظاہر تو یہ ہوتا ہے کہ دروازہ جس مکان میں شامل ہے ، اسی میں حضرت علامہ نے جنم لیا ، لیکن حقیقت کچھ اور ہے - دراصل جس کمرے میں علامہ پیدا ہوئے ، وہ قدیمی مکان کے عقب میں گلی کی سطح کے برابر ہے - یہ چھوٹی سی کوٹھڑی تھی - شیخ عطا محمد نے جب اس مکان کو از سر نو تعمیر کیا ، تو اس کوٹھڑی کی حالت بہتر کر کے اسے ایک چھوٹے سے کمرے کی شکل دے دی - روشنی کا بھی بہتر انتظام کیا - توسیع کئے ہوئے حصہ کا یہ کمرہ جزو نہیں - اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مکان کے پرانے حصے کی بالائی منزل میں ایک کمرہ ہے ، جسے علامہ کی جائے پیدائش متصور کیا جاتا ہے ، مگر یہ بات درست نہیں - یہی غلطی مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے "ذکر اقبال" میں کی ہے اور صفحہ ۹ کے سامنے جو تصویر شائع کی ہے ، وہ اسی کمرے کی ہے ، جو دسمبر ۱۸۹۲ء کے بعد خریدا گیا - اسی طرح صفحہ ۱۲ کے سامنے کی تصویر بھی اسی کمرے کی ہے ، جو اس حصے میں واقع ہے -

دراصل جس کمرے کو علامہ مرحوم کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے ، وہ نیچے کا کمرہ ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تختی لگاتے وقت ان حقائق کو نظر انداز کر کے صرف اس بات کا خیال رکھا گیا کہ مکان کا مقابلتاً نمایاں اور دیدہ زیب حصہ کون سا ہے ؟

---

[1] ہفت روزہ قندیل ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء اقبال نمبر

[2] اقبال درون خانہ خالد نظیر صوفی ص ۱۱۲

حضرت علامہ کے متعلقین اور ان کے پرانے محلہ داروں کا کہنا ہے کہ جس مکان پر یہ تختی نصب کی گئی ہے وہ شیخ عطا محمد کے حصے کا مکان تھا۔ خانگی تقسیم میں جو مکان حضرت علامہ کے حصہ میں آیا، وہ محلہ دہاب میں ہے۔ یہ مکان شیخ عطا محمد مرحوم کے مکان سے ایک مکان کے فاصلے پر ہے۔ حضرت علامہ نے یہ مکان ۱۹۳۵ء میں خواجہ محمد شفیع کے ہاتھ فروخت کردیا۔ 'اقبال درون خانہ' میں مذکور ہے کہ جدی مکان، جس میں شاعر مشرق پیدا ہوئے، شیخ عطا محمد صاحب کو ملا۔ انہوں نے جدی مکان سے ملحقہ ایک اور مکان خرید کرکے آج سے تقریباً چھپن ستاون برس قبل موجودہ مکان کا سنگ بنیاد رکھا اور اسے ایک عظیم الشان سہ منزلہ حویلی میں تبدیل کردیا اور اپنے عزیز چھوٹے بھائی کے نام نامی پر اس کا نام "اقبال منزل" رکھا۔[1] اس جدی مکان کی تعمیر نو ہوگئی، لیکن اس کی پرانی ہیئت کو برقرار رکھا گیا دیواریں اور فرش نئے طریقے سے پختہ بنا دیئے گئے۔ ڈیوڑھی، کوٹھڑیاں اور دالان تقریباً پہلے کی طرح برقرار رکھے گئے۔ نیز صحن کا طول و عرض بھی قریب قریب وہی رکھا گیا۔ جو پہلے تھا۔ تعمیر نو میں اس احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا گیا کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ جس کمرے میں پیدا ہوئے تھے، اس کی تاریخی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے۔ اس وقت سے اقبال منزل میں کم و بیش پندرہ کمرے اور سات دکانیں ہیں۔ ان میں ڈیوڑھی سے ملحقہ وہ کمرہ بھی ہے، جہاں علامہ اقبال تولد ہوئے تھے۔

'اقبال منزل' کی اندرونی نشست گاہ میں آج بھی اسی طرح لکڑی کے تختے بچھے ہوئے ہیں، جس طرح اُس زمانے میں تھے۔ ان ہی تختوں پر سفید چاندنیوں کے اوپر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ کر شاعر مشرق حقہ نوش فرمایا کرتے تھے اور رات کو گھریلو محفل جما کرتی تھی۔ انہی تختوں کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ حضرت علامہ جب سیالکوٹ میں قیام فرماتے، تو انہی کے اوپر ان کا پلنگ بچھایا جاتا۔ یہاں پر وہ بیرونی نشست گاہ بھی موجود ہے، جس میں مفکر اعظم لوگوں کو شرف ملاقات بخشا کرتے تھے۔[2] اسی جگہ بعد ازاں اپریل

---

[1] اقبال درون خانہ ص ۱۱۲
[2] ،، ،، ص ۱۱۳

۱۹۴۴ء میں قائداعظم تشریف لائے، پھر ۱۹۵۲ء میں جب مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح سیالکوٹ آئیں، تو انہوں نے اقبال منزل میں قدم رنجہ فرمایا۔ اپریل ۱۹۵۶ء میں مصر کے مشہور ادیب اور پروفیسر ادیب عبدالوہاب المصری مرحوم اقبال منزل تشریف لائے اور اس کمرے کی زیارت کی، جہاں حکیم الامت نے جنم لیا تھا۔ اقبال منزل کا یہ کمرہ برسوں سے زیارت گاہ انام ہے اور اب بھی آئے روز ملکی اور غیر ملکی ممتاز شخصیات اس منزل سعید کو رونق بخشتی رہتی ہیں۔

اقبال منزل میں ایسی کئی اشیاء موجود و محفوظ ہیں جو حکیم الامت کے استعمال میں آتی رہیں۔ وہ آرام کرسیاں جن میں علامہ استراحت فرمایا کرتے تھے، وہ پلنگ جس پر علامہ آرام کرتے تھے، وہ قالین جس نے شاعر مشرق کے قدوم میمنت لزوم کو کئی بار چوما۔ وہ کتابیں جو ان کے زیر مطالعہ رہیں اور تیل وہ دیوار گیر لیمپ آج بھی موجود ہیں جن کی روشنی سے علامہ نے اپنے قلب و ذہن کو منور کر کے ایک عالم کو اپنے افکار سے بقعہ نور بنایا آج بھی جب کوئی اس قدیم مکان میں داخل ہوتا ہے، تو اس ناپختہ صحن کا نقشہ اس کے ذہن میں گھوم جاتا ہے جہاں اقبال نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا، وہ یہیں کھیلتے کودتے جوان ہوئے۔ اسی اقبال منزل میں انہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور ابتدائی اسباق ازبر کئے۔ انٹرمیڈیٹ تک وہ اسی مکان میں لکھتے پڑھتے رہے اور یہیں ان کی پہلی شادی ہوئی۔ اقبال منزل کا ذرہ ذرہ اور گوشہ گوشہ اقبال کی عظمت کی داستان کو دہرا رہا ہے۔ وہ داستان جسے اب تک کتابوں میں پڑھا جا رہا ہے۔

بچپن کی یادیں

ننھے منے اقبال نے ابتدا میں اپنی عظیم ماں کی گود میں پرورش پائی اور ان ہی کے سایۂ شفقت میں پروان چڑھے۔ ان کی والدہ جسمانی پرداخت کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت اور روحانی نشوونما پر بھی گہری نظر رکھتی تھیں۔ ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ اقبال ثابت قدمی سے صراط مستقیم پر گامزن رہیں اور کارگہ حیات میں ہمت و جرأت اور

صبر و استقامت کے ساتھ قدم بڑھانے کی ان میں خوبی پیدا ہو۔ یہ والدہ ماجدہ کی ہی احسن تربیت کا اثر تھا کہ اقبال بچپن سے ہی بڑے پاکیزہ مزاج اور خاموش طبع تھے۔ ان کا بچپن اسی طرح کا تھا، جیساکہ غریب اور متوسط الحال شرفا اور سفید پوش طبقہ کے بچوں کا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے بچپن کی بہت سی یادیں ایسی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال ذہانت و متانت میں دوسرے بچوں سے بہت آگے تھے اور طفلانہ آوارہ گردی سے طبعاً نفور تھے۔ علامہ اقبال کی یہ خوبیاں تو شیخ نور محمد نے ایک خواب میں دیکھ لی تھیں، جب ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے تھے اور فضا میں ایک نہایت خوبصورت پرندہ اڑ رہا تھا۔ میدان میں کھڑے ہوئے ہر فرد کی یہ آرزو تھی کہ یہ پرندہ اس کے ہاتھ لگ جائے۔ لیکن وہ سراپا جمال طائر یک دم فضا سے اترا اور شیخ نور محمد کی گود میں آگرا۔ شیخ نور محمد نے اس خواب کی یہ تعبیر بیان کی کہ میرے ہاں کوئی بچہ ہوگا، جو دنیا میں نام پیدا کرے گا۔ اقبال پیدا ہوئے اور انہوں نے فی الواقعی محمدؐ کے دین کا اقبال بلند سے بلند تر کر دکھایا۔ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹیؒ کا بیان ہے کہ اس زمانے میں سیالکوٹ میں درس و تدریس کے چار مراکز تھے۔

۱۔ مولوی غلام مرتضیٰ کا مکتب

۲۔ مولانا ابوعبداللہ غلام حسن کی درس گاہ

۳۔ مولانا سید میر حسن کا مدرسہ

۴۔ مولوی مزمل کا مکتب

پہلی، دوسری اور چوتھی تین درسگاہوں میں صرف عربیات و دینیات کی تدریس کا اہتمام ہوتا تھا اور مولانا سید میر حسن کے ہاں عربی و فارسی ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چونکہ علامہ اقبال کے والد محترم اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں معارفِ دین کی سماعت کے لیے جایا کرتے تھے اور ان کا رجحان بھی زیادہ تر یہی تھا کہ اپنے بچے کو صرف دینی تعلیم دلوائیں اس لئے انہوں نے اقبال کو مولانا ہی کے ہاں پڑھنے بٹھا دیا۔ مولانا سید میر حسن بھی اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں جایا کرتے تھے۔ ایک دن اقبال کو وہاں دیکھ کر پوچھا: یہ کس کا بچہ ہے؟

73427

جب معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ہے، تو آپ نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ اس بچے کو یہاں سے اٹھا کر میرے پاس لاؤ۔ اسے میں پڑھاؤں گا۔ چنانچہ اقبال مولانا میر حسن کے سپرد ہو گئے اور وہ تعلق پیدا ہوا، جو مدت العمر قائم رہا[1]۔ اقبال درون خانہ میں اقبال کے اولین استاد کا نام مولانا غلام حسن کی بجائے مولوی غلام حسین مذکور ہے اور سیالکوٹ کے اکثر بڑے بوڑھوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ اقبال کے پہلے استاد مولوی غلام حسین تھے، جو ان دنوں شوالے والی مسجد کے امام تھے۔ امامت کے ساتھ ساتھ دینی مدرسہ بھی چلاتے تھے اور مولانا میر حسن شاہ کے مولوی غلام حسین کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے۔ اقبال مولانا میر حسن شاہ صاحب سے تقریباً دو سال تک عربی اور فارسی ادب کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد حکیم حسام الدین وہ گوشہ علم و حکمت تھی، جہاں مولانا میر حسن اپنے فرصت کے اوقات میں فرش پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ شاگرد ان کے روبرو زانوئے ادب تہہ کرتے تھے اور علم و ادب کے اس سرچشمے سے سیراب ہوتے تھے۔ حکمت قرآن کا درس ہوتا تھا۔ ادب اور شاعری کے رموز کی شرح ہوتی تھی۔ ظرافت کے سوتے پھوٹتے تھے۔ پند و نصائح کا باب کھلتا تھا اور یہاں بیٹھ کر مولانا میر حسن شاہ نوجوانوں کو آنے والی زندگی کے لیے تیار کرتے تھے۔ وہ زمانہ بھی خوب تھا اور لوگ بھی کیسے تھے، نہ وہ فیسوں کے محتاج تھے، نہ انہیں کرسیوں اور میزوں کی ضرورت تھی، بس فرش مسجد پر بیٹھ کر اوج ثریا کی باتیں ہوتی تھیں۔

اقبال کو علم کے حصول کا شوق عشق کی حد تک تھا۔ یہ جنوں یہ عشق ایسا تھا کہ رات کو نیند میں اٹھ اٹھ کر پڑھتے تھے۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ علوم سے بہرہ ور ہو جائے اور اس کا ستارۂ اقبال جلد چمکنے لگے۔ ایک دفعہ نصف شب کے قریب اقبال کی والدہ کی آنکھ اچانک کھل گئی تو انہوں نے دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں ننھے منے اقبال کو بیٹھے ہوئے پڑھتے دیکھا۔ انہوں نے مختلف طریقوں سے اقبال کی

---

[1] ذکر اقبال، سالک ص ۱۱

توجہ پڑھائی سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرانے کی سعی کی، لیکن اقبال مطالعہ کتاب میں اس قدر منہمک و مستغرق تھے کہ انہوں نے والدہ مکرمہ کی آواز کو بھی نہ سنا۔ والدہ بالآخر بستر سے اٹھیں اور جا کر اقبال کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا کہ آدھی رات ہو چکی، اب سو جاؤ۔ اس پر اقبال بولے "بے جی سویا ہوا تو ہوں" اور والدہ یہ سن کر حیران و پریشان ہو گئیں [۱]

ایک دوسری روایت کے مطابق بچپن میں اقبال کو کبوتروں سے بے حد لگاؤ رہا۔ چونکہ اس زمانے میں فراغت زیادہ تھی، اس لیے لوگ عجیب عجیب مشاغل رکھتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک مشغلہ کبوتر پالنا بھی تھا اور سیالکوٹ کے محلہ کشمیریاں میں تو یہ شغل ان دنوں انتہا پر تھا۔ آج بھی وہاں اس کے کافی آثار ملتے ہیں۔ چونکہ بچے پرندوں اور جانوروں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے اس ماحول میں کبوتروں کی طرف راغب ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ والد اقبال نے ان کا شوق دیکھ کر انہیں گھر ہی میں کبوتر رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی، تاکہ وہ کبوتروں کے شوق میں غلط صحبت میں نہ پڑ جائیں [۲]

اقبال کی بھاوج یعنی شیخ عطا محمد کی اہلیہ محترمہ فرماتی ہیں کہ اقبال بچپن ہی میں بہت ذہین تھے۔ سخن فہمی سے ان کی طبیعت کو خاص نسبت تھی۔ میں رات کے وقت دوسری عورتوں کے ساتھ ازار بند بنا کرتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ اقبال بازار سے منظوم قصے لے کر آتے اور ہمیں سنایا کرتے تھے۔ ان کی آواز بہت شیریں تھی — محترمہ کریم بی بی، اقبال سے تین برس چھوٹی تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بھائی صاحب کو بچپن میں میری گڑیوں سے خدا واسطے کا بیر ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر وقت ان کی تاک میں رہتے اور جب بھی داؤں چلتا، ان کے ناک کان کاٹ دیتے اور آنکھیں پھوڑ ڈالتے یا پھر دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر بیچاری گڑیا کو پرزے پرزے کر دیتے۔ میں جب اپنی گڑیوں کو اس حال میں پاتی تو رو رو کر برا حال کر لیتی۔ میاں جی

---

[۱] علامہ کی بڑی بھاوج بیگم شیخ عطا محمد کی روایت، اقبال درون خانہ ص ۹

[۲] اقبال درون خانہ ص ۱۰

اور بے جی بھائی صاحب کو ڈانٹتے مگر وہ شاید اپنی طبیعت سے مجبور تھے یا مجھے تنگ کرنا انہیں پسند تھا کہ گڑیوں کو سامنے دیکھ کر اپنے اوپر ضبط نہ رکھ سکتے۔[۱] اس واقعہ سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اقبال کی یہ عادت اُس جذبہ اور عقیدہ کی رہین منت تھی، جس کے تحت حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کو تین سو ساٹھ بتوں سے پاک کیا اور یہی سپرٹ برصغیر کے عظیم فاتح محمود غزنوی میں موجود تھی، جس نے کہا تھا کہ محمود بت شکن ہے، بت فروش نہیں۔ اقبال بھی گویا بچپن ہی سے بت شکن تھے۔

چھوٹی ہی عمر میں اقبال بڑے ذہین تھے۔ آپ کی ذہانت اور حاضر جوابی کا یہ واقعہ تو عام ہے کہ ایک روز جماعت میں ذرا دیر سے پہنچے۔ استاد نے استفسار کیا: اقبال دیر سے کیوں آئے ہو؟ اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ جناب اقبال دیر ہی سے آیا کرتا ہے۔ ایک چھوٹے سے بچے سے، جس کا ذہن عموماً سکول کی ابتدائی تعلیم کے زمانے میں ناپختہ ہوتا ہے، اس قسم کا جواب یقیناً حیرت انگیز اور چونکا دینے والا تھا۔ اس کے بعد استاد اور اپنے ہم جماعتوں کی نظروں میں اقبال کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔

مولانا میر حسن شاہ کے حسب ارشاد، شیخ نور محمد نے اقبال کو سکاچ مشن ہائی سکول میں داخل کرا دیا تھا۔ اسی سکول کا واقعہ ہے کہ اقبال جب چوتھی یا پانچویں میں زیر تعلیم تھے، ایک روز ان کی جماعت میں ایک مرد قلندر، اونچے لمبے اور سرخ و سپید اپنے حال میں مست آن وارد ہوئے۔ بڑی شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور بغیر کچھ کہے سنے واپس چلے گئے۔ استاد نے آپ سے ان کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا۔ بعد میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ اس مرد درویش نے کسی سے بھی ان کے متعلق دریافت نہ کیا تھا اور خود ہی سیدھے ان کے پاس جا پہنچے تھے۔ اس کے بعد بھی وہ مرد قلندر کبھی کبھار اقبال سے ملنے کے لیے آتے رہے۔[۲] اقبال سکول میں داخل ہونے کے بعد بھی دینیات کے درس میں شرکت کے لیے مولوی غلام حسین کے مدرسے میں

---

[۱] اقبال درون خانہ ص ۵۷

[۲] اقبال اور ان کی پہلی بیوی حامد الجلالی ص ۲۱

چلے جایا کرتے تھے اور مولانا میر حسن شاہ صاحب کے درس میں تو ان کی عدم شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میر حسن، اقبال کو عزیز تھے اور اقبال میر حسن کو، گویا دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ اسی ذوق و شوق میں انہوں نے مڈل کے امتحان میں وظیفہ حاصل کیا اور پھر ایک مصدقہ روایت کے مطابق ۱۸۹۳ء میں میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ جس روایت کے تحت اقبال کے سال پیدائش کو ۱۸۷۷ء قرار دیا گیا ہے، اس کے مطابق بھی اقبال نے اسی سنہ میں گجرات سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ ان دنوں سیالکوٹ میں امتحانات کا سنٹر نہیں تھا، اس لیے آپ نے گجرات سنٹر سے امتحان دیا اور پاس ہوئے۔

پہلی شادی

جن دنوں اقبال امتحان دینے کے لیے گجرات گئے ہوئے تھے، وہاں کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد خاں نے انہیں ایک نظر دیکھا اور دیکھتے ہی پسند کر لیا اور اپنی صاحبزادی کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ امتحان کا ابھی نتیجہ بھی نہ نکلا تھا کہ اقبال زنجیر ازدواج میں جکڑ دیئے گئے۔ جب بارات سیالکوٹ سے گجرات جانے کے لیے تیار ہوئی۔ سہرا بندھ گیا، اقبال دلہا بن کر گھوڑی پر سوار ہو چکے، تو ایک تار آیا۔ یہ امتحان میں کامیابی اور خوشخبری کا تار تھا۔ اقبال اس وقت اپنے آپ کو کمسن سمجھتے تھے اور مزید تعلیم کے حصول اور شوق کی خاطر ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن اس وقت کے رواج کے مطابق والدین نے شادی طے کر دی اور اقبال نے اپنے بزرگوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے سر تسلیم خم کر لیا۔ جلالی رقمطراز ہیں:

"اقبال کی عمر بیس سال کی بھی نہ تھی کہ شیخ نور محمد صاحب نے اپنے حسن انتخاب سے ایک عظیم المرتبت خاندان میں ان کی شادی کر دی۔ یہ شادی غالباً ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ یہی اقبال کی پہلی بیوی ہیں، جن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی بہو بنا کر ان کے والد محترم شیخ نور محمد صاحب اور ان کی والدہ ماجدہ اپنے گھر لائی تھیں [1]"

---

[1] اقبال اور ان کی پہلی بیوی، حامد الجلالی ص ۲۱

اقبال کی اس پہلی بیوی کا نام کریم بی بی تھا اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حجاز میں پیدا ہوئیں اور دس برس تک اپنے والد بزرگ کے ہمراہ وہیں قیام پذیر رہیں ۔ کریم بی بی بے تکان عربی بولتی تھیں اور بہت سلیقہ شعار اور اطاعت گزار تھیں ۔ ان کے والد ڈاکٹر شیخ عطا محمد خان معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ گجرات میں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اور چیف میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے ریاست مالیر کوٹلہ میں سکونت پذیر رہے ۔ ان کا قیام وائس برٹش کونسل کی حیثیت سے کامران اور جدہ میں بھی رہا ۔ فزیشن اور سرجن کی حیثیت سے ان کی گراں قدر خدمات کے پیش نظر ملکہ وکٹوریہ نے انہیں گولڈ میڈل عطا کیا ۔ ۲۹ سال کی عمر میں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کئے گئے اور دو سال تک انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر رہے ۔ میانوالی میں سرجن تھے ۔ جب ۱۹۱۰ء میں ریٹائر ہوئے ۔ غریب پرور تھے اور ۱۳ بیواؤں کے نام انہوں نے وظیفے جاری کر دیئے تھے ۔ متمول اور معزز ہونے کے باوجود مکمل درویش تھے اور درویشی کی یہ قدر مشترک تھی کہ جس کی بنا پر انہوں نے اپنی عزیز ترین بیٹی کریم بی بی کا رشتہ ، اقبال سے طے کر دیا اور یوں شیخ نور محمد کی شرافت اور درویشانہ طبیعت نے ان کے دل میں گھر کر لیا ۔ خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا ۔ اس وقت ان کی عمر ۶۳ سال تھی ۔ محترمہ کریم بی بی کے بطن سے علامہ کے دو بچے پیدا ہوئے ۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا ۔ ذکر اقبال میں سالک مرحوم نے لڑکی کا نام مریم لکھا ہے ، جو درست نہیں ۔ لڑکی نام معراج بیگم تھا اور وہ علامہ کی والدہ محترمہ کی وفات سے پہلے نہیں ، بلکہ بعد میں فوت ہوئیں تاریخ دسن وفات ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء بتایا جاتا ہے ۔ عمر اٹھارہ برس تھی ۔ کریم بی بی کے بطن سے اقبال کے ہاں جو بیٹا پیدا ہوا ، اس کا نام خود علامہ اقبال نے آفتاب رکھا ۔

آفتاب اقبال

آفتاب اقبال پنڈ دادن خاں ضلع سرگودھا ... پور میں ۱۸۹۹ء میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے ، جہاں ان دنوں ڈاکٹر عطا محمد خاں تعینات تھے ۔ آفتاب نے ابتدائی تعلیم اسکاٹ مشن

ہائی سکول سیالکوٹ میں حاصل کی۔ پھر آپ کو سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں داخل کرا دیا گیا، جس کے پرنسپل اس زمانے میں ایس کے رودرا تھے۔ آفتاب اقبال کو مسٹر این کے سین، پی این مکرجی اور سی ایف اینڈ ریوز ایسے علمی شہرت رکھنے والے پروفیسروں سے فلسفہ اور دیگر مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں سے آفتاب اقبال نے بی اے آنرز کا امتحان فلسفہ میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۲۱ء میں ان ہی اساتذہ کی سرپرستی میں فلسفہ میں ایم اے کیا۔ پھر آپ کو لندن بھیج دیا گیا۔ جہاں سے آپ نے ۱۹۲۴ء میں تحقیقات فلسفہ میں ماسٹر آف دی آرٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک آپ مدرسۃ السنہ شرقیہ لندن یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے لیکچرر رہے۔ ۱۹۳۱ء میں لنکن ان لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور وطن واپس آ گئے۔ بعد ازاں ۱۹۳۶ء تک اسلامیہ کالج کلکتہ میں انگریزی زبان و ادب اور یونیورسٹی آف کلکتہ میں فلسفہ کے لیکچرر رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران گورنمنٹ آف انڈیا کے سپلائی کے دفتر میں آپ سے دو سال تک ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام لیا گیا۔ پھر آپ ۱۹۴۱ء تک اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی زبان و ادب کے لیکچرر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی اور بعد ازاں کراچی میں پریکٹس کرتے رہے۔

آفتاب اقبال کی اہلیہ محترمہ رشیدہ بیگم ہیں، جو شاہ جہاں کے عہد کے سپہ سالار میرزا دوست بیگ کی اولاد میں سے ہیں۔ رشیدہ بیگم کے والد بزرگوار میرزا روشن بیگ جب برما میں تھے، تو یہیں وہ پیدا ہوئیں۔ ایف ایس سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ آفتاب اقبال کی رفیقۂ حیات بنیں۔ ان کے بطن سے تین صاحبزادے ہیں۔ آزاد اقبال، نوید اقبال اور دقار اقبال۔ والدہ آفتاب حضرت علامہ اقبالؒ کی وفات کے آٹھ سال بعد تک زندہ رہیں، اور ۱۹۴۶ء میں انہوں نے وفات پائی۔

یورپ سے واپسی تک

شاعرِ مشرق بچپن ہی میں بڑے خوش خط تھے۔ اس بات کا ثبوت وہ چند کتابیں ہیں، جو افتادِ زمانہ کے ہاتھوں بچ کر اب محفوظ ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال کی زندگی میں بے شمار اشیاء ان کے زیرِ استعمال رہیں، لیکن ان کے انتقال کے بعد سادگی یا لاعلمی کی بنا پر ان میں سے بہت سی ضائع ہو گئیں۔ خوش قسمتی سے صرف وہ چند کتابیں محفوظ رہیں، جو حضرت علامہ نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں پڑھیں اور ان پر کہیں اردو اور کہیں انگریزی میں اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ ان کتابوں کی کیفیات سے اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ اقبال بھی ان دنوں دوسرے طالب علموں کی طرح اپنی کتابوں پر نوٹس وغیرہ لکھنے کے عادی تھے۔ بعض کتابوں کے حاشیے تو بالکل سیاہ ہیں اور کسی کسی جگہ مشکل الفاظ کے معانی لکھے گئے ہیں۔ کہیں کہیں تو اقبال نے پورے پورے صفحہ کی تلخیص درج کی ہے۔ ان کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ بہ آسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ متذکرہ کتابوں میں سب سے پرانی کتاب وہ ہے، جو آپ نے نویں جماعت میں پڑھی تھی۔ اس پر ایک جگہ مندرجہ ذیل انگریزی شعر بڑی خوبصورتی سے تحریر کیا ہوا ہے:

Steal not the book for fear of shame
Look down and see my Powerful name
Mohammad Iqbal.

تقریباً تمام کتابوں پر انہوں نے مندرجہ ذیل فقرہ ضرور لکھا ہے:

This book belongs to S. Muhammad Iqbal.

کئی کتابوں پر اپنے نام کے ساتھ جماعت، سکول یا کالج کا نام اور بعض مقامات پر اپنا رول نمبر بھی تحریر فرمایا ہے۔ دو ایک کتابوں پر ان کے نام کی بنی ہوئی لکڑی کی مہر بھی ثبت ہے۔ چند کتابوں پر انہوں نے اپنا نام اور تخلص اس طرح تحریر فرمایا ہے:

Sh. Mohd Iqbal "Iqbal"

'A Grammar of English Language' جو آپ نے ۱۸۹۱ء میں نویں جماعت میں پڑھی، اس پر ان کا نام مع تاریخ اس طرح درج ہے۔

This Grammar belongs to Mohammad Iqbal Student Scotch Mission High School,

Sialkot 10/5/91

بھی علامہ نے نویں جماعت میں پڑھی۔ اس پر انہوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:

This book now belongs to Mohammad Iqbal student Ist class, S.M. city Sialkot.

اس کتاب پر ایک جگہ انہوں نے راگ کے بول تحریر فرمائے ہیں۔

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
سا	رے	گا	ما	پا	دھا	نی	سا
خرج	رکھب	گندھار	مدھم	پنچم	دھیوت	نکھاد	

اس کے نیچے بیدل، غالب، ناسخ اور واقف کے مختلف اشعار درج ہیں، جو پنسل سے لکھے ہونے کی وجہ سے صاف نہیں پڑھے جاتے۔ اس کتاب پر ایک دوسری جگہ راگ کے بول یوں درج ہیں:

۲ ۱ ۱ ۱ ۱

دھا خرج (خاص) ری گا ـ دھا (خاص)

۱ ۱ ۱ ۱ ۱ ۱ ۱

پا (خاص) گا ری سا ری گا

The Royal Readers بھی انہوں نے نویں جماعت پڑھی تھی، جس پر ان کے دستخط کچھ اس طرح موجود ہیں:

Mohammad Iqbal Student Ist class of Scotch Mission School, Sialkot city.

علامہ علیہ الرحمۃ نے دسویں جماعت میں پڑھی۔ Learned Men's English
اس پر انہوں نے اپنا نام اور رول نمبر درج کیا ہے۔

S. Mohammad Iqbal 673, Student of 10th class Scotch Mission High School, Sialkot.

انہوں نے ایف اے میں استعمال کی۔ اس English Men of action
کے حواشی پر بے شمار نوٹس لکھے گئے ہیں۔ کسی جگہ پنسل اور کسی جگہ قلم کے ساتھ بڑے
صاف اور باریک الفاظ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ اس پر ان کے دستخط بھی
موجود ہیں:

S. Mohammad Iqbal

Student Scotch Mission College, Sialkot.

The Tragedy of King کا ڈراما Shakespeare
Richard II بھی ایف اے میں پڑھا گیا۔ اس کے حواشی پر بے شمار
نوٹس تحریر کئے گئے ہیں اور علامہ صاحب نے اپنے دستخط اس طرح ثبت فرمائے ہیں:

S. Mohammad Iqbal

Student Scotch Mission College, 1894.

بھی ایف اے میں ہی پڑھی گئی ہے۔ اس
پر علامہ صاحب کے دستخط مع تاریخ اس طرح درج ہیں:

S. Mohammad Iqbal, Student F.A. class Scotch Mission College, Sialkot.

7th June, 1893.

آپ نے بی اے میں استعمال کی اور اس پر Lives of Indian officers
اپنا نام مع تخلص ثبت فرمایا:

S. Mohammad Iqbal "Iqbal"

Student IV yr Govt. College, Lahore.

EURIPIDES انہوں نے ایم اے میں پڑھی اور یوں دستخط فرمائے:

S. Mohammad Iqbal, Student M. A. Class

Govt. College, Lahore. 18th Feb, 1898

Lectures on the origin and Growth of Religion

بھی انہوں نے ایم اے میں استعمال کی اور اس طرح دستخط فرمائے:

Mohammad Iqbal

Philosophy M. A. College,

Govt. College, Lahore.

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ بعض کتابوں پر صرف دستخط اور بعض کے حواشی پر نوٹس لکھے ہوئے ہیں۔ ان ہی کتابوں میں ایک "کلیات سودا" بھی ہے، جس پر جا بجا ان کے دستخط موجود ہیں اور کسی جگہ مختلف قافیے اور کسی جگہ اشعار لکھے ہوئے ہیں [1]

اقبال کے استاد

سکاچ مشن ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، تو اقبال کو مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہوا اتفاق سے اس دوران سکاچ مشن ہائی سکول میں انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں کھل گئیں اور اس کا نام سکاچ مشن کالج ہو گیا۔ اقبال نے خدا کا شکر ادا کیا اور اسی کالج میں ایف اے تک تعلیم جاری رکھی۔ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کا بیان ہے کہ اس وقت حسب ذیل اساتذہ اس سکول اور کالج میں پڑھاتے تھے۔

- ماسٹر غلام علی (اقبال شیدائی کے والد۔) • ماسٹر پالا مل • منشی امام الدین • مولانا سید میر حسن • مسٹر ڈیوڈ (ہیڈ ماسٹر)، • ماسٹر ٹہل سنگھ (عیسائی)، • مسٹر ڈی ڈی سنگھا (جو بعد میں بیرسٹر ہو گئے)، • پادری ینگسن۔

[1] اقبال درون خانہ، خالد نظیر صوفی ص ۱۰۳ تا ۱۰۷

۹۔ جارج داخ (پرنسپل سکاچ مشن کالج) [1]

داغ دہلوی

جن دنوں اقبال طالب علم تھے، سیالکوٹ میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے لیے اقبال کبھی کبھار غزل یا نظم لکھ لیتے تھے۔ "شعرائے اردو میں ان دنوں نواب مرزا خاں صاحب دہلوی کا بہت شہرہ تھا اور نظام دکن کے استاد ہونے سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ جو ان کے پاس جا نہیں سکتے تھے، خط و کتابت کے ذریعہ دور ہی سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے۔ غزلیں ڈاک میں ان کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے۔ پچھلے زمانہ میں جب ڈاک کا یہ انتظام نہ تھا، کسی شاعر کو اتنے شاگرد کیسے میسر آ سکتے تھے۔ اب اس سہولت کی وجہ سے یہ حال تھا کہ سینکڑوں آدمی ان سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے اور انہیں اس کام کے لیے ایک عملہ اور محکمہ رکھنا پڑتا تھا۔ شیخ محمد اقبال نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اردو زبان دانی کے لیے ایسے استاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فن غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ گو اس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں تو موجود نہ تھیں، جن سے بعد ازاں کلام اقبال نے شہرت پائی، مگر جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انہوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے" [2] اور یوں یہ سلسلہ تلمذ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا اس کے باوجود علامہ اقبال داغ دہلوی کا نام بڑے احترام سے لیتے رہے اور خود نواب مرزا داغ دہلوی اقبال کو اپنے ہونہار اور سر فہرست شاگردوں میں شمار کرتے تھے اور ان پر فخر کرتے تھے۔

مولانا میر حسن

اقبال کو اپنی تعلیمی منازل طے کرنے میں اچھے سے اچھے استاد ملے اور بڑے سے

---

[1] ذکر اقبال، عبدالمجید سالک ص ۱۵

[2] دیباچہ بانگ درا ص نہ

بڑے علمار سے سابقہ پڑا' ان کے سب سے اولین ممتاز استاد تو مولانا میر حسن تھے، جن کے فیض تربیت سے اقبال برابر بہرہ ور ہوتے رہے۔ اقبال میں عربی اور فارسی کی زبان دانی اور شعر و سخن کا جو ذوق پیدا ہوا، وہ ان ہی بزرگ کی تعلیم اور صحبت کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے سفر انگلستان کے موقع پر حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر "التجائے مسافر" کے عنوان سے جو نظم پڑھی، اس میں عقیدت مندانہ طور پر ان کے اس علمی احسان کا اعتراف یوں کیا ہے

وہ شمع بارگہِ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کا زمانہ بڑی افراتفری کا دور تھا۔ مسلمان ذہنی سکون کھو چکے تھے۔ جدید تعلیم یافتہ دین سے دور ہوتے جا رہے تھے اور دینی مدارس میں تعلیم پانے والے دنیا سے کنارہ کش ہو رہے تھے۔ اس پُر آشوب زمانے میں بھی بعض گوشوں کے اندر ایسے روشن خیال، اہل علم موجود تھے، جو مصالح دین اور مصالح دنیا دونوں کو مد نظر رکھ کر بعض مسلمان بچوں کو تربیت دے رہے تھے۔ اقبال ان ہی بچوں میں سے تھے، جن کو مولانا میر حسن شاہ جیسا مجمع البحرین استاد مل گیا اور اسی استاد نے حقیقت میں اقبال کو اقبال بنایا۔

مولانا میر حسن ۸ راپریل ۱۸۴۴ء مطابق ۱۲۵۸ھ کو موضع فیروز والا میں پیدا ہوئے، جو ان کا ننھیال تھا۔ ان کا تاریخی نام 'رونق بخش' بتایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ قرآن شریف کی تعلیم' والد سید محمد شاہ سے حاصل کی اور ابتدائی دو چار کتابیں مولانا شیر محمد سے پڑھیں، جو پسرور ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور شہر کے بازار دو دروازہ کی مسجد کلاں میں امامت کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا میر حسن شاہ صاحب نے کسی اور استاد سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی اور جو کچھ علم حاصل کیا، ذاتی محنت شاقہ اور وسیع تر

مطالعہ سے۔ عربی اور فارسی علوم کے وہ بحرِ بیکراں تھے۔

شاہ صاحب نہایت راسخ العقیدہ اور عبادت گزار مسلمان تھے۔ ان کی وسیع المشربی مسلم تھی۔ عمر بھر کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی نے پوچھا تو یہی کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ مسلمانوں کے علاوہ بے شمار ہندو، سکھ اور عیسائی بھی ان کے شاگرد تھے۔ ان میں اکثر بڑے بڑے عہدوں اور رتبوں پر پہنچے۔ مگر ادب و احترام کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھوں سے شاہ صاحب کی جوتیاں ان کے آگے رکھتے تھے اور رخصت ہوتے وقت شاہ صاحب کی طرف پیٹھ نہ کرتے تھے، بلکہ دروازے تک پچھلے پاؤں چل کر جاتے تھے۔

مولانا میر حسن نے نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ بہت معمولی، لیکن صاف ستھرا لباس پہنتے، بے حد مستغنی تھے۔ صوبے کے بڑے بڑے کالجوں سے بارہا انہیں پروفیسری کی پیش کش ہوئی، تاہم ان کی قناعت نے انہیں سکاچ مشن کالج سے وابستہ رکھا، جہاں ان کی تنخواہ تادمِ آخر ایک سو بیس روپے سے متجاوز نہ ہونے پائی۔ اقبال کی سادگی اور ان کی قناعت اور ان کا استغنا مسلم ہے۔ اقبال کہا کرتے تھے کہ میں نے استغنا بھی شاہ صاحب سے سیکھا ہے۔ شاہ صاحب کے معمولات کی کیفیت یہ تھی کہ نماز تہجد اور نماز فجر سے فارغ ہو کر قبرستان جاتے، اپنے احباب کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے۔ ساڑھے سات بجے کے قریب واپس آتے۔ راستے میں بعض شاگردوں کو سبق دیتے۔ گھر پہنچ کر پھر تدریس میں مصروف ہو جاتے۔ کھانا کھا کر کالج کو چل دیتے۔ دن بھر کالج میں پڑھا کر واپس آتے، تو پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ گھر کا سودا سلف خود بازار سے لایا کرتے۔ اس آمد و رفت میں بھی شاگرد پیچھا نہ چھوڑتے اور سبق کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پاتا۔ ہر آٹھویں دن ایک روپیہ بھناتے اور دو دو پیسے بچوں میں تقسیم کر دیتے۔ قرآن کریم سے بے حد شغف تھا۔ حافظ بھی تھے، ایک منزل روزانہ ختم کرتے، تہجد میں ایک پارہ روزانہ پڑھتے۔

سکاچ مشن سکول اور اس کے بعد کالج میں مولانا میر حسن شاہ برابر پڑھاتے رہے۔ اس درسگاہ کے انگریز پرنسپل شاہ صاحب کا ہمیشہ انتہائی احترام کرتے تھے۔ شاہ صاحب کی غریب پروری ضرب المثل بن گئی تھی۔ انہوں نے مبتدیوں سے لے کر منتہیوں تک سب کو پڑھایا اور کسی سے کبھی کوئی خدمت وصول نہ کی۔ گھر پر جو طلبہ پڑھنے آتے، ان کی خدمت خود کرتے تھے۔

عام طور پر اردو میں بات چیت کرتے، زبان بہت صحیح اور سلجھی ہوئی تھی۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو شاہ صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ علامہ اقبال نے ان کی رحلت پر یہ مادہ تاریخ نکالا، "ما ارسلنک الا رحمت للعالمین" ۱۳۴۸ھ۔

شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کو اپنے شفیق استاد مولانا میر حسن شاہ صاحب سے عمر بھر عقیدت رہی۔ آخر عقیدت والفت کیوں نہ ہوتی ؎

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

روایت ہے: ایک دفعہ علامہ اقبال سیالکوٹ میں رحیما عطار کی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔ تختے پر حقہ دھرا تھا۔ علامہ حقہ پی رہے تھے۔ ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا۔ طلائی جوتی پہنے ہوئے تھے جو پاؤں تختے پر تھا، اس کا جوتا کسی قدر ڈھیلا تھا۔ اتفاق سے مولوی سید میر حسن شاہ ادھر سے گزرے اور علامہ اقبال کی نظر ان پر پڑ گئی۔ جھٹ تختے پر سے پاؤں نیچے کیا۔ جوتے کا پاؤں تختے ہی پر چھوڑا اور صرف ایک ہی پاؤں میں جوتا پہنے اپنے استاد محترم کی طرف لپکے۔ حضرت شاہ صاحب آگے آگے تھے اور علامہ اقبال گردن جھکائے ان کے پیچھے پیچھے مؤدبانہ جا رہے تھے۔ ایک پاؤں میں جوتا تھا، دوسرے میں نہ تھا۔ حضرت شاہ صاحب کو ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے اور پھر اپنا جوتا پہنا [1]

یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ جب گورنمنٹ نے علامہ اقبال کو سر کا خطاب دینا چاہا، تو انہوں نے اس خطاب کو اس شرط پر قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا کہ پہلے ان کے استاد مولانا سید میر حسن کو بھی شمس العلماء کا خطاب عطا کیا جائے۔ چنانچہ سرکار نے اقبال کی اس شرط کو شرف پذیرائی بخشا اور مولانا میر حسن شاہ صاحب کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔

---

[1] راوی ہمشیر زادہ علامہ اقبال پروفیسر منظور احمد / ذکر اقبال ص ۲۴۳

اقبال ایسے شاگرد کو میر حسن ایسے استاد سے جس قدر عقیدت تھی، استاد کو بھی شاگرد کے ساتھ اسی قدر محبت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار اقبال سخت بیماری کی حالت میں دہلی گئے۔ مولانا میر حسن کو اس قدر تشویش لاحق ہوئی کہ انہوں نے ایک خاص آدمی کو محض اس کام پر متعین کر دیا کہ وہ روزانہ اسٹیشن پر جا کر اخبار لایا کرے تاکہ اقبال کی علالت کے متعلق اس میں جو تار شائع ہوں، وہ انہیں پڑھ کر سنائے۔ مولانا سید میر حسن اقبال کو اپنے بچوں کی طرح عزیز سمجھتے تھے اور ان کا ہر ممکن خیال رکھتے تھے۔ استادی اور شاگردی کا یہ سلسلہ صرف سیالکوٹ کے زمانہ طالب علمی ہی تک قائم نہ رہا بلکہ بعد کو بھی علامہ ان سے فارسی کلام کے متعلق اصلاح اور مشورہ لیتے رہے۔ "رموز بیخودی" کے دیباچہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

مولانا سید میر حسن شاہ کی رحلت کا علامہ اقبال کو اس قدر افسوس ہوا کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ علامہ کو ان کی رحلت کا دوہرا افسوس تھا۔ ایک یہ کہ وہ ان کے شفیق ترین استاد تھے اور دوسرے ان کے والد شیخ نور محمد کے عزیز ترین دوست تھے۔ اس نسبت سے اقبال کو یوں محسوس ہوا، جیسے وہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے ہیں۔ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد علامہ کی محبت اور مرحوم استاد سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی سیالکوٹ تشریف لاتے، ان کے آستانہ عالیہ پر جبہ سائی سے ہرگز غفلت نہ کرتے۔

ٹامس آرنلڈ

سکاچ مشن کالج سیالکوٹ ابھی تک چونکہ مرے کالج نہیں بنا تھا، اس لئے اقبال کو ایف اے کے بعد مجبوراً اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لاہور آنا پڑا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور تشریف لے آئے اور گورنمنٹ کالج میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ انگریزی، عربی اور فلسفہ اقبال کے مضامین تھے۔ خوش قسمتی سے انہیں یہاں بھی پروفیسر ٹامس آرنلڈ ایسا نامور فلسفی قابل استاد کی صورت میں مل گیا۔ مسٹر آرنلڈ گورنمنٹ کالج لاہور

میں فلسفہ کے پروفیسر بنے اور قبل ازیں علی گڑھ کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ وہاں انہوں نے مولانا شبلی مرحوم سے عربی سیکھی اور خود مولانا مرحوم و مغفور کو فرانسیسی زبان سکھلائی۔ یوں پروفیسر ٹامس آرنلڈ کو اسلامی ادبیات سے خاصی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ علی گڑھ کالج میں دس برس رہنے کے بعد فروری ۱۸۹۶ء میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور چلے آئے۔ جہاں اقبال نے بی اے میں فلسفے کا اختیاری مضمون لے رکھا تھا۔ پروفیسر آرنلڈ کی تعلیم و تربیت نے اقبال کے قدرتی جوہر کو اور بھی چمکایا۔ پروفیسر آرنلڈ اقبال کی خداداد صلاحیتوں سے چند روز ہی میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے اقبال سے دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ وہ اپنے حلقہ یاراں میں اقبال کی اکثر تعریف کرتے اور کہتے:

ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق تر بنا دے گا۔

اقبال نے ۱۸۹۷ء میں بی اے کا امتحان امتیازی اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ وظیفہ بھی پایا۔ اور عربی اور انگریزی میں اوّل آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے۔ ۱۸۹۹ء میں اقبال نے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور یونیورسٹی میں اوّل قرار دیئے گئے۔ اس کے صلے میں آپ کو نانک بخش میڈل، کا اعزاز ملا۔

پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کے دل میں علمی ذوق کی بہت سی خوبیاں پیدا کیں اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اقبال کے دل میں اپنی محبت کے نقوش بھی مرتسم کیے۔ پروفیسر آرنلڈ سے اقبال کی محبت کا بیّن ثبوت وہ نظم ہے، جو انہوں نے پروفیسر آرنلڈ کے انگلستان جانے کے وقت الوداعی تقریب میں پڑھی۔ نظم کا عنوان تھا "نالہ فراق"۔ اقبال نے اپنی اس نظم میں اس علمی ذوق کا خاص طور پر تذکرہ کیا، جو پروفیسر آرنلڈ کے فیض صحبت نے ان میں پیدا کر دیا تھا۔ اقبال کہتے ہیں ؎

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم
تھی تری موج نفس باد نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

شورِ لیلیٰ کو ؟ کہ باز آرائشِ سودا کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند

اقبال اور آرنلڈ میں تعلقات لاہور کے علاوہ بھی ایک عرصہ تک قائم رہے۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد اقبال کو اورنٹیل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر کی ملازمت مل گئی اور کچھ مدت بعد انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ مقرر کیا گیا، جس پر وہ ۱۹۰۵ء تک فائز رہے۔ لیکن پروفیسر آرنلڈ کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت نے اقبال میں جو علمی ذوق پیدا کر دیا۔ وہ ابھی نامکمل تھا اور اس ذوق کی تکمیل کے لیے وہ جلد سے جلد انگلستان جانا چاہتے تھے۔ انہیں گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے علاوہ انگریزی کا بھی اسسٹنٹ پروفیسر بنا دیا تھا اور خود اقبال کے لیے ملازمت کا یہ تعلق زنجیر پا ہو رہا تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک نظم کے اس شعر میں کیا ہے۔

کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

"پنجاب کی زنجیر" سے غالباً ملازمت کے اسی تعلق کی طرف اشارہ ہے اور اقبال ۱۹۰۵ء میں اس زنجیر پا کو توڑ کر عازم انگلستان ہوئے۔ انہوں نے تصوف سے عقیدت اور اثر کی بنا پر جو انہیں اپنے خاندان سے ورثہ میں ملا تھا، سب سے پہلے دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار اقدس پر حاضری دی اور اپنے تاثرات عقیدت میں مقصد سفر کا اظہار یوں کیا ؎

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

انگلستان پہنچ کر اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ چونکہ مشرقی علوم میں بہرہ وافی رکھتے تھے اور عمیق غور و فکر کی عادت تھی۔ اس لیے شروع دن ہی سے ایشیائی ممالک کے نوجوانوں کے مقبول و ممتاز ترین ساتھی بن گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں قیام

کے دوران بھی پروفیسر آرنلڈ سے برابر آپ کی ملاقاتیں رہیں - سالک رقمطراز ہیں: بجم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر کیمبرج میں ایک پکنک ہوئی - دریا کے کنارے ایک بڑے درخت کے سائے میں متعدد ذی علم لوگ جمع تھے - پروفیسر آرنلڈ باتیں کرتے کرتے موت وحیات کے فلسفے پر بحث کرنے لگے - گوناگوں خیالات کے اظہار سے مباحثہ پیچیدہ سا ہوگیا - اقبال خاموش بیٹھے تھے - پروفیسر آرنلڈ ان سے کہنے لگے کہ آپ بھی تو کچھ کہیئے؟ اقبال نے جھک کر کہا - زندگی موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کا آغاز ہے" بس اس جامع فقرے پر بحث ختم ہوگئی

پھر ۹ جون کا ذکر ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کے ہاں ایک ڈنر تھا اقبال بھی تھے - پروفیسر نے ذکر کیا کہ جرمنی میں ایک نہایت نادر عربی مخطوطہ برآمد ہوا ہے، جس کی تصحیح اور جس کے اقتباس کے لیے اقبال کو بھیجنا چاہتا ہوں، کیونکہ اس ذمہ دارانہ کام کے لیے صرف یہی موزوں رہیں گے - اقبال نے گزارش کی کہ اپنے استاد کے مقابلے میں میں بالکل طفل مکتب ہوں - پروفیسر نے کہا کہ نہیں، میری رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں شاگرد استاد سے بہت بہتر ثابت ہوگا - اقبال نے خفیف سے طنزیہ لہجے میں جواب دیا " جناب والا، اگر آپ اس نتیجے پر پہنچے ہیں، تو میں اپنے استاد کی رائے کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کے احکام کی تعمیل کروں گا" پروفیسر آرنلڈ اقبال کا مطلب سمجھتے تھے اور متیقن تھے کہ اس معاملے میں اقبال ان سے بہتر قابلیت رکھتے ہیں، لیکن یہ ساری گفتگو اس قدر نفاست اور رکھ رکھاؤ سے ہوئی کہ صرف اہل علم ہی اس کے اہل ہو سکتے ہیں[1]

مک ٹیگرٹ

انگلستان میں جن اساتذہ سے اقبال کو شرف تلمذ حاصل ہوا، ان میں سرفہرست ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کا نام ہے - یہ تعلق ابتدا میں استاد اور شاگرد کی حیثیت سے استوار ہوا اور بعد میں اس نے ہم خیالی اور ہم ذوقی کے باعث دوستی کی شکل اختیار کر لی - چنانچہ جب تک ڈاکٹر مک ٹیگرٹ زندہ رہے، ان کے اور اقبال کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ برابر

---

[1] ذکر اقبال ص ۵۱

جاری رہا۔ ملک راج انند کا کہنا ہے: خوش قسمتی سے انگلستان میں پہنچتے ہی اقبال کی ملاقات مک ٹیگرٹ جیسے فلسفی سے ہوئی، جو ہیگل کا متبع تھا اور اس زمانے میں فلسفی کی حیثیت سے بے حد شہرت حاصل کر چکا تھا۔ پھر ادب فارسی کے مشہور مورخ براؤن اور اسرار خودی کے مترجم ڈاکٹر نکلسن سے ملاقات ہوئی۔ عنفوان زندگی میں ڈاکٹر صاحب کو فلسفہ اور ادب فارسی سے بے حد شغف تھا، لیکن جب ان کا رجحان وطنیت اور قومیت کی طرف ہوا اور وہ ان موضوعات پر نظمیں لکھنے لگے، تو یہ شوق دب کر رہ گیا۔ اب یہ شوق پھر پیدا ہوا اور ان لوگوں کے اثر و تربیت نے اسے پختہ کر دیا۔ مک ٹیگرٹ کے لیکچروں سے انہوں نے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا سائنٹیفک انداز سیکھا... براؤن اور نکلسن کی دوستی سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے گھر پر فارسی کا جو علم حاصل کیا تھا، اس میں پختگی پیدا ہو گئی [1] اقبال کا نظریہ تھا کہ ہیگل کا فلسفہ نثر میں ایک رزمیہ ہے۔ جارج ولہیلم فریڈرک ہیگل (۱۷۷۰ء - ۱۸۳۱ء) مشہور جرمن فلسفی تھے۔ ۱۸۱۶ء میں ہائیڈل برگ میں شعبہ فلسفہ کے صدر رہے۔ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۳۱ء تک ان کے فلسفۂ اضداد سے انیسویں صدی کے بیشتر حکما متاثر ہوئے اور یہی فلسفہ مارکسی دبستانِ فکر کی بنیاد بنا۔ اقبال نے بھی ارتقا بالضد (اضداد کی کشمکش سے ارتقا) کا اصول ہیگل سے اخذ کیا۔ ہیگل سے مستفید ہونے کے باوجود اقبال اس سے مرعوب نہ ہوتے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی

ضرب کلیم ص ۱۱ [2]

اقبال کے استاد ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ ان کا پورا نام

---

[1] نیرنگ خیال، اقبال نمبر، ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء

[2] شذرات فکر اقبال، مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص ۱۷

کے دوران بھی پروفیسر آرنلڈ سے برابر آپ کی ملاقاتیں رہیں - سالک رقمطراز ہیں : ہجم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر کیمبرج میں ایک پکنک ہوئی - دریا کے کنارے ایک بڑے درخت کے سائے میں متعدد ذی علم لوگ جمع تھے - پروفیسر آرنلڈ باتیں کرتے کرتے موت وحیات کے فلسفے پر بحث کرنے لگے - گوناگوں خیالات کے اظہار سے مباحثہ پیچیدہ سا ہوگیا - اقبال خاموش بیٹھے تھے - پروفیسر آرنلڈ ان سے کہنے لگے کہ آپ بھی تو کچھ کہیے ؟ اقبال نے جھک کر کہا - زندگی موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کا آغاز ہے" بس اس جامع فقرے پر بحث ختم ہوگئی

پھر ۹ جون کا ذکر ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کے ہاں ایک ڈنر تھا اقبال بھی تھے - پروفیسر نے ذکر کیا کہ جرمنی میں ایک نہایت نادر عربی مخطوطہ برآمد ہوا ہے ، جس کی تصحیح اور جس کے اقتباس کے لیے اقبال کو بھیجنا چاہتا ہوں ، کیونکہ اس ذمہ دارانہ کام کے لیے صرف یہی موزوں رہیں گے - اقبال نے گزارش کی کہ اپنے استاد کے مقابلے میں میں بالکل طفل مکتب ہوں - پروفیسر نے کہا کہ نہیں ، میری رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں شاگرد استاد سے بہت بہتر ثابت ہوگا - اقبال نے خفیف سے طنزیہ لہجے میں جواب دیا " جناب والا ، اگر آپ اس نتیجے پر پہنچے ہیں ، تو میں اپنے استاد کی رائے کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کے احکام کی تعمیل کروں گا " پروفیسر آرنلڈ اقبال کا مطلب سمجھتے تھے اور متیقن تھے کہ اس معاملے میں اقبال ان سے بہتر قابلیت رکھتے ہیں ، لیکن یہ ساری گفتگو اس قدر نفاست اور رکھ رکھاؤ سے ہوئی کہ صرف اہل علم ہی اس کے اہل ہو سکتے ہیں [1]

مک ٹیگرٹ

انگلستان میں جن اساتذہ سے اقبال کو شرف تلمذ حاصل ہوا ، ان میں سر فہرست ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کا نام ہے - یہ تعلق ابتدا میں استاد اور شاگرد کی حیثیت سے استوار ہوا اور بعد میں اس نے ہم خیالی اور ہم ذوقی کے باعث دوستی کی شکل اختیار کر لی - چنانچہ جب تک ڈاکٹر مک ٹیگرٹ زندہ رہے ، ان کے اور اقبال کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ برابر

---

[1] ذکر اقبال ص ۵۱

جاری رہا۔ ملک راج انند کا کہنا ہے : خوش قسمتی سے انگلستان میں پہنچتے ہی اقبال کی ملاقات مک ٹیگرٹ جیسے فلسفی سے ہوئی، جو ہیگل کا متبع تھا اور اس زمانے میں فلسفی کی حیثیت سے بے حد شہرت حاصل کر چکا تھا۔ پھر ادب فارسی کے مشہور مورخ براؤن اور اسرار خودی کے مترجم ڈاکٹر نکلسن سے ملاقات ہوئی۔ عنفوان زندگی میں ڈاکٹر صاحب کو فلسفہ اور ادب فارسی سے بے حد شغف تھا، لیکن جب ان کا رجحان وطنیت اور قومیت کی طرف ہوا اور وہ ان موضوعات پر نظمیں لکھنے لگے، تو یہ شوق دب کر رہ گیا۔ اب یہ شوق پھر پیدا ہوا اور ان لوگوں کے اثر و تربیت نے اسے پختہ کر دیا۔ مک ٹیگرٹ کے لیکچروں سے انہوں نے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا سائنٹیفک انداز سیکھا ... براؤن اور نکلسن کی دوستی سے انہیں یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے گھر پر فارسی کا جو علم حاصل کیا تھا، اس میں پختگی پیدا ہو گئی[1] اقبال کا نظریہ تھا کہ ہیگل کا فلسفہ نثر میں ایک رزمیہ ہے۔ جارج ولہیلم فریڈرک ہیگل (۱۷۷۰ء - ۱۸۳۱ء) مشہور جرمن فلسفی تھے۔ ۱۸۱۶ء میں ہائیڈل برگ میں شعبہ فلسفہ کے صدر رہے۔ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۳۱ء تک ان کے فلسفۂ اضداد سے انیسویں صدی کے بیشتر حکما متاثر ہوئے اور یہی فلسفہ مارکسی دبستانِ فکر کی بنیاد بنا۔ اقبال نے بھی ارتقاء بالضد (اضداد کی کش مکش سے ارتقاء) کا اصول ہیگل سے اخذ کیا۔ ہیگل سے مستفید ہونے کے باوجود اقبال اس سے مرعوب نہ ہوتے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی

ضربِ کلیم ص ۱۱[2]

اقبال کے استاد ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ ان کا پورا نام

---

[1] نیرنگ خیال، اقبال نمبر، ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء

[2] شذرات فکر اقبال، مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص ۱۷

جان مک ٹیگرٹ ۳ ستمبر ۱۸۶۶ء

کو لندن میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام فرانسس ایلس تھا، لیکن بعد میں انہوں نے اپنا نام ایلس سے تبدیل کر کے ٹیگرٹ رکھ لیا۔ مک ابھی چار سال کے تھے کہ ٹیگرٹ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری والدہ نے پوری کی۔ مک ٹیگرٹ نے ابتدائی تعلیم وے برج کے قصبہ سے حاصل کی، جہاں سے وہ کلفٹن کے پبلک سکول میں داخل ہو گئے۔ انیس سال کی عمر میں کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۸۸ء میں انہوں نے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۰ء میں مک ٹیگرٹ کی والدہ نیوزی لینڈ جا رہی تھیں کہ مک ٹیگرٹ کو ٹرنٹی کالج کا فیلو منتخب کر لیا گیا۔ اس لئے وہ انگلستان ہی میں رہے اور ٹرنٹی کالج میں ۱۹۲۵ء تک پڑھاتے رہے۔ انہوں نے تقریباً ۲۰ سال تک کیمبرج میں فلسفہ کا درس دیا۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے بقول:

"ان کی علمی زندگی بڑی خاموش، پرسکون اور اطمینان بخش تھی، جس میں سیاست کے ہنگامے بار نہ پا سکتے تھے، لیکن مک ٹیگرٹ اپنی بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے بڑے دلچسپ انسان تھے۔ مثلاً وہ ہستی باری تعالیٰ کے منکر تھے، لیکن حیات بعد الموت کے قائل تھے۔ انہیں مروجہ رسمی مذاہب سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن کلیسائے انگلستان (چرچ آف انگلینڈ) کے بڑے حامی تھے۔ جب ایک مرتبہ ان سے اس تضاد خیالی کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے جواب دیا کہ ہر شخص تو مک ٹیگرٹ نہیں کہ مذہبی قیود سے بے نیاز ہو کر بھی اخلاق اور معاشرت کے ضابطے کی پابندی کر سکے۔ عوام کو سیدھے راستے پر قائم رکھنے اور ملک میں یک جہتی پیدا کرنے کے لیے چرچ کی سخت ضرورت ہے۔ حیات بعد الموت کا عقیدہ رکھنے کے باوجود ڈاکٹر مک ٹیگرٹ تناسخ کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی روح کو عرفان حاصل کرنے کے لیے بار بار کئی زندگیوں سے گزرنا پڑتا ہے[1]

---

[1] ماہنامہ ادبی دنیا ج ۷ شمارہ ۴۴، اقبال نمبر

۱۹۲۰ء میں اقبال کی مثنوی 'اسرارِ خودی' کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا، تو ایک خط میں مک ٹیگرٹ نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: مجھے آپ کی مثنوی پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی، لیکن آپ نے اپنے خیالات میں یہ تبدیلی کیونکر پیدا کر لی، جب آپ یہاں تھے اور ہمارے درمیان فلسفیانہ بحثیں ہوا کرتی تھیں تو آپ وحدت الوجود کے سخت قائل تھے۔ اب اسی نظریہ کی آپ مخالفت کرتے ہیں ..... سوال غالباً اپنے اپنے ملک کے مقامی اور قومی تقاضوں کا ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ہندوستان ضرورت سے زیادہ اندرون بینی اور تفکر میں مبتلا ہے۔ اسی کے برعکس انگلستان ہی نہیں، پورا یورپ اس تفکر سے محروم ہے۔ آپ کو ہم سے عمل کا درس لینا چاہیئے اور ہمیں آپ سے غور و فکر کی نعمت حاصل کرنی ضروری ہے" اس کے باوجود اقبال کی رائے ہے کہ مک ٹیگرٹ کا فلسفہ ایک خاص قسم کا تصوف تھا، جس نے عقل کی روشنی میں ان کو راہ یزداں دکھائی۔

کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران تقریباً ہر روز اقبال کی ملاقات ڈاکٹر مک ٹیگرٹ سے ہوتی تھی۔ مختلف موضوعات سے ہوتی ہوئی گفتگو عموماً ہستی باری تعالیٰ پر آکر ٹھہر جاتی تھی۔ مک ٹیگرٹ خدا کے وجود سے انکار کرتے تھے اور اس کے جواز میں زبردست دلائل دیتے تھے، لیکن وہ کبھی اقبال کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکے۔ کیمبرج میں مک ٹیگرٹ کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔ روجر فرائی، نیتھنیل ویڈ اور جی ڈکنسن اور ان کے یونیورسٹی فیلو تھے، جب کہ آرتھر بالفور، ہالڈین، ٹامس ہارڈی، اور سر فرانسس ینگ ہزبنڈ بھی ان سے اکثر و بیشتر ملاقات کے لیے آتے تھے۔ اقبال کو بھی ان شخصیات سے گفتگو کے کئی مواقع میسر آئے۔

مک ٹیگرٹ، ہیگل کے بڑے مداح تھے اور انہوں نے ہیگل کے فلسفے کی شرح تین جلدوں میں لکھی۔ لیکن بعض ناقدین کی رائے میں ان کی بہترین تصنیف دی نیچر آف اگزسٹینس ہے۔ سیاسی اعتبار سے مک ٹیگرٹ ٹوری تھے یعنی قدامت

میں سورن برن، عمر خیام، اور شکسپیر انہیں بہت پسند تھے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے دوران مک ٹیگرٹ کی حب الوطنی ایمان کے اس درجے پر پہنچ گئی کہ انہوں نے برٹنڈرسل کو کیمبرج سے نکلوا کر دم لیا۔ مک ٹیگرٹ کا انتقال ۱۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو ہوا۔ اقبال کو ان کی رحلت کا بے حد صدمہ ہوا۔

ای جی براؤن

کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال کا زیادہ تر تعلق پروفیسر ای جی براؤن سے بھی رہا۔ جنہوں نے ان کے دل میں عربی اور فارسی کی تحصیل و تحقیق کے ذوق و شوق کو اور بھی پروان چڑھایا اور اقبال نے ان ہی کے کہنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ایران کے فلسفہ مابعد الطبیعات کا مضمون منتخب کیا اور فیصلہ کیا کہ یہ ڈگری میونخ یونیورسٹی جرمنی سے حاصل کی جائے۔ پروفیسر ای جی براؤن ( )
کا پورا نام ایڈورڈ گرنویل براؤن تھا۔ وہ مشہور انگریز مستشرق تھے۔ فروری ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر میں اپنے آبائی وطن ایٹن کو خیرباد کہا۔ اس زمانے میں انہیں ۱۸۷۷ء میں روس اور ترکی کی جنگ میں ترکوں کی بہادری اور شجاعت نے بہت متاثر کیا اور براؤن نے ترکی زبان سیکھنی شروع کر دی۔ ۱۸۷۹ء میں کیمبرج میں ادبیات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ پروفیسر ای ایچ پامر (E.H. PALMER
اور پروفیسر ولیم رائٹ (William Wright) سے عربی زبان سیکھی۔ ۱۸۸۲ء میں قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ ۱۸۸۴ء میں فارسی زبان کے مشہور استاد مرزا محمد باقر کے توسل سے فارسی سیکھی۔ ایران کی سیاحت کے بعد براؤن جب کیمبرج واپس آئے تو وہ اپنے ہمراہ مشرقی ادبیات کے بہت سے نادر مخطوطات لائے، کیمبرج یونیورسٹی میں انہیں فارسی کا استاد مقرر کیا گیا۔ ۱۹۰۲ء تک وہ یہیں فارسی پڑھاتے رہے۔ کبھی کبھی انہیں عربی پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا۔ اسی دوران اقبال کو ان کا شاگرد بننے کا اتفاق ہوا۔ دوسرے لفظوں میں براؤن کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ اقبال کے استاد بنے۔

۱۹۰۶ء میں براؤن کی شادی مس ایلیس بلیک برن سے ہوئی - اسی سال ان کی لکھی ہوئی تاریخ ادبیات ایران کی دوسری جلد شائع ہوئی - براؤن نے تاریخ ادبیات ایران کی چار جلدیں مکمل کیں۔ وہ جدید دور کے عظیم مستشرق اور انسان دوست اور علم دوست استاد تھے، جنہوں نے اپنی زندگی مشرقی تصورات حیات اور اس کے مطالعہ کے لیے وقف کر دی تھی - چالیس برس تک انہوں نے اسلامی علوم اور مشرقی تہذیب و تمدن اور ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے مطالعہ کا عکس اپنی چند ایک تصانیف کی شکل میں چھوڑا - اقبال کے دل میں پروفیسر براؤن کی اس لیے بھی قدر و منزلت تھی کہ وہ انگریز مستشرق ہونے کے باوجود اسلام کے بڑے شیدائی تھے اور انہوں نے اقبال کے دل میں عربی اور فارسی کی اس اہمیت اور عظمت کو اور بھی بڑھایا، جس کی جوت بچپن میں میر حسن ایسے اتالیق نے جلائی تھی -

اقبال، جرمنی میں

اعلیٰ تعلیم کے لیے کچھ رقم تو علامہ اقبال نے اپنی ملازمت کے دوران پس انداز کر رکھی تھی اور باقی کے لیے ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے یقین دلایا تھا - مرزا جلال الدین بیرسٹر کا بیان ہے : میں ۱۹۰۰ء میں بیرسٹری کے لیے انگلستان گیا - شیخ عبدالقادر میرے بعد پہنچے - میں ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود تھا - شیخ صاحب تپاک سے گلے ملے - وطن کی یاد تازہ ہو گئی - وہ میرے ہاں ہی مقیم رہے - جب میں ۱۹۰۵ء میں وطن واپس آنے لگا تو شیخ صاحب نے مجھے تاکید کی کہ لاہور پہنچتے ہی شیخ محمد اقبال سے ملنا - ان کا ارادہ انگلستان آنے کا ہے، جو معلومات انہیں درکار ہوں، بہم پہنچانا - میں لاہور پہنچا تو اقبال خود ہی دارالاشاعت والے مولوی سید ممتاز علی کے ہمراہ ملنے کے لیے میرے ہاں چیمبرلین روڈ کے چوک والے مکان میں آ گئے اور ولایت میں قیام و طعام اور اثنائے سفر کے متعلق سوالات پوچھتے رہے - میں نے صحیح معلومات ان کے گوش گزار کر دیں - چند روز بعد مجھے علم ہوا کہ اقبال انگلستان پہنچ چکے ہیں - وعدہ کے مطابق قیام انگلستان کے مصارف زیادہ تر ان کے بڑے بھائی نے ہی برداشت کیے - اس سلسلے میں یہ لطیفہ خود اقبال کی زبانی سننے کے قابل ہے -

"جب میں ولایت گیا، تو کچھ اپنا روپیہ میرے پاس موجود تھا، لیکن زیادہ رقم میرے بھائی صاحب نے مجھ کو دی تھی۔ ولایت کے قیام کے دوران میں بھی وقتاً فوقتاً مجھ کو روپے بھیجتے رہتے تھے۔ جب میں نے کیمبرج سے بی اے کرلیا، تو انہوں نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس پورا کرکے واپس آجاؤ، لیکن میرا ارادہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کا تھا اس لیے میں نے جواب دیا کہ کچھ رقم اور بھیجیے تاکہ جرمنی جاکر ڈاکٹری کی سند بھی لے لوں۔ انہوں نے مجھ کو مطلوبہ رقم بھیج دی۔ ان ہی دنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے پوچھا "کیوں شیخ صاحب" سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لے لی ہے۔ بھائی صاحب نے جواب دیا۔ بھئی کیا بتاؤں، ابھی تو وہ ڈگریوں پر ڈگریاں لیے جارہا ہے، خدا جانے ان ڈگریوں کا اجرا کب ہوگا" [۱]

انگلستان اور جرمنی میں قیام کے دوران، اقبال برلن، میونخ، ہائیڈل برگ اور دوسرے مقامات پر تجسس و تفحص میں مصروف رہے۔ جرمنی میں ان کا زیادہ تر وقت ہائیڈل برگ میں گزرا، کیونکہ اس شہر میں، جرمنی کے دوسرے شہروں کی سیاسی سرگرمیوں اور ہنگاموں کی بہ نسبت زیادہ سکون تھا۔ علاوہ ازیں میونخ یونیورسٹی کی طرف سے تحقیق و تدقیق کے لیے وافر سہولتیں میسر تھیں کہ وہ جس پرسکون مقام پر چاہیں، اپنے علمی مشاغل میں مصروف رہ سکتے تھے جرمنی میں اقبال کے شب و روز کیسے گزرے اور ان کی طبیعت میں کس نوع کی تبدیلیاں رونما ہوئیں، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ "اقبال بہت جلد بے تکلف اور محلی بالطبع ہوگئے، لیکن وہاں کی علمی فضا اتنی وسیع و متین تھی کہ اقبال نے اپنی لندن والی شوخی، طراری اور طنازی کو ترک کرکے انکساری اختیار کرلی۔ دو جوان اور حسین پروفیسر عورتیں فراؤ پروفیسر واؤ ناسٹ اور فراؤ پروفیسر سینے شال اقبال کی استاد تھیں، جو انہیں فلسفے کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دیتی تھیں

---

[۱] آثار اقبال ص ۳۶

یونیورسٹی کے تدریسی معلومات کے علاوہ ہر طالب علم کشتی رانی، موسیقی، باغبانی، کوہ پیمائی وغیرہ سے کوئی نہ کوئی مشغلہ اختیار کر لیتا تھا اور کبھی کبھی اقبال بھی ان شغلوں میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔

یونیورسٹی ہاسٹل میں کوئی ایک سو طالب علم اور پروفیسر رہتے تھے اور اس ہاسٹل کی منتظمہ ایک ستر سال کی بزرگ خاتون فراؤ پروفیسر ہیرن تھیں، جو پورے ہائیڈل برگ میں قابل ترین استاد تسلیم کی جاتی تھیں اور موسیقی میں بے حد مہارت رکھتی تھیں۔ اس یونیورسٹی میں معلم و متعلم کا معیار زیست بالکل یکساں تھا اور بادی النظر میں ان کے درمیان امتیاز کرنا دشوار تھا۔ صرف تعلیم و تدریس کے اوقات میں یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ طلبہ کون کون ہیں؟ ان کے پروفیسر کون کون ہیں اور ان کے مبلغ علم کا کیا عالم ہے؟ ؟ [1]

ہائیڈل برگ سے اقبال میونخ پہنچے۔ اس سے قبل انہوں نے اپنے اولین اسباق اسی شہر میں حاصل کیے تھے۔ میونخ میں انہیں پروفیسر ران سے ملنا تھا۔ اقبال کے ہمراہ چند دوسرے طالب علم بھی تھے۔ دوران ملاقات پروفیسر ران کی بیٹی نے ان سے بہت سے سوالات پوچھے۔ ہائیڈل برگ میں قیام کے دوران اگرچہ اقبال کا مطالعہ کافی وسیع ہو چکا تھا، لیکن پروفیسر ران کی بیٹی کے بعض سوالات اور پھر اقبال کے جوابات سے اُس نے اعتراضات کچھ اس انداز میں کیے کہ اقبال قدرے پریشان ہو گئے بہرکیف پروفیسر ران کی بیٹی ہی اقبال کی معلم و اتالیق بنی اور اقبال نے اس کی زیر نگرانی اپنا وہ مشہور مقالہ ایرانی فلسفہ مابعد الطبیعات مرتب کیا، جس پر انہیں میونخ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ اس کے بعد اقبال ہائیڈل برگ آئے۔ جہاں کچھ مدت گزارنے کے بعد وہ بیرسٹری کی تکمیل کے لیے لندن واپس آ گئے۔

ان دنوں پروفیسر آرنلڈ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے چھ ماہ کی رخصت حاصل کی تو اقبال کو ان کی جگہ قائم مقام پروفیسر بنا دیا گیا۔ لندن میں قیام کے دوران اقبال آل انڈیا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کی مجلس عاملہ کے رکن منتخب کر لیے گئے۔ یہ مئی ۱۹۰۸ء کا واقعہ ہے، جب ویسٹ منسٹر لندن کے کیکسٹن ہال میں سید امیر علی ایم اے سی آئی ای کے زیر صدارت لندن میں مقیم مسلمانوں کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں سید امیر علی کو صدر اور

---

[1] ذکر اقبال۔ سالک۔ ص ۵۴

ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا کو مجلس عاملہ کا ممبر منتخب کر لیا گیا تو قواعد و ضوابط وضع کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی میں سید امیر علی کے ساتھ میجر سید حسن بلگرامی اور ڈاکٹر محمد اقبال بھی شامل تھے۔

مس بیک

جن دنوں اقبال یورپ میں تھے، مس بیک برصغیر پاک و ہند کے طالب علموں کے لیے ایک مادر شفیق کی حیثیت رکھتی تھیں۔ انگلستان میں مقیم ایشیائی طالب علموں میں اقبال کی قابلیت، علمی فضیلت اور حاضر دماغی کا خاصا شہرہ تھا۔ مس بیک ہندوستانی طلبہ کی امداد، دیکھ بھال اور خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتی تھیں اور کبھی کبھی ان طالب علموں کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو بھی کر لیتی تھیں، تاکہ باہم مل بیٹھنے اور تبادلہ خیال کا موقع مل سکے۔ انہوں نے اقبال کی شہرت سنی تو انہیں بطور خاص دعوت دی اور اکثر معاملات میں ان کی معاونت اور رہنمائی بھی کرتی رہیں۔

مس بیک کا پورا نام مس ایمے جیسی بیک (Miss Emmajessi Beck) تھا۔ وہ بڑی حوصلہ مند خاتون اور کافی اثر و رسوخ کی مالک تھیں۔ تمام ارکان دولت برطانیہ سے ان کے خوشگوار تعلقات تھے۔ اہل علم سے خاص شغف رکھتی تھیں۔ ان کے والد لندن کے لارڈ میئر اور بھائی مسٹر بیک علی گڑھ کالج کے سب سے پہلے پرنسپل تھے، جنہیں سر سید احمد خاں نے اس عہدہ جلیلہ پر مامور کیا تھا۔ مسٹر بیک کی وجہ سے مس بیک کو کئی بار برصغیر پاک و ہند آنے کا اتفاق ہوا اور اپنی عالی دماغی اور حسن تدبیر کی وجہ سے بہت سے راجگان و والیان ریاست سے ان کے خصوصی مراسم رہے۔ ان کی علم دوستی اور اخوت و مودت کے جذبہ کے پیش نظر وزیر اعظم ریاست گوالیار سر سلطان احمد ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور بیگم صاحبہ* آف بھوپال نے انہیں بہن بنایا ہوا تھا۔

اقبال کے شفیق استاد پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ سے مس بیک کی گہری دوستی تھی۔ اس نسبت سے وہ اقبال کی ذہانت اور لیاقت کی بہت شیدائی تھیں اور ان کا احترام کرتی تھیں۔ مسٹر بالڈون، ریمزے میکڈانلڈ، آنرک فٹ، لارڈ اولیویر، لارڈ برکن ہیڈ، لارڈ ارون وائسرائے آف انڈیا

ڈیوڈ ڈیبن، مسز فرانسس ینگ ہز بنڈ اور ہز ہائی نیس آغا خاں ایسی شخصیتیں بھی مس بیک کی دعوتوں میں شریک ہوتی تھیں۔ اقبال سے انسیت اور محبت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مس بیک نے علامہ کے بڑے صاحبزادے آفتاب اقبال کی قیام انگلستان کے دوران دس سال تک کفالت کی۔ اور انہیں انگلستان کی بڑی بڑی شخصیتوں سے ملوایا۔

مس بیک کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس وقت وہ چند روز کے لئے الہ آباد آئی ہوئی تھیں کہ پروفیسر اچاریہ کے ہاں ناشتے کی میز پر بیٹھے بیٹھے ان کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ مس بیک کا خاندان مذہباً کوئیکرس تھا۔ عیسائیوں کا یہ فرقہ خیرات بانٹنے، شرافت اور نیکی کا درس دینے اور علم دوستی اور طلبہ کی سرپرستی کرنے میں مشہور تھا۔ یہ فرقہ ظلم و شقاوت کے خلاف تھا اور جنگ کے بجائے امن کا پرچار کرتا تھا۔ ہسپتالوں میں جاکر بیمارداری اور بیمار پرسی کرنا اس فرقہ کے لوگوں کے مذہب کا اخلاقی جزو تھا۔

اقبال اور عطیہ بیگم

اس زمانے میں عطیہ بیگم بھی انگلستان میں تحصیل علم کے لیے آئی ہوئی تھیں مس بیک نے یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو اس کے نام ایک دعوت نامہ بھیجا، جس میں اسے بتایا کہ آج تمہاری ملاقات ایک قابل شخصیت محمد اقبال سے ہوگی، جو کیمبرج سے یہاں محض تمہاری ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ عطیہ بیگم نے اس مراسلے سے قبل اقبال کا نام نہیں سنا تھا۔ اس بارے میں وہ خود کہتی ہیں: لندن میں مس بیک کے مکان پر جہاں ہندوستانی طلبہ اور ملاقاتی اس غیر شاعرانہ اور غیر روح پرور ماحول میں جمع ہوا کرتے تھے، میری اقبال سے پہلی ملاقات ہوئی۔ فلسفیانہ مضامین پر تبادلہ خیال کی وجہ سے انہوں نے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور اکثر مواقع پر انہوں نے چھٹیوں کے دن گزارنے کے لیے مقام کے تعین اور کتابوں کے انتخاب میں میری امداد طلب کی۔ جدید اور قدیم فلسفہ کے متعلقہ نصاب کو میں نے ان ہی دنوں ختم کیا تھا اور افلاطون اور نیٹشے جیسے فلسفیوں کے نظریوں کی تشریح کے بارے میں ہماری آراء میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اقبال مطمئن نہیں تھے میں نے

خط وکتابت میں مباحث کو جاری رکھا اور بہت سے خطوط جواب دے دیئے جانے کے بعد معرض وجود میں نہ رہے - اس لئے کہ اس وقت یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اندر کوئی خاص اہمیت رکھتے ہیں - اپریل ۱۹۰۷ء میں مجھے ان کا ایک خط ملا، جس کے ساتھ ایک نظم بھی منسلک تھی اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس پر تنقید کروں۔ وہ نظم مع خط کے درج ذیل ہے:

ٹرینیٹی کالج کیمبرج

۲۴ اپریل ۱۹۰۷ء

مائی ڈیر مس فیضی

میں اس خط کے ہمراہ ایک نظم بھیج رہا ہوں، جس کے بھیجنے کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا اور میں شکر گزار ہوں گا، اگر آپ اسے غور سے پڑھیں گی اور اپنی تنقید سے مجھے مطلع کریں گی - میں آپ کو اپنی پولٹیکل اکانومی (اردو ایڈیشن) بھیجنے کا خیال کر رہا ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس یہاں اس کا ایک بھی نسخہ موجود نہیں ہے - اگرچہ ہندوستان سے اسے منگوانے میں کوئی دشواری نہ ہوگی، میں اس میل (ڈاک) سے اس کے لیے خط لکھ دوں گا۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گی

آپ کا صادق

ایس ایم اقبال

(نظم)

اے گل ز خار آرزو آزاد چوں رسیدۂ
تو ہم زخاک این چمن مانند ما دمیدۂ

اے شبنم از فضائے گل آخر ستم چہ دیدۂ
دامن ز سبزہ چیدۂ تا بفلک رمیدۂ

از لوحِ خویش باز پرس قصۂ جرمہائے ما
آخر جوابِ ناسزا، از لبِ ما شنیدۂ

با من مگو کہ مثلِ گل ہم دارہ شاخ بستہ باش
مانند موجِ بو مرا آوارہ آفریدۂ

ہنگامۂ دیر یک طرف، شورشِ کعبہ یک طرف
از آفرینشِ جہاں دردِ سرے خریدۂ

ہستیم ما گدائے تو یا تو گدائے ماستی
بہر نیاز سجدۂ در پسِ ما دویدۂ

افتی اگر بدستِ ما حلقہ بگردِ تو کشیم
ہنگامہ گرم کردۂ خود از میاں رمیدۂ

اقبالِ غربتِ توام نشتر بدل ہمی زند
تو در ہجومِ عالمے یک آشنا ندیدۂ

اقبال کے بارے میں، اپنے تجربات اور معلومات کا صحیح اور مکمل خاکہ پیش کرتے وقت میں صرف اپنی یادداشت پر اعتماد نہیں کرنا چاہتی اور چونکہ وہ اوریجنل خطوط جو میں نے یورپ سے اپنی بہنوں کے نام واقعات کے ذاتی ریکارڈ کی حیثیت سے پرائیویٹ ڈائری کی صورت میں بھیجے تھے، آسانی سے مل گئے ہیں، اس لئے میں روزمرہ کی وہ باتیں بیان کرنے کے قابل ہوگئی ہوں جن سے ان امتیازی کیفیات، ذہنی رجحانات اور بعض مخصوص خصائص کی تشریح ہوجاتی ہے، جنہوں نے یورپ میں زمانہ طالب علمی میں اقبال کی شخصیت کی تعمیر کرنے میں مدد دی تھی - پہلی اپریل ۱۹۰۷ء کے لیے مس بیک نے ان ہی کے الفاظ میں مجھے ایک "مخصوص دعوت نامہ" بھیجا، تاکہ میں ایک ذہین اور طباع طالب علم سے ملاقات کروں، جن کا نام محمد اقبال ہے، جو کیمبرج سے خاص طور پر مجھ سے ملنے کے لیے آرہے ہیں - اس دعوت نامے نے میرے لئے قدرے دلچسپی پیدا کردی، اس لیے کہ اس سے قبل میں نے اقبال کا نام بھی نہ سنا تھا اور چونکہ لندن میں مختلف ہندوستانیوں کے پاس سے میرے

ہاں ایسے دعوت نامے آیا کرتے تھے، اس لئے اس دعوت نامے نے عارضی شوق تجسس سے زیادہ اور کوئی جذبہ پیدا نہیں کیا، مگر چونکہ مس بیک لندن میں مقیم ہندوستانی طلبہ کی بہبودی کی نگران تھیں اور ان سے مادر مشفق کا سا برتاؤ کرتی تھیں، اس لئے ان کے حکم کی تعمیل لازمی تھی۔ کھانے کی میز پر جو گفتگو ہوئی، اس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ اقبال فارسی اور عربی کے علاوہ سنسکرت میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ بہت بڑے حاضر جواب ہیں اور دوسروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور حاضرین پر مزاحیہ فقرے کسنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں[1]

اس میں کلام نہیں کہ اقبال، فارسی، عربی اور سنسکرت میں درخور دافی رکھتے تھے، بڑے حاضر جواب ظریف اور طناز تھے۔ یکم اپریل کو مس بیک کے ہاں کھانے کی میز پر عطیہ بیگم اور اقبال کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ بڑی دلچسپ اور فکر انگیز تھی۔ اسی کی بدولت دونوں ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر آتے گئے۔ عطیہ بیگم کے نام اقبال کے خطوط اور اقبال کے نام عطیہ بیگم کے خطوط سے ایسی بہت سی باتوں کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ بیگم اور اقبال کے درمیان حافظ کی شاعری پر گفتگو ہوئی تو اقبال نے حافظ کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کیا اور کہا کہ جب میں حافظ کے موڈ میں ہوتا ہوں تو اس کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت حافظ میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے، گویا میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔ پہلی ملاقات میں اقبال نے عطیہ بیگم سے ایک ایرانی شاعر بابا فغانی کا ذکر کیا، جسے ہندوستانی بہت کم لوگ جانتے ہیں اور تلقین کی کہ تم اس کا کلام ضرور پڑھا کرو، کیونکہ زندگی کے متعلق بابا فغانی کا تصور مختلف ہی نہیں دلچسپ بھی ہے۔

عطیہ بیگم ان دنوں لندن اور ہندوستان میں اپنے سفر کی ڈائری لکھنے کی وجہ سے مقبولیت حاصل کر چکی تھیں اقبال نے پہلی ملاقات میں اس ڈائری کی تعریف کی اور کہا کہ میرے دل میں آپ سے ملاقات کی تمنا بیدار ہونے کا سبب یہی ڈائری ہے۔ پھر اقبال نے عطیہ بیگم کو کیمبرج میں مسٹر

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم، مترجم ضیاء الدین برنی ص ۱۹ تا ۲۰

اور مسز سید علی بلگرامی کے ہاں مہمان بننے کی دعوت دی۔ بقول عطیہ بیگم "اقبال کو حسب خواہش اپنے تئیں دلچسپ اور خوشگوار بنانے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ سوسائٹی میں وہ بہت زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے اور حاضر جوابی میں یا تعریف کرنے میں وہ کبھی نہیں جھجکتے تھے"۔ اقبال کی شخصیت کے یہی پہلو عطیہ بیگم کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے اور دونوں نے ۱۲ اپریل کو کیمبرج میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔

پہلی ملاقات کے چند روز بعد اقبال نے عطیہ بیگم کو فرانکے ٹس میں جو لندن کا مشہور ریشن ایبل ہوٹل تھا رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ عطیہ بیگم نے یہ دعوت قبول کر لی۔ اس دوران اقبال نے عطیہ بیگم کا تعارف ان جرمن فضلاء سے کرایا، جن کے ساتھ وہ ریسرچ کا کام کر رہے تھے۔ عطیہ بیگم کہتی ہیں کہ اس ڈنر کی ہر شئے نہایت آراستہ و پیراستہ، باقاعدہ اور خوشنما تھی۔ میں نے اس حسن ترتیب کی تعریف کی، تو اقبال گویا ہوئے: میرے قالب میں بیک وقت دو شخصیتیں ہیں۔ ظاہر شخصیت، نہایت کارآمد اور روبہ عمل ہے اور باطنی شخصیت، تخیل تصوف اور تصوّر کا پیکر ہے۔ اس تقریب کے دوران اقبال اور عطیہ بیگم کو جرمن سکالروں کے ساتھ کھل کر بات چیت کا موقع ملا۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو دلآویز اور بے حد معلومات افزا تھی۔

اقبال کی دعوت کے جواب میں عطیہ بیگم نے ۱۵ اپریل کو ان کے اعزاز میں چائے کی ایک ہلکی پھلکی دعوت کا انتظام کیا۔ اقبال کے علاوہ بعض دوسرے سکالر بھی اس میں شریک تھے۔ مس عطیہ نے چائے کی اس دعوت میں مس سلوسٹر اور مس لیوی جو لسانیات اور فلسفہ کی ذہین طالبات تھیں اور موسیو ماندل اور ہیر میٹز ٹراٹھ مشہور موسیقار بھی شریک ہوئے۔ ان شرکاء سے پارٹی میں زندہ دلی کے بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ اقبال نے اس موقع پر بہت سے فی البدیہہ اشعار کہے۔ پرکیف فضا میں شام تک پھلجھڑیاں چھٹتی رہیں۔ عطیہ بیگم کہتی ہیں: میں نے ارادہ کیا کہ اقبال کے اشعار لکھ لوں، اس پر اقبال نے کہا کہ اس قسم کے اشعار صرف وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں، بس پڑھے گئے اور قصہ تمام ہوا۔ ان کو نقل کرنا بے سود ہے[1]

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم ص ۲۵

۲۲ / اپریل کو عطیہ بیگم، اقبال اور شیخ عبدالقادر لندن سے کیمبرج روانہ ہوئے اور سید اور بیگم سید علی بلگرامی کے ہاں پہنچے ۔ اقبال نے سید علی بلگرامی اور ان کے اہل خانہ سے عطیہ بیگم کا تعارف کرایا ۔ اس موقع پر بھی نہایت بلند پایہ علمی باتیں ہوئیں عطیہ بیگم کہتی ہیں کہ گفتگو کے دوران کبھی کبھی اقبال افسردہ دکھائی دینے لگتے تھے اور بادی النظر میں یوں لگتا تھا کہ اب شاید ان کی زبان خنجر جیب رہے گی، لیکن جہاں کہیں ہم نے کوئی ایسی قابل جواب بات کہی، اقبال کے لب فوراً وا ہوتے اور وہ کوئی نہ کوئی برجستہ جواب داغ دیتے ۔ عطیہ نے اس تقریب کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

"دن بھر بڑی اچھی گفتگو ہوتی اور جو لوگ بلگرامی کے مکان پر جمع تھے، وہ سب ایک دوسرے سے عالمانہ مباحث کرتے رہتے ۔ کبھی کبھار اقبال تھکے ہوئے اور بے حس سے معلوم ہوتے ۔ یہ کیفیت اس وقت ہوا کرتی تھی، جب کہ وہ موقع کے منتظر رہتے تھے کہ پارٹی کے کسی شخص کے منہ سے کوئی بات نکلے اور وہ برق رفتاری سے اس کا جواب دیں ۔ میں نے اقبال کی یہ خصوصیت پہلی مرتبہ یہاں محسوس کی اور اندازہ لگا لیا کہ جب کبھی وہ بے تعلق اور اچاٹ سے معلوم ہوتے ہیں تو فقط اس وقت جب کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے موقع کے متلاشی رہتے ہیں اور اس وقت ان کا جواب اتنا جلد اور غیر متوقع ہوتا ہے کہ فریق ثانی اس غیر متوقع اچانک پن سے کم سے کم تھوڑی دیر کے لیے تو ضرور سٹپٹا جاتا ہے ۔ انہیں دیکھ کر مجھے دلیم گلیڈ اسٹون کی اور ان کے طریقوں کی یاد تازہ ہو گئی ۔ جو پارلیمنٹ کے ایوان میں برتا کرتے تھے ۔ میں اسی شام کو لندن واپس آ گئی" [۱]

یکم جون کو پروفیسر آرنلڈ نے دریا کے کنارے اقبال کے اعزاز میں جس پکنک کا اہتمام کیا، عطیہ بیگم نے اس میں شرکت کی اور پھر ۹ جون ۱۹۰۷ء کی دعوت میں بھی پروفیسر

---

[۱] اقبال از عطیہ بیگم ص ۲۶

آرنلڈ نے اقبال کے ہمراہ عطیہ بیگم کو بھی مدعو کیا۔ دوسرے دن اقبال عطیہ بیگم سے پھر ملنے گئے اور فلسفہ پر چند جرمن اور عربی کتابیں ہمراہ لائے۔ دونوں نے بیٹھ کر ان کتابوں کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ۲۲ جون کو مس عطیہ نے اپنے ہاں ایک تقریب کا خصوصی طور پر انتظام کیا اور اس میں اقبال کے علاوہ لارڈ سنہا کی صاحبزادیوں کمولا اور رمولا نے رقص پیش کیا۔ ۲۷ جون کو مس شولی نے عطیہ بیگم کو ہندوستانی طرز کے ڈنر پر مدعو کیا۔ عطیہ بیگم کا کہنا ہے کہ جب میں اس ڈنر میں شریک ہوئی، تو مجھے پہلی بار انکشاف ہوا کہ اقبال ان کے ہاں ہی رہتے ہیں۔ اقبال کی ہدایت پر ہی مس شولی نے عطیہ بیگم کو دعوت نامہ بھیجا تھا۔ اپنی ڈائری میں عطیہ بیگم نے مزید لکھا ہے:

۲۹ جون کو لیڈی ایلیٹس کے یہاں فیشن ایبل پارٹی ہوئی، جہاں اقبال کو دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ جب میں ان سے مصروف گفتگو تھی، عین اس وقت مس سروجنی، نہایت قیمتی زرق برق لباس میں ملبوس، ہیرے جواہرات سے لدی پھندی، بھدے طریقے سے بنی ٹھنی یکدم اندر آگئیں۔ انسانیت کا یہ نمونہ انگلستان جاتے وقت میرے ہمسفر تھا۔ مس موصوف اپنے آپ کو تمام خوبیوں کا مرقع سمجھتی تھیں۔ انہوں نے مجھے ہی نہیں، ہر اس شخص کو کلیتاً نظر انداز کیا، جو ان کی راہ میں آیا، یا جس نے انہیں دیکھا اور بلانے کی کوشش کی۔ مس سروجنی پیکر جذبات بنی سیدھی اقبال کے پاس پہنچیں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا "میں صرف آپ سے ملنے کے لیے یہاں آئی ہوں" اقبال نے اس عزت افزائی کا یوں جواب دیا "یہ صدمہ میرے لئے فوری اور تعجب انگیز ہوگا کہ میں اس کمرے سے زندہ باہر نکل سکوں۔"

۴ جولائی ۱۹۰۷ء کو اقبال نے "تاریخ دنیا" کی تدوین و تحقیق کا کام مکمل کر لیا۔ یہ "تاریخ دنیا" انہوں نے جرمنی امتحان کے لیے لکھی تھی۔ اقبال نے یہ سارا مسودہ عطیہ بیگم کو سنایا۔ اس بارے میں عطیہ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے: "وہ علم کے مخزن تھے اور ان کی یادداشت حیرت انگیز طریقہ پر قوی تھی۔ جس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے، جو انہوں نے اس کتاب میں جمع کئے تھے۔ اس روز بھی مس شولی نے مجھے ہندوستانی طرز کا کھانا کھلایا۔"

عطیہ نے مزید لکھا ہے: فلسفیانہ مضامین سے دلچسپی بڑھتی گئی اور اقبال نے میری دلچسپی کے پیش نظر ۱۳-۱۴-۱۵ جولائی ۱۹۰۷ء کی تاریخیں مقرر کیں، تاکہ روزانہ دو گھنٹے تک فلسفہ کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ میں، اقبال اور پروفیسر شیک سینٹ، جنہوں نے جرمنی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی، آپس میں شاعری اور فلسفہ پر گہری دلچسپی کے ساتھ بحث کرتے۔ اقبال تمام تر جرمن علوم وفنون کی تائید میں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم علم کے کسی شعبہ میں اپنی معلومات بڑھانا چاہتے ہو تو تمہارا منتہائے نظر جرمنی ہونا چاہیئے۔ انہوں نے پھر کہا کہ دوسروں سے بحث کرتے وقت ایک نئی دنیا تمہارے سامنے آجائے گی اور میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے، اسی طریقے سے حاصل کیا ہے۔ دوسرے دن اقبال نے مجھے اپنی پولٹیکل اکانومی کا اصل مسودہ تحفے کے طور پر دیا اور ساتھ ہی وہ مقالہ بھی جس پر انہیں ڈگری ملی تھی، بعد کو وہ جرمن زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ اس فاضلانہ مقالے کی بدولت ان کی ناموری، شہرت اور وقار میں بہت اضافہ ہو گیا۔[1]

۱۹ اگست ۱۹۰۷ء کو ہندوستانی طلبہ کا ایک گروپ جس میں ڈاکٹر فیضی اور ان کی بہن عطیہ بیگم بھی تھیں، لندن سے بغرض سیر وتفریح ہیڈل برگ پہنچا، اقبال، اس گروپ کا استقبال کرنے کے لیے وہاں موجود تھے، یہاں بھی اقبال اور عطیہ بیگم میں ملاقاتیں رہیں۔ ۲۲ اگست کو ایک عجیب وغریب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ طلبہ اور پروفیسروں نے باہم مل کر پکنک پارٹی کا اہتمام کیا اور ہر شخص کو اس کے گھر سے لیتے گئے۔ اقبال کا مسکن سب سے آخر میں تھا۔ جب وہاں پہنچے تو اقبال کو پکنک پارٹی میں تیاری کی بجائے عالم استغراق میں پایا۔ وہ عالم مدہوشی میں خاموش اور بے حرکت بیٹھے تھے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ گزشتہ شب سے ان پر یہی کیفیت طاری ہے۔ طلبہ اور پروفیسروں میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اقبال کو چھیڑیں۔ پروفیسر سینے شل اور واہ ناسٹ تو بالکل گھبرا گئیں۔ اقبال کی آنکھیں کھلی کی کھلی تھیں اور سامنے کی ایک کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ گردوپیش کے حالات کی انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ انہیں یہ بھی علم نہ ہوا کہ پکنک پارٹی کے ارکان ان کے پاس کھڑے ہیں۔ عطیہ بیگم نے بالآخر ہمت کی اور شانوں سے پکڑ کر آہستگی سے جھنجھوڑا اور کہا کہ یہ جرمنی ہے

[1] اقبال از عطیہ بیگم صفحہ ۳۰-۳۱

ہندوستان نہیں۔ براہ کرم دسکر، کو چھوڑ کر صحو کی حالت میں واپس آجائیے۔ آپ کی واردات قلب کو سوائے میرے یہاں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے بعد اقبال ہوش میں آ گئے۔

پکنک کے بعد اقبال اور عطیہ بیگم میں اس عالم استغراق کے موضوع پر کافی دیر گفتگو ہوتی رہی پھر عطیہ بیگم ہندوستان واپس آگئیں اور اقبال بھی وطن واپس آ گئے۔

عطیہ بیگم کی اصل ڈائری کے مطابق اس کے بعد کافی مدت تک دونوں میں ملاقات نہ ہو سکی۔ ہاں البتہ خط وکتابت کا سلسلہ دونوں میں جاری رہا۔ اقبال اور عطیہ بیگم کے مابین مراسلاتی تعلقات کا سراغ ۱۹۱۱ء تک کے خطوط میں ملتا ہے۔ اس کے بعد فقط یہ پتا چلتا ہے کہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں "ایوان رفعت" میں اقبال کی ملاقات عطیہ بیگم سے ہوئی۔ دونوں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران اقبال نے ایک کاغذ طلب کیا جس پر انہوں نے یہ اشعار اپنے ہاتھ سے لکھ کر عطیہ بیگم کی نذر کئے۔

بہ طوافِ کعبہ رفتم بہ حرم رہم نہ دادند
کہ بروں درچہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

(برائے جریدہ)

ترسم کہ تو می رانی زورق بسراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر
برکشت و خیاباں ہیچ برکوہ و بیاباں ہیچ
برقے کہ بخود ہیچد میرد بسحاب اندر
ایں صورت دل آویزے از زخمہ مطرب نیست
مہجور جناں حورے نالد برباب اندر

محمد اقبال

"دولت کدہ عطیہ بیگم"

بمبئی ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

اقبال اور عطیہ بیگم کے باہمی تعلقات کس نوعیت کے تھے۔ اس بارے میں مختلف

حلقے، متضاد رائے رکھتے ہیں، لیکن سب سے معتبر اور شائستہ رائے اس حلقے کی ہے، جو اقبال اور عطیہ بیگم کے درمیان ان کی خط و کتابت اور ملاقاتوں کو صرف اور صرف دو فلسفیوں کے مابین گہری دوستی پر محمول کرتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ برنی نے عطیہ بیگم کو بڑے قریب سے دیکھا ہے اور اقبال سے بھی ان کی ملاقاتیں رہی ہیں۔ ان کی رائے ہے: اقبال بے تکلفی کے باوجود ان کا احترام کرتے تھے اور اس بے تکلفی اور احترام دونوں کی جھلک خطوں میں جابجا نظر آتی ہے۔ میرے اپنے ذاتی مشاہدات سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ اقبال ان کے ساتھ خصوصیت سے پیش آتے تھے اور خود عطیہ بیگم بھی ان کی عظیم المرتبت شخصیت کا پورا پورا خیال رکھتی تھیں۔

دراصل یہ خطوط دو ایسی شخصیتوں کے باہمی تبادلہ خیالات کا عکس ہیں، جو اپنے طور پر ہنگامہ پرور اور عجیب و غریب واقع ہوئی ہیں۔ ان کی دوستی چالیس سال قبل شروع ہوئی اور آخر وقت تک قائم رہی۔ اقبال نہ صرف انہیں نظمیں بھیجتے تھے اور ان سے تنقید کے طالب ہوتے تھے، بلکہ انہوں نے اپنے مقالے بھی یونیورسٹی میں بھیجنے سے پہلے انہیں پڑھ کر سنائے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ان پر تبصرہ کریں ... اقبال جانتے تھے کہ سوائے ان کے اور کوئی ہستی ایسی نہیں، جو ان کے دلی جذبات کو سمجھتی ہو اور ان کی قنوطیت کو دور کر کے ان میں امید، روشنی اور سکون پیدا کر سکتی ہو۔ بہر حال دو یکساں طبیعت رکھنے والے افراد کی یہ نہ ٹوٹنے والی دوستی تھی جو خطوں اور ملاقاتوں میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہی[1]

یورپ سے مراجعت

یورپ میں تین برس کے قیام کے دوران اقبال نے جو نظمیں اور غزلیں لکھیں، ان کی تعداد بہت کم ہے۔ "بانگ درا" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اس عرصہ میں چھوٹی بڑی کل ۲۴ نظمیں اور چند غزلیں کہیں اور وہ بھی زیادہ تر شیخ عبدالقادر کی تحریک پر

---

[1] مقالہ یوم اقبال، ضیاءالدین برنی، بمبئی ۱۹۴۷ء

بوران سے 'مخزن' کے لیے آئے روز نظموں کا تقاضا کرتے رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اور جرمنی میں قیام کے دوران اقبال نے زیادہ تر وقت حصول تعلیم پر صرف کیا۔ بنا بریں وطن سے دور جا کر انہیں احساس ہوا کہ مسلمان، جو قوم پرستی میں مبتلا ہیں وہ شدید خسارے میں ہیں، کیونکہ قوم پرستی مسلمانوں کے مرض کا مداوا نہیں۔ اقبال نے یورپ میں رہ کر دیکھ لیا کہ مغرب کی جو اقوام قوم پرستی میں مبتلا ہیں، وہ انتہائی درجے کی خود غرض ہو چکی ہیں۔ توسیع پسندی، ملک گیری اور استحصال کی حرص و آز نے ایسی قوموں کو انسانیت اور اخلاق سے محروم کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے دنیائے اسلام کے جمود، مسلمانوں کی بے عملی اور تعلیمات اسلامی کی کسمپرسی کو دیکھا، تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ملت اسلامیہ کو اپنے افکار سے بیدار کریں گے اور ملت اسلامیہ کے ہر فرد کے دل میں اسلام کی حقیقی روح پھونکیں گے۔ یہی احساس عزم لے کر اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں کیمبرج سے بی اے کی ڈگری، بیرسٹرایٹ لا کی ڈگری اور میونخ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر وطن روانہ ہوئے۔ انگلستان سے سیدھے بمبئی پہنچے وہاں سے دہلی اور دہلی سے انبالہ میں اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کرتے ہوئے ۲۷ جولائی کو دوپہر کی ٹرین سے لاہور پہنچے، جہاں بلا تخصیص مذہب و ملت، معززین اور سینکڑوں لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ سہ پہر کی چائے علامہ اقبال نے بھاٹی دروازہ کے بیرونی باغ میں پی، جس کا انتظام شیخ گلاب دین ایڈووکیٹ نے کیا تھا۔ چائے کے بعد اقبال اسی شام سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔

منشی محمد دین فوق، اقبال سے روابط کے تحت بھی اور اقبال کے مخزن نوم ہونے کے باعث بھی، اکثر ان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ اقبال نے یورپ میں قیام کے دوران جو علمی کارنامے انجام دیئے، اس کی تفصیلات بھی "کشمیری میگزین" میں چھپتی رہیں۔ پھر جب اقبال لندن سے لاہور پہنچے، تو اس کا حال یوں درج کیا گیا[۱]:

شیخ محمد اقبال ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز پیر شام کی گاڑی پہ لاہور تشریف لائے۔ وقت

---

[۱] کشمیری میگزین، اگست ۱۹۰۸ء ص ۳۲ تا ۳۵

مقررہ سے پیشتر ان کے احباب استقبال کے لیے اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے - باہر اور اندر خاصا ہجوم تھا - اقبال، نہایت خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے سب سے ملے - بھاٹی دروازہ کے باغ میں شیخ گلاب دین صاحب وکیل چیف کورٹ پنجاب کی جانب سے خیمہ وغیرہ ایستادہ تھے، خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا نے شیخ صاحب کی قابلیت کے متعلق چند الفاظ فرمائے - اللہ یار جوگی نے خیر مقدم کرتے ہوئے نظم پڑھی :

کدھر ہے کیف مسرت مجھے سنبھال سنبھال
کہ ہو کے آئے ولایت سے ڈاکٹر اقبالؒ

چڑھی ہوئی ہیں خوشی کی خمار سے آنکھیں
نشہ میں چور ہوں، دل ہے مرا نہال نہال

خدا کے فضل سے وہ کی ہیں ڈگریاں حاصل
کہ اس زمین میں جن کا ہے اندراج محال

گزشتہ پیر کو لاہور کے سٹیشن پر
رئیس سارے کھڑے تھے برائے استقبال

وہ لیٹ گاڑی کا ہونا، وہ انتظار شدید
وہ ہر زباں پہ ترا ذکر سب کو ترا خیال

دھوئیں کا اٹھنا وہ گاڑی کا یک بیک آنا
نکلنا کمرے سے تیرا بہ شکل بدر کمال

ترس گئی تھیں یہ آنکھیں کس کے درشن کو
دوبارہ لایا یہ موقع وہ ایزد متعال

وہ کش مکش تھی احبا کو یہ دیکھنے کی تیرے
رسائی پانا بھی تجھ تک تھا ایک امر محال

گلے سے ملتے تھے تیرے اچھل اچھل کر دوست
کوئی تھا دور کے نظارہ ہی سے تیرے نہال

ترس ترس کے یہ موقع خوشی کا پایا ہے
کہ آئے خیر سے گھر پھر کے حضرت اقبالؒ

تھی حاجت ایسے ہی لیڈر کی اہل خطہ کو
جواں خیال، جواں سال اور جواں اقبال

تری ترقی کی دنیا ہے سامنے تیرے
زمانہ اب ہے موافق سنبھل ہمیں بھی سنبھال

گئے وہ دن کہ جو کہتے تھے اب مٹی یہ قوم
اڑا وہ رنگ جو سنتے تھے اب گرے پر و بال

یہی دعا ہے یہی آرزو، یہی امید
کہ دوست شاد ہوں، دشمن ترے رہیں پامال

اس کے بعد منشی غلام علی خاں غلامی خوشنویس 'پیسہ اخبار' لاہور نے مندرجہ ذیل نظم پڑھی :-

آمد اقبالؒ سے جشن طرب گھر گھر ہوا
اوج پر ہے آج پھر لاہور کا اختر ہوا

دوست اور احباب خرم ہیں ترے دیدار سے
جبکہ تو مثلِ ہلالِ عید جلوہ گر ہوا

ڈگریاں پاکر ولایت سے تو آیا کامیاب
فلسفہ میں خاص کر بیکن کا تو ہمسر ہوا

کیوں نہ ہو ہندوستان میں تیرا شہرہ چار سو
تیرا علم و فضل اور اخلاق جب برتر ہوا

ہوگیا پنجاب میں ممتاز شہر سیالکوٹ
فخر اس کو جب کہ تیرے نام نامی پہ ہوا

فاضلان دہر میں پایا ہے تو نے امتیاز
کامیابی کا قلعہ ہمت سے تیری سر ہوا

حبذا، تو خیریت سے واپس آیا پھر یہاں
حق میں دن لاہور کے یہ عید سے بڑھ کر ہوا

آ۔ کہ تیری جا ہماری چشم و دل میں ہے مدام
تیرا استقبال بزم عیش کا منظر ہوا

ہے غلامی بھی ترا مخلص قدیم اے نیک خو
خیر مقدم کو ترے یہ بھی بدل حاضر ہوا

آثارِ اقبال

اقبال کو یورپ سے آئے ابھی تین چار روز ہی گزرے تھے کہ ان کے بھائی شیخ عطا محمد کو ان کے لئے دفتر کی فکر ہوئی۔ چنانچہ وہ اس تلاش و جستجو میں لاہور تشریف لائے اور علامہ اقبال کے لیے کرائے پر دفتر لینے کے لیے مرزا جلال الدین بیرسٹر کی خدمات حاصل کیں۔ لاہور، اقبال کے لیے نیا شہر نہیں تھا۔ اس قدیم تاریخی شہر میں انہوں نے اپنی طالب علمی کے دور کی کئی بہاریں دیکھی تھیں۔ یہی وہ شہر ہے، جہاں اقبال سب سے پہلے گورنمنٹ کالج میں داخلہ کے لیے آئے تو انہیں رہائش کے لیے کواڈرنگل ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۱ میں جگہ ملی۔ ہوسٹل کے قیام کے زمانے میں آپ بھاٹی دروازے کے اندر بازارِ حکیماں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ بزم مشاعرہ کی روداد بھی طبع ہوتی تھی۔ پہلا مشاعرہ ۲۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو حکیم امین الدین بار ایٹ لاء کے مکان پر شام چھ بجے ہوا۔ اس بزم کے دوسرے مشاعرے میں دسمبر ۱۸۹۵ء میں علامہ نے شرکت کی[1]

---

[1] نقوش لاہور جنوری ۱۹۶۶ء مقالہ حکیم احمد شجاع

کواڈرنگل ہوسٹل میں قیام کے زمانہ میں اقبال کی ساری ڈاک یہیں آتی تھی۔ وہ خود بھی خط یہیں سے لکھتے تھے۔ اس دور کا اہم خط مولانا احسن مارہروی کے نام ہے، جو اقبال نے انہیں ۲۸ جنوری ۱۸۹۹ء کو تحریر کیا۔ اس پر ہوسٹل کا پتا درج ہے۔ اس خط میں آپ نے مولانا کے "گلدستے" کے لیے غزل کا وعدہ کیا اور مرزا داغ کی تصویر کی فرمائش بھی کی۔[۱]

مولانا صلاح الدین احمد کے بڑے بھائی مولوی ضیاء الدین احمد، اقبال کے کلاس فیلو تھے۔ ان کا مکان گمٹی بازار سے ذرا آگے سید مٹھا میں ایک تنگ سی گلی، کوچہ ہنومان، میں تھا۔ ساری آبادی ہندوؤں کی تھی، سوائے مولوی ضیاء الدین احمد کے والد کے گھرانے کے۔ اقبال طالب علمی کے دور میں کبھی کبھار ان کے ہاں بھی جا کر رہتے تھے۔ اس بارے میں وہ خود فرماتے ہیں: میں کسی زمانے میں کوچہ ہنومان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ روزانہ علی الصبح ایک ہندو پنڈت دلکش آواز سے بھجن گاتا ہوا گزرتا، میں بیدار ہو جاتا اور سوچتا کہ یہ کیا صدا گاتا ہے۔ آخر ایک صبح میں نے اس سے پوچھا کہ تم کیا گاتے ہو؟ تو پتا چلا کہ وہ بھجن ادا کرتا ہے، لیکن وہ خود اس کے مطالب سے واقف نہیں تھا۔" ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کہتے ہیں کہ علامہ اقبال اس مثال سے اسلام کی حقانیت بیان کرنا چاہتے تھے۔ میں نے گفتگو کے دوران میں آپ سے وضاحت چاہی کہ آیا یہ وہی زمانہ ہے، جب آپ گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتے تھے؟ تو انہوں نے اقرار فرمایا کہ ہاں ہوسٹل کے زمانہ میں، میں بعض احباب کے ہاں بھی جا کر رہتا تھا اور کوچہ ہنومان میں مولانا صلاح الدین احمد کے بڑے بھائی مولوی ضیاء الدین احمد کی وجہ سے آنا جانا تھا۔[۲]

اس واقعہ کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے، جو سر شیخ عبدالقادر نے سنایا۔ ان کا کہنا ہے: جس زمانے میں میر غلام بھیک نیرنگ لاء کالج میں پڑھتے تھے۔ تو اسی مکان میں رہتے تھے۔ میر صاحب، مولوی ضیاء الدین احمد کے بڑے دوست تھے۔ اقبال

---

[۱] اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ج ۱ ص ۴

[۲] صحیفہ، اقبال نمبر ۱۹۷۳ء مقالہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔

مرحوم اور میں اکثر ان سے ملنے یہاں آیا کرتے تھے۔ ہمارے ایک دوست کدار ناتھ چوپڑا بھی ہمارے ساتھ تھے۔ مولوی ضیاء الدین احمد اور میر نیرنگ کو کسرت کا بہت شوق تھا۔ اس کے ایک کونے میں ایک اکھاڑہ بھی انہوں نے بنا رکھا تھا، جہاں کشتی لڑتے تھے۔ کبھی کبھی اقبال مرحوم کو شوق آتا، تو وہ بھی لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے میں اترتے اور میر صاحب کے ساتھ ان کا دنگل بڑا لطف دیتا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم و مغفور کے والدین کا یہ مکان، جہاں اقبال طالب علمی کے زمانہ میں جایا کرتے تھے، مارچ ۱۹۴۷ء میں فسادات کی لپیٹ میں آ کر شعلوں کی نذر ہو گیا۔

اقبال جب اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے، تو ان کے دل میں بھاٹی دروازہ میں ہونے والی شعری محفلیں گھر کر چکی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء میں انہوں نے بھاٹی دروازہ میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ یہ مکان میاں احمد بخش کی ملکیت تھا۔ فارسی مشن کالج کے پروفیسر مولوی محمد باقر ان کی ہمسائیگی میں رہا کرتے تھے، اور ان سے قدرے فاصلے پر شمس العلماء مولوی محمد حسین پروفیسر عربی مشن کالج، پروفیسر اسلامیہ کالج مولوی حاکم علی اور مفتی عبداللہ ٹونکی کی رہائش تھی۔ اس مکان میں اقبال تھوڑا عرصہ سکونت پذیر رہے۔ پھر انہوں نے یہ مکان بدل لیا اور کوچہ جلوٹیاں کو مڑنے والی نکڑ پر مکان نمبر ۷ ایم۔ بی میں منتقل ہو گئے۔ عرف عام میں یہ موتی پٹاں کا مکان کہلاتا ہے اور اس کے مالک کھنڈو ارائیں تھے، جنہوں نے اسے رائے بہادر لالہ رام سرن داس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ علامہ اس مکان کی بالائی منزل میں کرایہ دار رہے۔

لہ ادبی دنیا۔ نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء مقالہ عاشق حسین بٹالوی۔

ٹہ مولوی عبدالکریم قریشی قلعہ واری ضلع گجرات کے مشہور عالم تھے۔ جس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخل ہوئے، علامہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں ملازم تھے۔ گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج کی کلاسیں ایک ہی عمارت میں ہوتی تھیں مولوی عبداللہ ٹونکی مولوی عبدالکریم کے استاد تھے۔ جس وقت وہ حماسہ کا درس دیتے، اتفاق سے اقبال کا پیریڈ خالی ہوتا اور وہ مولوی عبدالکریم قریشی کے ساتھ مولوی عبداللہ ٹونکی کا درس سننے جایا کرتے [صحیفہ ص ۲۴۲]

اسی کے قریب مکان نمبر ۵۹۔ بی خالی ہوا، تو اقبال رائے بہادر لالہ رام سرن داس کی صوابدید پر اس میں منتقل ہو گئے۔

یہ مکان بھی رائے بہادر کی ملکیت تھا۔ انگلستان جانے تک یعنی ۱۹۰۵ء تک علامہ کا قیام اسی مکان میں رہا۔ عبداللہ چغتائی کے بقول "علامہ سے پہلے اس مکان میں مولوی حاکم علی رہا کرتے تھے۔ ان کے مکان چھوڑنے پر علامہ اس میں آئے تھے۔ مکان کا دروازہ گلی کے اندر ہے۔ اوپر کی منزل میں بازار کے رُخ تین کھڑکیاں اور تین بخارچے تھے۔ اسی مکان میں قیام کے دوران ۱۹۰۵ء کا زلزلہ آیا تھا۔ علامہ بخارچے میں بیٹھے اطمینان سے مطالعہ کرتے رہے حالانکہ زلزلے کے اثر سے دوسرا بخارچہ ٹوٹ گیا۔ اسی مکان میں علی بخش، علامہ کی ملازمت میں آیا۔ مکان کے قریب ہی علامہ کے ہم وطن شیخ گلاب دین مختار عدالت بھی رہائش پذیر تھے۔ حکیم شہاب الدین کے مکان پر بدستور لطف صحبت رہتا۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ روزانہ وہاں جاتے تھے۔ مکان کے باہر ایک چبوترا تھا، جس پر محفل جمتی، حقہ نوشی کے لئے ایک پیسے کا تمباکو منگوایا جاتا اور سب مل کر حظ اٹھاتے۔ علامہ ان دلچسپ محفلوں کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے [1]۔

جولائی ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی پر علامہ کے بھائی شیخ عطا اللہ نے جب مرزا جلال الدین بیرسٹر سے لاہور میں آکر درخواست کی کہ علامہ کے لیے کوئی دفتر کرائے پر لے کر دیا جائے، تو انہوں نے موہن لال روڈ پر گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کے پاس ایک خالی مکان، علامہ اقبال کو کرائے پر لے دیا۔ موہن لال روڈ کا موجودہ نام اردو بازار ہے۔ جس زمانے میں علامہ نے اپنا دفتر وکالت کھولا۔ یہ مکان لالہ چونی لال ونگا کی ملکیت تھا۔ ستمبر ۱۹۰۸ء تک علامہ کا قیام اسی مکان میں رہا۔ اس سے اگلے ماہ اقبال انارکلی کے مکان میں اٹھ آئے۔

انارکلی کا مکان طاہر الدین مرحوم کی کوششوں سے ملا، جو اقبال کے منشی تھے۔ علامہ سے قبل اس مکان میں سر فضل حسین اور میاں شفیع کی رہائش تھی۔ اس مکان کی جگہ ایک

---

[1] صحیفہ اقبال نمبر ۱۹۷۳ء

نیو مارکیٹ بن چکی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا کہنا ہے: اس مکان کی بالائی منزل میں علامہ بازار والے حصے کی طرف رہتے تھے۔ عقب میں کھڑکیاں تھیں۔ پچھواڑے میں ایک اور مکان تھا، جس میں منشی طاہر الدین رہا کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے ایک گگ رکھی ہوئی تھی۔ ترکی ٹوپی پہنتے۔ خود گاڑی ہانک کر کورٹ لے جاتے۔ ۱۹۱۹ء میں جب امرتسر میں کانگرس کا جلسہ ہوا، تو علامہ اقبال اسی مکان سے امرتسر گئے تھے۔ لاہور میں اسی ہفتے کے آخر میں مولانا محمد علی اور شوکت علی کا جلوس نکلا تو انہوں نے انارکلی والے مکان میں آکر نماز عصر ادا کی تھی اور کچھ سیاسی گفتگو بھی ہوئی تھی۔ "خضر راہ" بھی اسی مکان میں لکھی گئی تھی، جو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے منعقدہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں پڑھی گئی۔ اقبال نظم پڑھنے کے لیے شلوار کوٹ، سر پر لنگی اور ہاتھ میں چھڑی لے کر آتے تھے۔ 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی' بھی یہیں لکھی گئی۔ پیام مشرق کی پہلی اشاعت بھی یہیں ہوئی۔[1] ۱۹۲۲ء کے اواخر میں علامہ اقبال میکلوڈ روڈ کی کوٹھی نمبر ۴ میں آگئے۔

یہ کوٹھی جج سید محمد لطیف مصنف تاریخ لاہور، کی اہلیہ کی ملکیت تھی۔ اور اب محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہے۔ اس کے ایک حصے میں حکومت کی طرف سے لائبریری قائم ہے اس کوٹھی کے قریب ہی اقبال کے زمانہ میں مرزا جلال الدین رہتے تھے۔ علامہ اقبال کو یہ کوٹھی اس زمانے میں ایک سو ستر روپے ماہوار کرایہ پر ملی۔ جیسا کہ علامہ خود لکھتے ہیں: میں نے مکان بھی تبدیل کرلیا ہے۔ مرزا جلال الدین صاحب کے قریب، ایک کوٹھی ایک سو ستر روپے ماہوار کرایہ پر لے لی ہے۔ تشریف لائیں گے، تو آپ کو زیادہ آسائش ہوگی۔ آپ ضرور تشریف لائیے ... مصطفیٰ کمال پاشا کی فتوحات کا مادہ تاریخ یہ ہے۔

شاخ ابراہیم رانم مصطفیٰ
سال فتحش اسم اعظم مصطفیٰ
۱۳۴۲ھ[2]

---

[1] صحیفہ اقبال نمبر ۳، ۱۹۷۳ء۔ مقالہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

[2] مکاتیب اقبال بنام گرامی، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ص ۲۳۰

علامہ اقبال دسمبر ۱۹۲۲ء کے شروع میں میکلوڈ روڈ والی اس کوٹھی میں منتقل ہوئے اور تقریباً ایک ماہ بعد یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو آپ کو سر کا خطاب ملا۔ علامہ کے بھائی شیخ عطا محمد ان دنوں میں ایک بار لاہور آئے۔ سیدھے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں پہنچے اور اس کی تزئین و آرائش علامہ کے (Status) کے مطابق کرائی۔ اقبال کی زندگی کے کئی اہم واقعات اس کوٹھی سے تعلق رکھتے ہیں۔ علامہ تقریباً تیرہ برس اس کوٹھی میں کرایہ دار رہے اور مئی ۱۹۳۵ء میں اپنی ذاتی کوٹھی واقعہ میو روڈ (اقبال روڈ) میں منتقل ہو گئے۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے علامہ کی کئی تاریخی یادیں وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر :

* ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے انتخابات کے ہنگامے ہوئے۔
* شاتم رسول راجپال ناشر رنگیلا رسول کے خلاف جلسے ہوئے۔
  غازی علم الدین نے راجپال کا کام تمام کیا۔
* مسجد شہید گنج کی تحریک شروع ہوئی۔
* راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد ہوئی۔
* مدراس لیکچرز کے معرکے ہوئے۔

تو علامہ اسی کوٹھی میں رہتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی گرفتاری ان ہی کی کوٹھی کے باہر ہوئی۔ پیام مشرق کا دوسرا اور بانگ درا کا پہلا ایڈیشن بھی اسی دور میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں دیوبند کے علمائے کرام مولوی احمد علی مرحوم، سید انور شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ اور ان رفقائے دیوبند کے علاوہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دیگر حضرات کے اعزاز میں علامہ نے اسی کوٹھی میں دعوت کا انتظام کیا اور ان معزز علماء کے درمیان پہلی بار سود کے مسئلے پر کھل کر بحث ہوئی۔ علامہ اسی کوٹھی میں رہائش پذیر تھے، جب انہوں نے سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کے ساتھ افغانستان کا سفر کیا۔

علامہ اقبال کی آخری قیام گاہ میو روڈ کی کوٹھی جاوید منزل تھی، جہاں وہ دم واپسیں

تک سکونت پذیر رہے۔ اس کوٹھی کی زمین اقبال نے جاوید کے نام پر خریدی اور خود کوٹھی تعمیر کرائی۔ میو روڈ کا موجودہ نام اقبال روڈ ہے اور اس کوٹھی میں علامہ کے چھوٹے صاحبزادے جاوید اقبال رہتے ہیں۔

پیشہ وکالت

یورپ سے واپس آکر علامہ نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ دنوں تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر بھی رہے۔ علامہ کے احباب کا منشا تو یہ تھا کہ آپ ضلع کچہری میں وکالت کریں، اسی لئے انہوں نے آپ کو موہن لال روڈ (اردو بازار) کے قریب مکان کرایہ پر لے کر دیا تھا، لیکن مرزا جلال الدین کے ایک بیان کے مطابق علامہ فقط دو ماہ اس مکان میں مقیم رہے۔ گویا انہوں نے عدالت ہائے ضلع میں صرف چند دن پریکٹس کی۔ اس کے بعد چیف کورٹ میں بیرسٹری کا فیصلہ کیا۔ تب آپ کو انارکلی بازار کے مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ علامہ اپنی وکالت اور پروفیسری کے بارے میں مہاراجہ سرکشن بہادر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"انگلستان سے واپس آنے پر گورنمنٹ کالج میں مجھے فلسفہ کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ کام میں نے ۱۸ ماہ تک کیا اور یہاں کی اعلیٰ ترین جماعتوں کو اس فن کی تعلیم دی۔ گورنمنٹ نے بعد ازاں یہ جگہ مجھے آفر بھی کی، مگر میں نے انکار کر دیا۔ میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں صبح کچہری میں نہ جا سکتا تھا۔ ججان ہائیکورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے نام مقدمات دن کے پچھلے حصے میں پیش ہوا کریں۔ چنانچہ ۱۸ ماہ تک اسی پر عملدرآمد ہوتا رہا۔"[1]

---

[1] مکاتیب شاد اقبال ص ۵۴

علامہ اقبال نے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو چیف کورٹ میں درخواست دی تھی کہ میرا نام وکلاء کی فہرست میں شامل کر لیا جائے اور مجھے ایڈووکیٹ چیف کورٹ قرار دیا جائے۔ یہ درخواست منظور کر لی گئی۔ اِن ہی دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ فلسفہ کے پروفیسر مسٹر جیمز کا اچانک انتقال ہو گیا۔ مسٹر رابنسن پرنسپل تھے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ مسٹر جیمز کی خالی جگہ کے لیے کسی اہل پروفیسر کا انتخاب ہو سکے مگر اقبال کے سوا سارے ہندوستان میں کوئی ایسا شخص نہ تھا، جو اس ذمہ داری کا اہل قرار پاتا۔ چنانچہ انہوں نے علامہ سے درخواست کی کہ وہ عارضی طور پر فلسفہ کی پروفیسری قبول کر لیں اور بیرسٹری کا کام بھی چلاتے رہیں۔

لیکن انجام کار جب علامہ اقبال کو گورنمنٹ کالج کی ملازمت چھوڑنی پڑی تو ان کے اس اقدام کو بہت سے حلقوں نے پسند نہ کیا، کیونکہ ان حلقوں کے نزدیک پروفیسری ایک معزز پیشہ تھا۔ اس زمانے میں جب کہ انڈین ایجوکیشنل سروس میں خال خال ہی کوئی یہاں کا باشندہ نظر آتا تھا اور اس پر انگریزوں کی اجارہ داری تھی، اقبال ایسے مفکر کا اس عہدے پر تعینات ہونا اور وہ بھی سرکار کی صوابدید اور خود اقبال کی اہلیت وقابلیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اسی لئے حکومت نے انہیں پیش کش کر رکھی تھی کہ وہ کالج ٹائم کے بعد اپنی وکالت کے سلسلے میں بحیثیت بیرسٹر عدالتوں میں پیش ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے اس خاص سہولت سے فائدہ نہ اٹھایا اور دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کی بجائے صرف ایک کشتی میں سوار ہونے کو ترجیح دی۔ انہوں نے تعلیمی میدان کو چھوڑ دیا اور اپنے لئے پیشہ وکالت کو اپنایا۔ جسٹس شاہ دین مرحوم اس زمانے میں ہائیکورٹ کے جج تھے۔ انہوں نے اقبال کے اس فیصلے پر ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ جیسے آدمی کا عدالت میں کوئی کام نہیں۔ آپ کو علمی زندگی کو بطور پیشہ اختیار کرنا چاہیئے۔

اقبال نے اپنی انانیت کے پیش نظر ایسی آراء کو کوئی وقعت نہ دی۔ اور وکالت کا آزادانہ پیشہ اختیار کرنے ہی کو فوقیت دی۔ اس سے قبل جب اقبال بیرسٹر بھی تھے اور پروفیسر بھی، توان دنوں میں خلیفہ عبدالحکیم نے ان سے استفسار کیا۔ آپ نے یہ دو متضاد شغل کیوں اختیار کر رکھے ہیں۔ علامہ نے فرمایا: اس تضاد سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ وکالت دنیا داری

کا نچوڑ ہے - تمام جہاں کی کثافتوں اور خباثتوں میں انسان اس پیشے میں آشنا ہو جاتا ہے اور طبیعت میں اس کے خلاف ایک ایسا ردعمل پیدا ہوتا ہے کہ بڑے زور سے انسان کی روح لطیف چیزوں کے حصول کے لیے بال و پر پھیلاتی ہے[1] اقبال یورپ کے ایسے کئی لوگوں کو جانتے تھے - جو بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب بیرسٹر بھی تھے، لیکن اس کے بعد علامہ کو بامر مجبوری پروفیسری کو خیرباد کہنا پڑا اور اس کی ایک معقول وجہ جواز تھی۔ فرماتے ہیں : میں نے کچھ دنوں پروفیسری کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں، البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں - چنانچہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح کی گفتگو کی، جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے - اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ جی میں ٹھان لی ہے کہ جہاں تک ہو سکے گا۔ ملازمت سے گریز کروں گا[2]

اس حقیقت کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کالج کی ملازمت کی طرح وکالت کا پیشہ بھی اقبال کو راس نہ آسکا - اس کی جہاں متعدد وجوہ تھیں، وہاں سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ مقدمات ملنے کے باوجود اقبال کم سے کم فیس لیتے تھے۔ یہ ان کی ذاتی شرافت اور محض اخلاق تھا اور پھر ان کے پیش نظر ہندوستان کے باشندوں کی حالت عمومی تھی - ان لوگوں کا طرز زندگی اوسط آمدنی کا گزشتوار، تھا - یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی جب وہ لائق فائق بیرسٹر تھے، ان کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھی، مگر اس دور کی خوشگوار اور دلچسپ یادیں، آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں - سالک صاحب کا بیان ہے : علامہ نے ایک گگ (چھوٹی بگھی) رکھی تھی - اس میں کورٹ جایا کرتے تھے - گھوڑے کی دیکھ بھال کے لیے ایک پوربیا سائیس ملازم تھا - اس زمانے میں مرزا جلال الدین صاحب کے علاوہ علامہ کے تعلقات نواب ذوالفقار علی خاں، سر جگندر سنگھ، سردار امراؤ سنگھ سے بہت گہرے تھے - مرزا صاحب

---

[1] آثار اقبال ص ۴۲

[2] انسان کامل مولانا عبدالسلام ندوی ص ۱۴

فرماتے ہیں کہ علامہ کورٹ سے فارغ ہو کر اپنی گگ واپس بھیج دیتے اور میری کار میں بیٹھ کر میرے دفتر میں آجاتے۔ شام وہیں گزارتے اور رات کے گیارہ بجے گھر واپس جاتے۔ بعض اوقات رات بھر میرے پاس ہی رہتے اور صبح نماز، تلاوت قرآن اور ناشتے کے بعد گھر جاتے۔ مولانا عبداللہ ٹونکی کا ایک رشتہ دار ظہور میرا بیرا تھا، جسے ستار بجانے میں کمال حاصل تھا۔ علامہ اس سے اکثر ستار سنتے، بلکہ کچھ مدت تک اس سے ستار بجانا سیکھتے رہے۔ جب نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ تعلقات بڑھے، تو ایک خاصی مدت تک میں اور علامہ روزانہ شام کی چائے نواب صاحب ہی کے ہاں پیتے، بلکہ جس دن کورٹ میں تعطیل ہوتی، ہم دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتے[1]

جن دنوں ڈاکٹر علامہ اقبال لاہور میں وکالت کر رہے تھے، انہیں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے پرنسپل کے عہدہ کی پیش کش ہوئی۔ لیکن انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ معذرت کر دی کہ تنخواہ کے لحاظ سے بھی مجھے کوئی فائدہ نہیں اور اگر بالفرض تھوڑی سی تنخواہ زیادہ بھی مل جائے تو مجھے جلا وطن ہونا منظور نہیں۔ اسی دوران علامہ اقبال کو جج بنانے کا معاملہ حکومت کے زیر غور آیا۔ جیسا کہ مہاراجہ سرکشن بہادر کے نام علامہ کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر حیدری نے ان کو قانون کی پروفیسری کی پیش کش کی تھی اور استفسار کیا تھا کہ وہ کس تنخواہ پر کام کرنا قبول کریں گے، جب کہ انہیں پرائیویٹ پریکٹس کی بھی اجازت ہو گی۔ علامہ ۴ اگست ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے یہ معلوم نہیں کہ میر مجلس عدالت العالیہ کی جگہ خالی ہے، نہ اس کے متعلق انہوں نے (مسٹر حیدری نے) اپنے خط میں کوئی اشارہ کیا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو جائے تو میں قانون کی پروفیسری اور پرائیویٹ پریکٹس پر ترجیح دوں گا۔ آپ حیدری صاحب سے ملیں تو بر سبیل تذکرہ ان کی توجہ اس طرف دلائیں"۔ اگر سرکار اسے مناسب تصور فرمائیں تو اب یہ وقت کہ انہوں نے خود ملازمت

---

[1] ذکر اقبال ص ۲۶

کے لیے مجھے لکھا ہے، اس قسم کے تذکرہ کے لیے نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے۔"[1]

اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ نے ایک روز خط میں لکھا کہ حیدر آباد ہائی کورٹ کی ججی کے لیے چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں جن میں ایک نام خاکسار کا بھی ہے۔ اس خیال سے کہ میرا نام اور ناموں کے ساتھ پیش ہوا ہے۔ یہ ایک قسم کا مقابلہ ہے[2] لیکن اس کے بعد حالات کا دھارا بدل گیا۔ اقبال کی قومی مصروفیات بڑھتی چلی گئیں اور ان کی شہرت بام عروج کو چھونے لگی اس لیے علامہ نے حیدر آباد ہائی کورٹ کے جج بننے کی بہ نسبت فرزندان توحید کا رہبر کہلانے کو ترجیح دی۔

دوسری شادی

علامہ اقبال انگلستان سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواہاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے چند ناقابل ذکر گھریلو وجوہ کی بنا پر دوسری شادی کرنے کا اظہار کیا، تو ان کے والد بزرگوار اور بڑے بھائی نے اس پر خفگی ظاہر کی اور ان پر زور دیا کہ وہ پہلی بیوی کو لاہور لے آئیں اور دوسری شادی کا خیال دل سے نکال دیں، لیکن بقول صوفی "چونکہ وہ اب خود مختار تھے اور اپنا برا بھلا اچھی طرح سمجھ سکتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے بزرگوں پر دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا کہ دوسری شادی ناگزیر ہے[3] احباب میں ذکر ہوا، تو شیخ گلاب دین وکیل نے موچی دروازہ کے ایک کشمیری خاندان کے متعلق تحریک کی۔ جب بات پکی ہو گئی تو علامہ کے برادر بزرگوار شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آئے اور مرزا جلال الدین میاں شاہ نواز بیرسٹر، مولوی احمد دین وکیل اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لے کر علامہ کے سسرال

---

[1] مکاتیب شاد اقبال ص ۶۱

[2] ایضاً ص ۶۲

[3] اقبال درون خانہ ص ۱۲

پہنچے اور وہاں علامہ کا نکاح پڑھایا[1] لیکن چند وجوہ کی بنا پر رخصتی کا معاملہ دو سال معرض التوا میں رہا۔

اسی اثنا میں علامہ کے ایک دوست سید بشیر حیدر، جو اس وقت لدھیانہ کے ایکسائز انسپکٹر تھے۔ لدھیانہ ہی کے ایک دولت مند خاندان "نولکھا" سے ایک رشتہ کا پیغام لے کر آئے یہ رشتہ ڈاکٹر سبحان علی کی سالی کی لڑکی کا تھا۔ رشتہ طے ہوگیا۔ بارات لاہور سے لدھیانہ گئی اور علامہ کی تیسری شادی ہوگئی۔ علامہ چند روز لدھیانہ ہی میں رہے، پھر انار کلی لاہور کے مکان میں آگئے۔ جہاں ان کی پہلی بیوی اور تیسری اکٹھی رہنے لگیں۔ اسی دوران علامہ کی دوسری منکوحہ کی بھی رخصتی ہوگئی۔ لیکن علامہ کی تیسری بیوی کا انتقال، دوسری بیوی سے پہلے ہی ۱۹۲۴ء میں ہوگیا تھا[2] اس کی اطلاع اقبال نے مہاراجہ سرکشن بہادر کو ایک خط میں ان الفاظ میں دی :

"اس عرصہ میں بہت سے آلام و مصائب کا شکار رہا۔ بیوی کا انتقال ہوگیا، جس سے اب تک قلب پریشان ہے[3]"

اس بیوی سے اقبال کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی، البتہ دوسری بیوی کے بطن سے ایک لڑکا جاوید اور ایک لڑکی منیرہ پیدا ہوئے۔ والدہ جاوید، علامہ ہی کی زندگی میں جگر و طحال کے عارضہ میں مبتلا ہوگئیں۔ اپریل ۱۹۳۵ء کے آخری ہفتے میں ان کا اپریشن ہوا۔ جان تو بچ گئی، لیکن حالت روز بروز خراب رہنے لگی۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو علامہ نے سر راس مسعود کو خط میں پھر لکھا کہ میری بیوی خطرناک طور پر بیمار ہے۔ شاید یہ اس کے آخری لمحات ہیں، پھر اسی خط کے آخر میں لکھا کہ ساڑھے پانچ بجے میری بیوی کا انتقال ہوگیا[4] اس وقت جاوید کی عمر ۱۱ سال اور منیرہ کی عمر ۵ سال تھی۔

---

[1] ذکر اقبال ص ۶۷ - ۶۸ سالک مرحوم نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ یہ لڑکی وکٹوریہ گرلز سکول میں پڑھتی تھی۔ مگر یہ بات صحیح نہیں اقبال کے خاندان والے ہی اس کی تردید کرتے ہیں۔

[2] اقبال کامل ص ۴۶

[3] شاد اقبال ص ۱۲۲

[4] اقبال نامہ ص ۳۶۰

جاوید اقبال

علامہ اقبال کی سیرت و شخصیت کی بہت سی خوبیاں ان کے صاحبزادے جاوید اقبال پر منکشف ہوئیں۔ جاوید اقبال ۵؍اکتوبر ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے بارے میں جاوید اقبال خود کہتے ہیں: میں نے سن رکھا ہے کہ میری پیدائش سے چند سال قبل اباجان شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی'' کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک بیٹا عطا کرے۔ آپ نے حضرت مجدد سے یہ عہد بھی کیا کہ اگر خداوند تعالیٰ نے انہیں بیٹا دیا تو اسے لے کر مزار پر حاضر ہوں گے۔ آپ کی دعا پوری ہوئی اور کچھ عرصہ بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ہمراہ لے کر دوبارہ سرہند شریف پہنچے۔ اس سفر کے دھندلے سے تصورات میری نگاہوں کے سامنے ابھرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہو رہا ہوں۔ گنبد کے تیرہ و تار مگر پر وقار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر رکھی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میں اپنے چاروں طرف گھور رہا ہوں جیسے میں اس مقام کی خاموشی و ویرانی سے کچھ کچھ شناسا ہوں۔ اباجان نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا، پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے۔ اس وقت ہم دو ہی تربت کے قریب بیٹھے تھے۔ گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں ان کی آواز کی گونج ایک ہولناک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخسارو پر ڈھلک آئے ہیں[1]۔ بچپن میں جاوید اقبال کو ایسی بہت سی شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، جو ان کے والد سے ملنے کے لیے آتی تھیں۔ ان شخصیات میں مولانا محمد علی جوہر کا سراپا تو انہیں آج بھی یاد ہے۔ متناسب جسم، میانہ قد، باریش بزرگ، نہایت خوش پوش، خوش باش اور خوش خور تھے۔ بمبئی سے آئے تھے اور جاوید کے لیے چاکلیٹ کا ڈبہ تحفتاً لائے تھے۔

بچپن میں جاوید اقبال کو مصوری اور موسیقی سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ علامہ اقبال کی

---

[1] نشریہ ریڈیو پاکستان، یوم اقبال ۲۱ اپریل ۱۹۶۶ء

تمنا تھی کہ وہ ریاض کیا کریں اور تقریر کا فن سیکھیں۔ ریاض کے لیے انہوں نے جاوید کی خاطر گھر میں ایک اکھاڑہ بھی بنوا رکھا تھا۔ اقبال کے ایک حجازی عرب دوست، جاوید کو روزانہ قرآن مجید پڑھانے آیا کرتے تھے۔ انگریزی لباس سے چونکہ علامہ کو شدید نفرت تھی، اس لیے انہوں نے جاوید کو ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کی۔ منیرہ بھی اگر اپنے بالوں کو دو حصوں میں گوندھتی تو ناپسند کرتے اور کہتے "اپنے بال اس طرح مت گوندھا کرو، یہ یہودیوں کا انداز ہے"[1] اپنی زندگی میں علامہ نے جاوید اقبال کو صرف ایک انگریزی فلم دیکھنے کی اجازت دی تھی اور وہ فلم نپولین کے بارے میں تھی۔ اقبال کو جری سپہ سالاروں سے والہانہ عقیدت تھی اور وہ اپنے لخت جگر کو خالد بن ولید، طارق بن زیاد، ایسے سپہ سالاروں کی بہادری کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ جاوید اقبال کو بچپن میں کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ باغ و بہار حاتم طائی، طلسم ہوشربا، الف لیلہ اور عبدالحلیم شرر کے سب ناول انہوں نے میٹرک سے پہلے پڑھ لیے تھے۔

جس وقت علامہ اقبال کا انتقال ہوا، جاوید کی عمر چودہ برس کے لگ بھگ تھی۔ ابتدائی پانچ برسوں میں تو بچہ ذہین نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے شعوری طور پر جاوید اقبال کو اپنے والد سے استفادہ کرنے کا موقع صرف نو برس میسر آیا اور وہ بھی بچپن کے نو سال۔ وفات سے پیشتر علامہ اقبال نے چودھری محمد حسین، حکیم طاہرالدین، اور اپنے برادر زادے شیخ اعجاز احمد کو جاوید اور منیرہ کا سربراہ بنایا تھا۔ ان تینوں نے جاوید کو باپ کی شفقت کا احساس تک نہ ہونے دیا اور ہر وقت ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔

۱۹۴۲ء میں جب جاوید بی اے کے طالب علم تھے، وہ روحانی طور پر چودھری محمد حسین کے زیر اثر ہوئے اور ان کی وساطت سے وہ اقبال کی تعلیمات کو سمجھنے لگے۔ یوں چودھری محمد حسین ان کے لیے خزینہ اقبال کی کلید ثابت ہوئے۔ ستمبر ۱۹۴۹ء میں جاوید تحصیل علم کے لیے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں ۵ سال تک پروفیسر آربری اور پروفیسر روبن لیوی کے زیر نگرانی تحقیق و تفحص میں مصروف رہے۔ اس بارے میں وہ کہتے ہیں "تحقیق کے لئے موضوع کا تعین کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ مشہور برطانوی مستشرق پروفیسر آربری، جن کی زیر نگرانی میں

---

[1] ے لالہ فام۔ جاوید اقبال ص ۲۲

جنھیں تحقیق کا کام کرنا تھا، اسلامی تصوف کے ماہر تھے۔ سیاسی طور پر آپ برطانیہ کی قدامت پسند جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ میں امام غزالی کے تصوف کے نفسیاتی پہلو پر اپنا تحقیقی مقالہ تیار کروں، لیکن اس موضوع پر تجزیہ کرنے کے لیے عربی زبان میں مہارت کے علاوہ یونانی اور لاطینی زبانوں سے شناسائی بھی ضروری تھی۔ چنانچہ میں نے تحقیق کے لیے برصغیر ہند میں مسلم سیاسی فلسفے کا ارتقاء" کا موضوع منتخب کیا[۱] جن پروفیسروں کی زیر نگرانی جاوید اقبال کو کام کرنے کا موقع ملا، ان میں پروفیسر روبن لیوی۔ پروفیسر آربری سے قطعی مختلف اور متضاد نظریہ رکھتے تھے۔ روبن لیوی عقیدتاً یہودی تھے اور سیاسی طور پر ان کا زاویہ نگاہ سوشلسٹ بلکہ مارکسسٹ تھا۔ جاوید اقبال کو انگلستان میں قیام کے دوران برطانوی مستشرقین میں سے پروفیسر گب، منٹگمری واٹ، وغیرہ سے بھی ملنے اور تبادلہ خیالات کرنے کا موقع ملا، لیکن وہ ان میں سے کسی سے بھی متاثر نہ ہو سکے۔ انگلستان ہی میں آپ کو اپنے سرپرست چودھری محمد حسین کی رحلت کی خبر ملی۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال " یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا، جب میں نے اپنے آپ کو فکری اور روحانی اعتبار سے قطعی طور پر تنہا محسوس کیا۔ یہ احساس کئی دنوں تک میرے دل و دماغ پر چھایا رہا"[۲]

کیمبرج سے فارغ ہونے کے بعد جاوید اقبال لندن چلے گئے اور وہاں دو سال رہے۔ اس دوران انہوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں وہ وطن واپس آئے اور وکالت شروع کر دی۔ جن لوگوں سے آپ زندگی میں زیادہ متاثر ہوئے۔ ان میں چودھری محمد حسین کے علاوہ قائداعظم، سردار عبدالرب نشتر، محترمہ فاطمہ جناح، جسٹس کیانی اور مرحوم حمید نظامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سکندر مرزا کے دور میں آپ کو معاہدہ بغداد کے سیکرٹریٹ سے منسلک ہونے کی بھی پیشکش ہوئی، مگر آپ نے اقبال کے وطن ہی میں رہنا پسند کیا اور اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کو مضامین وغیرہ لکھنے کا شوق بچپن ہی سے رہا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں

۱۔ مے لالہ فام، جاوید اقبال ص ط

۲۔ ایضاً ص غ

انہوں نے پہلی مرتبہ یوم اقبال کے جلسہ میں خواجہ غلام الدین کے ہمراہ شرکت کی۔ یہ جلسہ مینارڈ ہال میں منعقد ہوا تھا، علامہ اقبال کی وفات کے بعد لکھنے کا شوق جاری رہا۔ اس شوق کا دائرہ ادبی تحریروں تک محدود تھا۔ ان دنوں ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی اور جاوید اقبال کی تحریریں اکثر جرائد میں چھپتی تھیں۔ ۱۹۴۰ء میں جب تحریک پاکستان کی عملی جدوجہد کا آغاز ہوا، اور ۱۹۴۷ء تک سیاسی کشمکش جاری رہی تو جاوید اقبال ایسے نوجوان اس سے الگ نہ رہ سکے اور مسلم طلبہ کے ساتھ مل کر تحریک پاکستان میں بساط کے مطابق حصہ لیا۔ سیاسی کشمکش کے آخری ایام میں خضر وزارت نے پنجاب میں ڈان اخبار کے داخلے پر پابندی عائد کر دی، تو چند طلبہ نے مل کر ایک ہفت روزہ اخبار نکالا۔ اس کا نام "نوائے اسلام" رکھا گیا۔ جاوید اقبال اس اخبار کے ادارتی رکن تھے اور یہ اخبار ابتدا میں ان ہی کے گھر میں ترتیب دیا جاتا رہا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ کی شخصیت اور فن پر بے شمار تقریریں کی ہیں اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ ۱۹ مقالات پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ "مے لالہ فام" کے عنوان سے ۱۹۶۶ء میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ علامہ کی شخصیت پر سب سے پہلا مضمون ڈاکٹر جاوید اقبال نے "اقبال ایک باپ کی حیثیت سے" ۱۹۴۶ء میں لکھا، جو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کیا گیا۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۴۸ء میں یوم اقبال منعقدہ اسلامیہ کالج ہال کے لیے پہلی بار "اقبال کا تصور جہاد" کے موضوع پر مقالہ لکھا۔ مضامین لکھنے اور تقریروں کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جاوید اقبال آج کل لاہور ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ اپنے اسم گرامی کے متعلق جاوید اقبال رقمطراز ہیں: جہاں تک میری ذات یا میرے نام کا تعلق ہے، میری دانست میں انہوں نے اپنے کلام میں اسی مقصد کے لیے ایک اشارہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے کلام میں جہاں کہیں بھی مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں، اس سے مراد درحقیقت نوجوانان ملت ہیں۔ مثلاً جاوید نامہ میں خطاب بہ جاوید دراصل "سخنے بہ نژاد نو" ہے۔ اس لحاظ سے ملت کا ہر نوجوان علامہ کے لئے جاوید ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیف پہلو 'جاوید' لفظ کی اہمیت ہے۔ جاوید کے معنی ہیں "ہمیشہ رہنے والا" ابدی" گویا شباب لافانی ہے، کیونکہ مسلمانوں کی نئی نسل ہمیشہ پیدا ہوتی

رہے گی اور نژادِ نو کا یہ تسلسل لامتناہی طور پر جاری و ساری رہے گا چونکہ علامہ کا تخاطب نژادِ نو سے ہے اور مستقبل میں آنے والی مسلمانوں کی ہر نسل کے لیے تر و تازہ ہے، اس لیے ان کا کلام لازوال اور زندہ جاوید ہے۔[1]

اقبال باکمال

۱۹۰۹ء میں علامہ اقبال انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے جنرل سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ اس زمانے میں منشی محمد دین فوق کا رسالہ "کشمیری میگزین" کشمیریوں کا ترجمان تھا اور اس میں انجمن کشمیری مسلمانان کے جلسوں کی رودادیں اور دوسری تحریریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ علامہ اقبال کی طرف سے اس رسالہ میں دو اہم گشتی مراسلے شائع ہوئے ایک مراسلے میں مذکور تھا۔ "کشمیریوں کے مربی اور محسن نواب آنریبل سر خواجہ محمد سلیم اللہ خاں کے سی ایس آئی نے ۵ فروری ۱۹۰۹ء کو وائسریگل کونسل میں کشمیری قوم کی فوجی ملازمت اور زمینداری کے متعلق سوالات پیش کئے تھے فوج کے متعلق لارڈ کچنر سپہ سالار افواج ہند نے یہ جواب دیا کہ کشمیری مسلمانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگرچہ کشمیریوں کی کوئی کمپنی یا سکواڈرن علیحدہ موجود نہیں کشمیر کو زراعت پیشہ قوم قرار دینے کے متعلق یہ جواب دیا گیا کہ صوبے کی حکومت جس قوم کو مناسب سمجھتی ہے، زمینداری اقوام بندی میں شامل کر لیتی ہے۔ یہ دونوں سوال جواب وائسرائے نے پنجاب کی حکومت کو بھیج دیئے ہیں اور حکومت پنجاب اپنے کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے ذریعے سے اعداد و شمار فراہم کر رہی ہے کہ ہر ضلع میں کتنے کشمیریوں کی بسر اوقات کا ذریعہ زراعت ہے۔ قومی کارکنوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ ان اعداد و شمار کی فراہمی میں حکومت سے تعاون کریں، تاکہ حصول مقصد میں آسانی ہو۔[2]

یہ گشتی مراسلہ مشتے نمونہ از خروارے اس بات کا ثبوت ہے کہ علامہ نے کشمیریوں کو

---

[1] سے لالہ فام ص رخ

[2] کشمیری میگزین ص ۵۔ مئی ۱۹۰۹ء

حقوق دلانے میں موثر کردار ادا کیا۔ وہ کشمیریوں کے حوصلے بھی اپنے اشعار سے بڑھاتے رہے۔ فروری ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے اجلاس میں اقبال نے جو نظم پڑھی، وہ بھی پہلے مارچ ۱۹۰۹ء کے شمارہ میں اور پھر بعد میں بھی دو تین مرتبہ شائع ہوئی۔ اگلے مہینے کے شمارے میں "حالات اقبال" کے عنوان سے علامہ کی زندگی پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا اور پھر اکتوبر ۱۹۰۹ء میں 'رباعیات اقبال' کے زیر عنوان علامہ کی آٹھ رباعیات شائع ہوئیں۔ ان میں سے دو رباعیاں کشمیری میگزین کے حوالے سے 'ذکر اقبال' میں یوں درج ہیں ؎

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثل حروف کشمیر

؎

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے، ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا، چمن سے دور

۱۹۱۰ء میں علامہ اقبال کی چند چھوٹی چھوٹی نظمیں پیسہ اخبار اور مخزن میں شائع ہوئیں۔ انجمن حمایت اسلام کے ارکان کے اختلاف اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ علامہ نے اس سال انجمن کے اجلاس میں اپنی نظم پڑھنا مناسب نہ سمجھی۔ انجمن کے اختلافات، تنازعات اور مقدمات کی تفصیل اور علامہ کی ثالثی کے کردار کا پتا ان اطلاعات سے چلتا ہے۔

"لاہور ۲۲ اپریل۔ شام کو نواب فتح علی خاں قزلباش کے دولت کدے پر آنریبل محمد شفیع، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مولوی محبوب عالم، میاں فضل حسین، چودھری بنی بخش، مولوی فضل الدین،

میاں نظام دین اور مولوی کریم بخش اکٹھے ہوئے اور بحث و مباحثہ کے بعد ان حضرات نے فیصلہ کیا کہ سات اصحاب پر مشتمل ایک ثالثی بورڈ قائم کردیا جائے، جس میں ایک طرف سے شیخ اصغر علی، مولوی رحیم بخش، اور میاں فضل حسین اور دوسری طرف سے میاں محمد شفیع، نواب ذوالفقار علی خاں، ڈاکٹر محمد اقبال شامل ہوں۔ اور اس بورڈ کے صدر نواب فتح علی خاں قزلباش ہوں[1]

علامہ اقبال نے اپنی بھرپور کوششوں اور ذاتی اثر و رسوخ سے کام لے انجمن کے اختلافات کو دور کردیا، تنازعات حل کردیئے اور ایک دوسرے کے خلاف دائر کردہ مقدمات واپس لیے گئے۔ اس سلسلے میں ثالثی بورڈ کے اراکین نے علامہ اقبال پر بہت زیادہ انحصار کیا اور ۱۹ جولائی ۱۹۱۰ء کو انجمن کے جھگڑے ختم ہو گئے۔ اس روز اخبار میں یہ خبر اس سرخی سے شائع ہوئی "فیصلہ ثالثی کا اعلان ہو گیا۔ اللہ اس فیصلے کو انجمن کے انتظامات کے لئے مبارک کرے[2]

شکوہ ـ انجمن میں

آئندہ سال اقبال نے اپریل ۱۹۱۱ء میں منعقد ہونے والے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں جو ریوانہ ہوسٹل کے صحن میں ہوا، اپنی مشہور نظم "شکوہ" پڑھی۔ اس موقعہ پر ان کے والد بزرگوار بھی تشریف فرما تھے۔ اس نظم کو سن کر کافی دیر تک ان کی آنکھیں اشکبار رہیں۔ چند ماہ بعد موچی دروازہ کے باہر ایک بہت بڑے جلسہ عام میں علامہ نے 'جواب شکوہ' تحت اللفظ پڑھ کر سنائی اور ہر طرف سے "اقبال، اقبال" کی صدا گونجنے لگی۔ ۱۹۱۱ء ہی کا ذکر ہے، سردار جگندر سنگھ نے علامہ اقبال سے کہا کہ شہزادی بمبا دلیپ سنگھ (مہاراجہ

---

[1] پیسہ اخبار لاہور ۳۰ر اپریل ۱۹۱۰ء صفحہ اول

[2] ایضاً شمارہ ۶ اگست ۱۹۱۰ء

رنجیت سنگھ کی پوتی) آپ سے ملاقات کی بے حد خواہش مند ہے۔ یہ شہزادی جیل روڈ کی ایک کوٹھی میں رہتی تھی اور اس کا ڈرائیور، پیرجی، گھر کے تمام انتظامات کا نگران تھا۔ ایک دن سردار جگندر سنگھ، مرزا جلال الدین اور علامہ اقبال کو بمبا کی کوٹھی پر لے گئے، جہاں درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا، جس میں چائے کا انتظام ہوا۔ بمبا کی فرمائش پر علامہ نے ایک نظم سنائی۔ بمبا اردو تو سمجھ لیتی تھی، لیکن شعر سمجھنے سے قاصر تھی سردار جگندر سنگھ، ترجمہ و تشریح کر کے سمجھاتے رہے۔

بمبا کو معلوم ہوگیا تھا کہ علامہ اقبال حقہ بہت پیتے ہیں۔ چنانچہ اس نے دعوت دینے سے پہلے اپنے ڈرائیور "پیرجی" سے کہہ کر اعلیٰ درجہ کا حقہ بنوایا۔ پیرجی نے اسے نہایت اہتمام سے تازہ کر کے اور چلم بھر کر برآمدے میں رکھ دیا۔ بمبا خود گئی۔ برآمدے سے حقہ اٹھا لائی اور علامہ کے آگے رکھ دیا۔ علامہ بہت خوش ہوئے اور بولے: دیکھئے مرزا صاحب، ہمیں رنجیت سنگھ کی پوتی نے اپنے ہاتھ سے حقہ پلایا۔ مرزا جلال الدین فرماتے ہیں کہ ایک اور موقعہ پر بمبا کی ایک آسٹرین سہیلی آئی۔ وہ بھی علامہ سے ملنے کی مشتاق تھی۔ ہمیں پھر چائے کی دعوت دی گئی۔ اس دفعہ جگندر سنگھ لاہور میں موجود نہ تھے۔ صرف میں اور علامہ گئے اور چائے پی کر واپس آگئے۔

ایک دفعہ بمبا نے شالامار میں چائے کا انتظام کیا۔ اس کی آسٹرین سہیلی کے علاوہ ایک اور یورپین خاتون بھی موجود تھیں۔ ایک نے علامہ کی خدمت میں باغ کا ایک خوبصورت پھول پیش کیا، دوسری نے ایک خوبصورت بلی پال رکھی تھی، جو اس کی گود میں بیٹھی تھی۔ علامہ کی دو نظمیں "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" اور "کسی کی گود میں بلی دیکھ کر" اس موقع کی یاد میں کہی گئی تھیں۔ شہزادی بمبا کو انگریزوں سے بڑی کد تھی۔ اس کے دل میں یہ وہم بیٹھا ہوا تھا کہ انگریز مجھے زہر دے دیں گے۔ بیمار ہوئی تو لاہور میڈیکل کالج کے انگریز پرنسپل ڈاکٹر سدرلینڈ سے علاج کرایا۔ میل جول بڑھا اور دونوں کی شادی ہوگئی۔ کچھ مدت بعد ڈاکٹر سدرلینڈ ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ بمبا نے جیل روڈ والی کوٹھی فروخت کر دی اور شوہر کے ساتھ انگلستان چلی گئی۔[1]

اس قسم کے بیشتر واقعات شاہد ہیں کہ علامہ اقبال مسلمانوں ہی میں نہیں، بلکہ غیر مسلموں میں بھی بے حد مقبول تھے۔ اسی دور میں ایک ہندو ڈپٹی کمشنر کی بیٹی علامہ کے ساتھ شادی کرنے کی بے حد خواہش مند تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ مجھے ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں کے ساتھ زیادہ

---

[1] روایت مرزا جلال الدین بیرسٹر بحوالہ ذکر اقبال ص ۸۰ - ۸۱

انس ہے[1] شاید یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے واقعات اور گوناگوں دلچسپیوں کے باعث اس دور کی علامہ کی شاعری قومی رنگ سے ذرا کم ہم آہنگ تھی۔ اس کا اعتراف خود علامہ نے ایک خط میں عطیہ بیگم سے یوں کیا ہے: "گزشتہ پانچ چھ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی ہو رہی ہیں اور پبلک کو ان کے پڑھنے کا حق نہیں۔ بعض نظمیں تو میں نے خود ہی تلف کر دی ہیں مبادا کوئی ان کو چرا کر شائع کر دے۔ بہرحال کچھ تردد کروں گا کہ بعض نظمیں محفوظ ہو جائیں۔ والد محترم نے فرمائش کی ہے کہ میں بو علی قلندر کی پیروی میں ایک فارسی مثنوی لکھوں۔ اگرچہ یہ کام مشکل تھا، لیکن میں نے وعدہ کر لیا۔ چند ابتدائی اشعار یہ ہیں:

نالہ را انداز نو ایجاد کن
بزم را از ہای و ہو آباد کن
آتش استی بزم عالم بر فروز
دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز

سینہ را سر منزلِ صد نالہ ساز
اشک خونیں را جگر پر کالہ ساز
پشت پا بر شورشِ دنیا بزن
موجۂ بیروں ایں دریا بزن

باقی اشعار بھول رہا ہوں۔ امید ہے کہ کچہری سے واپس آنے پر یاد کر سکوں گا۔ ایک غزل بھیج رہا ہوں جو پچھلے دنوں رسالہ ادیب میں چھپی ہے۔ شہزادی دلیپ سنگھ کی ایک سہیلی مس گوسٹین نے شالامار کے ایک تختۂ گل سے ایک نہایت خوبصورت پھول مجھے پیش کیا تھا۔ اس پر میں نے چند اشعار لکھے تھے۔ میرے دوست سردار امراؤ سنگھ نے ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے سردار صاحب کو لکھا ہے کہ وہ ترجمہ بھیج دیں اصل نظم بھی غالباً میرے پاس نہیں۔ بہرحال تلاش کر کے تمہیں بھیج دوں گا"[2]

---

[1] ذکر اقبال ص ۷۲

[2] اقبال کا خط، عطیہ بیگم کے نام ۷ جولائی ۱۹۱۱ء

اقبال، جاپان جائیں؟

۱۹۱۲ء میں علامہ اقبال نے بڑی خوبصورت اور ولولہ انگیز نظمیں لکھیں، جن میں

ع یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے اور ع نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردہ میم کو اٹھا کر — زبان زد خاص و عام ہوئیں۔ ان ہی نظموں کی مقبولیت کا اندازہ لگاتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کو جاپان بھیجنا چاہیئے، تاکہ وہ وہاں جاکر اسلام کی تبلیغ کریں۔ سوال پیدا ہوا کہ جاپان آنے جانے کے اخراجات کون برداشت کرے گا۔ اس کا جواب مولانا ظفر علی خاں نے یہ دیا کہ علاّمہ کی نظم کی دس ہزار کاپیاں چھاپ کر فروخت کی جائیں اور ان سے جو رقم موصول ہو، وہ ان کے جاپان کے آمد و رفت اور وہاں کچھ عرصہ رہنے کے اخراجات کے لیے کافی ہوگا۔ اس پر علامہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: یہ تجویز محض جوش میں آکر کی گئی ہے۔ جب مولوی برکت اللہ بھوپالی تین سال جاپان میں رہے اور وہاں سے اخبار بھی نکالتے رہے، لیکن دو تین جاپانیوں کے سوا کسی کو مائل بہ اسلام نہ کر سکے تو میں موسم گرما کی تعطیلات میں دو مہینوں میں وہاں کیا کر سکوں گا؟[۱]

شمع و شاعر

یہ حقیقت تھی کہ علامہ جاپان یا اور کسی ملک جانے کی بہ نسبت اپنے ملک میں رہ کر اسلام اور ملت اسلامیہ کی بہتر خدمت کر سکتے تھے۔ انہوں نے یہ خدمت انجام دی۔ اسی سال انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ دیوانہ ہوسٹل کے صحن میں منعقد ہوا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی اس موقع پر زیر صدارت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ہوا۔ بیشمار اکابر و معززین جمع تھے۔ انجمن کے جلسے کا پہلا اجلاس مرزا سلطان احمد وزیر مال بہاولپور کی صدارت میں اور اس کے بعد کا اجلاس فقیر سید افتخار الدین کی صدارت میں منعقد ہوا، چونکہ اس اجلاس میں

---

[۱] پیسہ اخبار ۲۸ مارچ ۱۹۱۲ء

علامہ اقبال نظم پڑھنے والے تھے، اس بے پناہ دل طرف اتنا ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ علامہ نے اپنی مشہور نظم شمع و شاعر، پڑھ کر سنائی، جس نے ہزارہا کے مجمع کو ششدر و مبہوت کر دیا۔ اس نظم سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے ہزاروں روپیہ چندہ انجمن کو دیا۔ چونکہ اس موقع پر انجمن کے اجلاسوں کی صدارت سلطان احمد اور فقیر افتخار الدین نے کی تھی، اس لئے علامہ نے ایک قطعہ فی البدیہہ ارشاد فرمایا ؎

ہمنشین بے ریائم از رہِ اخلاص گفت
اے کلام تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر
درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش
گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر
گفتمش اے ہمنشیں، معذور می دارم ترا
در طلسم امتیازِ ظاہری ہستی اسیر
من کہ شمع عشق را در بزم دل افروختم
سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم [۱]

مہاراجہ الور کی ملازمت سے انکار

۱۹۱۲ء ہی میں سر علی امام کے کہنے پر علامہ اقبال ریاست الور پہنچے۔ منشی طاہر الدین اور علی بخش ان کے ہمراہ تھے۔ سر علی امام نے علامہ سے ذکر کیا تھا کہ مہاراجہ الور چاہتے ہیں کہ آپ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری لگ جائیں۔ چنانچہ سر علی امام کے اصرار پر آپ مہاراجہ کے مہمان ہوئے۔ مہاراجہ نے خوب خاطر و مدارات کی، لیکن علامہ نے اس کی ملازمت کرنے سے انکار کر دیا۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مہاراجہ کردار کے لحاظ سے اچھا انسان نہیں تھا اور دوسرے وہ علامہ ایسی شخصیت کو صرف چھ سو روپے ماہوار مشاہرے پر ملازم رکھنا چاہتا تھا۔

---

[۱] ذکر اقبال ص ۸۳ بحوالہ پیسہ اخبار ۱۸-۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء

مسجد کانپور کا سانحہ

۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کا مشہور سانحہ رونما ہوا۔ یہ مسجد مچھلی بازار میں واقع تھی اور اس سانحہ کی وجہ یہ تھی کہ مقامی احکام نے سڑک کو سیدھا کرنے کے لیے اس کے ایک حصّے کو شہید کر دیا، اس پر مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو گئے اور وہ احتجاج کے لیے گھروں سے باہر نکل آئے۔ سرکار نے "امن" کا بہانہ بنا کر ان پر گولی چلا دی۔ بہت سوں کو گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلانے کا اعلان کیا۔ یہ خبر جب پنجاب میں آئی۔ تو علامہ اقبال سے رہا نہ گیا۔ وہ مرزا جلال الدین بیرسٹر کے ساتھ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء کو کانپور روانہ ہو گئے۔ تاکہ وہاں مسلمانوں کی پیروی کر سکیں۔

مولانا گرامی کا تعارف

گرامی اور اقبال میں روابط کافی عرصہ رہے۔ مولانا غلام قادر گرامی جب کبھی ہوشیار پور سے لاہور آتے علامہ اقبال ہی کے ہاں قیام کرتے۔ علامہ اقبال کے ساتھ ان کی صحبتیں ہفتہ ہفتہ ہی نہیں، بلکہ مہینوں رہتیں۔ گرامی کو چونکہ فارسی شاعری میں درجہ کمال حاصل تھا، اس لیے علامہ اقبال اپنے بعض اشعار کے سلسلے میں ان سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ ایک طرف علامہ گرامی کے مداح تھے تو دوسری طرف گرامی بھی علامہ کے شیدائی تھے اور ان کے منصب کو خوب پہچانتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے۔ ان کا مشہور شعر ہے ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبریئے کرد و پیغمبر نتواں گفت

۱۹۱۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال نے گرامی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا "گرامی اکابر شعرائے فارسی میں سے ہیں۔ آج گرامی کو سن لو کل فخر کرو گے کہ تم نے گرامی کو سنا ہے"۔ انجمن کے اسی اجلاس میں اب کے علامہ اقبال نے فلسفہ خودی پر سادہ اور سلیس زبان میں روشنی ڈالی اور مثنوی 'اسرار خودی' کے

چند اشعار سنائے۔ اسی سال مثنوی اسرارِ خودی کی کتابت کا کام مکمل ہوا اور انہی دنوں حضرت علامہ کی والدہ رحلت فرما گئیں۔ اس سانحہ ارتحال کے تقریباً تین برس بعد تک علامہ زیادہ تر منقار زیرِ پر رہے۔ یہ بڑا پُرآشوب زمانہ تھا۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی اور دوسرے کئی علمبرداران اتحادِ اسلامی پابندِ سلاسل تھے۔ اس دور میں علامہ کی خاموشی کسی گہرے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن اواخر جنگ میں وائسرائے نے نواب ذوالفقار علی خاں کے توسل سے علامہ اقبال کو وار کانفرنس میں شرکت کی بطورِ خاص دعوت دی۔ یہ کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے موقع پر علامہ اقبال نے ایک مسدس لکھی۔ اس کا ایک بند یہ تھا ؎

تلوار تیری دہر میں نقادِ خیر و شر
بر روزِ جنگ تو زجگر سوز سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر
آزادہ پرکشادہ پری زادہ بم سپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

اس مسدس کے کل نو بند تھے اور یہ علامہ اقبال نے یونیورسٹی ہال میں بھی پڑھی[۱]۔ اس مسدس پر انہیں بے پناہ داد تحسین ملی۔

مرغ نامہ بر

علامہ اقبال کو بچپن میں کبوتر پالنے کا بہت شوق رہا۔ عالم شباب میں ان کا یہ شوق ایک مقدس جذبے کے ساتھ دل ہی دل میں پروان چڑھتا رہا۔ علامہ اقبال اس تلاش و جستجو میں رہے کہ کہیں سے انہیں مدینے کا کوئی کبوتر مل جائے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء

---

[۱] اخبار "وکیل" امرتسر ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء

میں ان کی یہ دلی آرزو پوری ہوگئی۔ جب ایک حاجی نے حضورؐ کے روضہ مبارک کے قربِ دجوار سے انہیں ایک کبوتر لا کر دیا۔ یہ ابھی بچہ تھا۔ علامہ نے اسے بڑے پیار اور مقدس جذبے سے پالا پوسا۔ انہیں ہر وقت اس کے دانے دنکے کی فکر دامن گیر رہتی تھی[1] مگر افسوس کہ ۲۰ نومبر کو یہ کبوتر ایک بلی نے نگل لیا۔ علامہ کے دل پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے اس پر ایک نظم بھی کہی۔ اس نظم کا مطلع تھا ؎

رحمت ہو تیری جان پہ اے مرغِ نامہ بر
آیا تھا اڑ کے ذروۂ بامِ حرم سے تو

یہ نظم مولانا ظفر علی خاں کے اخبار "ستارہ صبح" میں شائع ہوئی، جو اس زمانے میں کرم آباد سے نکلتا تھا اس سے قبل علامہ کا ایک مضمون "رسول اللہ صلعم فن شعر کے مبصر کی حیثیت سے" اسی اخبار کی ۸ اگست ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ان ہی دنوں میں مولانا ظفر علی خاں علامہ اقبال سے ملنے کے لیے لاہور تشریف لائے تھے اور واپسی پر ان ملاقاتوں کا حال "ستارہ صبح" میں لکھتے تھے۔

"۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو یورپ کی پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی۔ جرمنی، آسٹریا اور ترکی شکست کھا گئے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو سر مائیکل اوڈوائر لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بریڈلا ہال لاہور میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا۔ جس میں علامہ اقبال بھی نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ شریک ہوئے اور لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں ارشاد فرمائیں، جن کا تعلق جنگ یا فتح سے ہرگز نہ تھا[2]

اس دور تک علامہ اقبال نے اپنی فکر کے ذریعہ مسلمانوں کے لیے عمل کی دو نہایت روشن، واضح اور متعین راہیں تلاش کرلی تھیں۔ ایک خودی اور دوسری بین الاسلامی نظریہ کی راہ ـــــ خودی کے درس سے وہ مسلمانوں کو ان کی حقیقی منزل سے آگاہ کرنا چاہتے تھے، جو اسلام اور نظریہ پاکستان کی منزل تھی۔

---

[1] ستارہ صبح شمارہ ۴، دسمبر ۱۹۱۷ء

[2] ذکر اقبال ص ۹۰

اقبال

مصوّرِ پاکستان

حکیم الامت علامہ اقبالؒ رحمتہ اللہ علیہ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ان کی وفات سے تقریباً ایک سال گیارہ ماہ بعد سرزمین لاہور میں قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی زیر قیادت وہ قرارداد منظور ہوئی، جس کو عرف عام میں "قرارداد پاکستان" کا مقدس نام دیا گیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اس قرارداد لاہور کا ایک بہت بڑا حصہ عملاً و معناً مکمل ہوگیا، یعنی پاکستان، دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی اسلامی مملکت کے طور پر ظہور پذیر ہوا، اور یوں حضرت علامہ اقبال کو اپنے اُس خواب کی تعبیر مل گئی۔ جو انہوں نے برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کے طور پر دیکھا تھا۔

علامہ اقبال کی قیادت کا دور بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوا اور تیس سال سے زائد عرصہ تک وہ ملت کی ذہنی و فکری رہنمائی فرماتے رہے۔ اس زمانے میں علامہ مغفور نے بلا شرکت غیرے شعر کی دنیا پر حکمرانی کی، مگر وہ صرف اشعار ہی میں گم ہو کر نہ رہ گئے، بلکہ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بے پناہ سیاسی خدمات بھی انجام دیں۔ غیر منقسم ہندوستان کے طول و عرض میں قوم نے جہاں کہیں بھی انہیں یاد کیا، حضرت علامہ وہاں پہنچے۔ انہوں نے خطبات دیئے، مکتوبات تحریر فرمائے اور سیاست دان کی حیثیت سے مسلم لیگ کی تنظیم کی، قوم کو تعلیم و تجارت کی طرف راغب کیا اور "قائد اعظم" سے سارے اختلافات تج کر انہیں لکھا کہ قوم کو ان کی رہنمائی کی ضرورت ہے، وہ آئیں اور قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو دشمنوں کے سیاسی بھنور سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچا دیں۔

اقبال کی سیاسی زندگی کا پس منظر بڑا واضح اور یقینی ہے۔ ۱۹۰۵ء تک وہ سیاست سے الگ تھلگ رہے اور شعر و سخن کے ذریعے ادب کی دنیا میں انقلاب برپا کرتے رہے۔

اس دوران وہ نظریاتی اعتبار سے "وطن اور وطنیت" دونوں کے قائل رہے، لیکن یورپ میں قیام کے دوران اور پھر بعد میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو دیکھ کر انہوں نے اپنے سیاسی نظریات میں تبدیلی پیدا کرلی۔ اردو ہندی تضیے کی ابتدا ہو چکی تھی جس کے باعث ہندو مسلم اختلافات نے شدت اختیار کرلی اور تقسیم بنگال کا واقعہ پیش آیا۔ اس وقت لارڈ کرزن وائسرائے تھے۔ انہوں نے جولائی ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا اعلان کیا۔ مسلمان تو اس تقسیم کے حق میں تھے، کیونکہ انہیں ایک مسلم صوبہ حاصل ہو رہا تھا۔ لیکن ہندو ہرگز یہ نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے تقسیم بنگال کی شدومد سے مخالفت کی اور تشدد کی تحریک جاری کر دی۔ ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے۔ مشرقی بنگال کے ان واقعات کا اثر سارے ملک پر پڑا اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین اختلافات کی خلیج وسیع تر ہو گئی۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے ایک وفد نے مسلم حقوق کے تحفظ کے متعلق ایک یادداشت وائسرائے کو بھیجی اور اسی سال دسمبر میں مسلمانوں کی ایک باضابطہ سیاسی جماعت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا نام "آل انڈیا مسلم لیگ" تھا۔ اسی زمانہ میں مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے لندن میں ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کا ایک اجلاس سید امیر علی کی صدارت میں ہوا، جس میں طے کیا گیا کہ اس کمیٹی کا الحاق مسلم لیگ سے کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کا نام برٹش کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ رکھا گیا۔ اقبالؔ جو ان دنوں انگلستان میں تھے، اس کمیٹی کے رکن بن گئے۔ اور خدمات انجام دیتے رہے۔ یورپ سے واپسی کے بعد علامہ سیاست سے بے تعلق نہ رہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ وطن پہنچے تو صوبائی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ قدرتی طور پر لیگ کی جاذبیت نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ مسلمانوں کی اس جماعت کے رکن بن گئے۔

اقبالؔ اور جوہرؔ

جس زمانے میں علامہ اقبالؔ نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا، اس وقت

فضاؤں میں "محمد علی"، "شوکت علی" اور "خلافت کانفرنس زندہ باد" کے نعرے گونج رہے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی دلکش شخصیت، بے پایاں جرأت اور غیر معمولی ایثار سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور بقول جمیل ہیں مولانا کی نظر بندی پر ان کی مدح و ستائش میں علامہ اقبال نے اشعار کہے، مگر جب ان ہی محمد علی جوہر نے صدر وفد خلافت کی حیثیت سے یورپ کی خاک چھانی تو اقبال چپ نہ رہ سکے اور انہوں نے مولانا سے مخاطب ہو کر کہا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

"مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

ان اشعار سے بظاہر یہ مطلب نکلتا ہے کہ اقبال نے مولانا محمد علی جوہر پر طنز و تعریض کی۔ انہیں دریوزۂ خلافت کا خطاب اور خلافت کی گدائی کا طعنہ دیا، لیکن اقبال کی طنز کا شکار مولانا جوہر کی شخصیت نہیں، تحریک خلافت کی وہ پالیسی تھی، جس کے تحت مجبور ہو کر وہ وفد خلافت لے کر یورپ گئے۔ خود مولانا محمد علی جوہر نے علامہ اقبال کے ان اشعار کو ہی کسوٹی پر پرکھا اور ان کی صداقت کو محسوس کیا[1] قبل ازیں دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگرس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس قرار پائے تھے۔ اس موقع پر گاندھی، تلک، مسز بیسنٹ، موتی لال نہرو اور دوسرے بڑے بڑے رہنما کانگرس میں شریک ہوئے۔ پنڈت موتی لال نہرو

---

[1] مضامین محمد علی ص ۲۷۹

نے صدارت کی، مسلم لیگ کا اجلاس منڈوہ کنہیالال میں ہوا، حکیم اجمل خاںؒ اس کے صدر تھے۔ اس موقع پر مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی بھی بیتول جیل (سی۔ پی) سے رہا ہو کر اجلاس میں تشریف لائے۔ علامہ اقبال بطور خاص علی برادران سے ملاقات کے لیے لاہور سے بذریعہ موٹر کار امرتسر پہنچے اور مولانا محمد علی جوہر سے بغلگیر ہوئے۔" جلسے میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا۔ اکثر لوگ اشکبار تھے۔ علامہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعار آبدار فرمائے، جو اسی دن موٹر کے سفر میں موزوں ہو گئے تھے ؎ [1]

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند
قطرہ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

مولانا محمد علی جوہر سے علامہ اقبال کو جو سیاسی اختلافات تھے، وہ انہیں کبھی عوامی اجتماعات میں منظر عام پر نہ لاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علامہ کے نزدیک ایسا کرنے سے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو گزند پہنچنے کا احتمال تھا۔ مثال کے طور پر" مولانا محمد علی، گاندھی جی کے ساتھ تحریک عدم تعاون اور سول نافرمانی میں شریک اور ایک متحدہ قومیت کی تشکیل میں پیش پیش رہے۔ ۲۴ تا ۲۷ء کے فسادات بھی ان کو اپنی اس راہ سے ہٹا نہ سکے۔ ۲۸ء میں انہوں نے تجاویز دہلی کی تائید کی اور ان کو منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اقبال کو مولانا کی اس پالیسی اور ان کے ان نظریات سے اختلاف تھا۔ ان کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل ایک خواب ہے، جو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ لیکن باوجود اس اختلاف رائے کے انہوں نے کبھی مولانا کی پبلک میں تنقیص نہیں کی۔" [2] البتہ ان کے بعض نجی

---

[1] ذکر اقبال ص ۱۰۶ [2] اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۲۴۷ - ۲۴۸

خطوط میں مولانا کے اس مسلک کے بارے میں چند تنقیدی اشارے ضرور ملتے ہیں ۔ ۸ مارچ ۱۹۲۸ کو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں : افسوس اہل خلافت اپنی راہ سے بہت دور جا پڑے، وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں، جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لیے بھی قبول نہیں کر سکتا[۱] علامہ اگر چاہتے تو مولانا محمد علی جوہر کی کھلے بندوں مخالفت کر کے زیادہ مقبولیت حاصل کر سکتے تھے، مگر انہوں نے ایسا کرنا شائستہ سیاست کے اصولوں کے منافی اور مسلمانوں کے مفاد کے حق میں سمجھا اور خاموشی اختیار کئے رکھی۔

پنجاب کونسل میں ایک مرتبہ ایک سکھ رکن نے یہ تحریک پیش کی کہ سرکاری عہدوں پر انتخاب کھلی مسابقت کے ذریعے ہوا کرے۔ علامہ اقبال ان دنوں پنجاب کونسل کے رکن تھے۔ انہوں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ان کی رائے تھی کہ اس وقت کی فضا فرقہ واریت کے زہر سے مسموم ہو چکی ہے، اس لئے اگر انتخاب کھلی مسابقت کے ذریعے ہوتے۔ تو مسلمانوں کو بہت کم موقع ملے گا۔ لہٰذا اس نوع کا طریق کار وضع کیا جائے کہ جس سے مسلمانوں کے مفاد پر زد نہ پڑے۔ اس کے لئے بہتر صورت یہ ہے کہ مسابقت کے ساتھ ساتھ نامزدگی بھی ہو۔ لندن ٹائمز میں علامہ اقبال کی یہ تقریر رائٹر کے حوالے سے ۲۰ جولائی ۱۹۲۷ء کو شائع ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس تقریر کو پڑھا اور ۴ر اگست ۱۹۲۷ء کو 'ہمدرد' میں 'مرا استاد اقبال'، 'شاعر اسلام'، 'اقبال'، 'شمع و شاعر کے مصنف سے ایک سوال'، کے عنوانات کے تحت متواتر چار مقالات لکھے جس میں انہوں نے اقبال کی محبوب شخصیت سے اپنی عقیدت اور ان کے کلام سے اپنی شیفتگی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اس خیال کی سخت تردید کی اور کہیں کہیں علامہ اقبال پر رجعت پسندی کا الزام بھی لگایا۔ اقبال کی بجائے اگر کوئی اور سیاستدان ہوتا، تو لگی لپٹی رکھے بغیر مولانا جوہر کو آڑے ہاتھوں لے لیتا، مگر علامہ، مولانا جوہر کی اس تلخ نوائی کو خاموشی سے برداشت کر گئے۔

سائمن کمیشن سے تعاون کے سوال پر علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر کے درمیان

---

[۱] مکاتیب اقبال ج اص ۲۶۸

اختلاف رونما ہوا۔ علامہ کمیشن کے ساتھ تعاون کے حق میں تھے اور مولانا کمیشن کا مکمل مقاطعہ کرنا چاہتے تھے ۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر نے ۱۴ نومبر ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں علامہ اقبال کے خلاف ایک مضمون لکھا، مگر علامہ اقبال اس تلخ نوائی کو بھی گوارا کر گئے۔ علامہ کی اس خاموشی کا جوہر پر گہرا اثر ہوا اور انہوں نے مولانا عبدالقادر قصوری کے توسل سے علامہ اقبال کو اپنا ہم نوا بنانا چاہا۔ مگر علامہ نے اس ہم نوائی کی خاطر اپنے اصولوں کو قربان نہ کیا۔ تا آنکہ نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد جب مولانا محمد علی جوہر نے رپورٹ کی سخت مخالفت کی اور کانگرس سے ترک تعلق کر کے آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے، تو اقبال اور جوہر کے زاویہ نگاہ میں کوئی بڑا فرق باقی نہ رہا اور سیاسی میدان میں دونوں رہنما ایک دوسرے کے قریب آگئے ۔ علامہ اقبال نے ماضی کی سب تلخیوں کو بھلا دیا اور انہیں دہرانا تو درکنار، ان کا ذکر تک زبان پر نہ لائے ۔ بلکہ ان کے دل میں مولانا جوہر کی عزت پہلے سے بھی بڑھ گئی ۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں : ان کی اسلامی سادگی اور آخری سالوں میں اپنی بعض آراء کے بدل لینے میں جس امانت و دیانت کا انہوں نے ثبوت دیا، اس کا بہت احترام کرتا ہوں[1] ۔ یہ الفاظ ہر دو رہنماؤں کی سیاسی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر نے پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور اپنی مشہور تقریر کے بعد جب رحلت فرما گئے، تو اقبال کی زبان سے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار بے ساختہ نکل گئے ؎

یک نفس جان نزار او تپید اندر فرنگ
تا مزہ برہم زنیم از ماہ و پروین در گزشت
اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ از جذبِ حرم
از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گزشت
خاکِ قدس اورا بآغوشِ تمنا در گرفت

---

[1] مکاتیب اقبال ج ۱ ص ۲۶۸

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت
می نہ گنجد جز بآں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیز اسود و احمر گزشت
جلوہ او تا ابد باقی بچشم آسیا است
گرچہ آں نور نگاہ خاور از خاور گزشت

اقبال جوہر تعلقات پر، مولانا محمد علی جوہر کے عاشق اور علامہ اقبال کے عارف حضرت مولانا عبد الماجد دریا بادی کا تجزیہ کچھ یوں ہے: اقبال اور جوہر کا رنگ، عملی دنیا میں ایک دوسرے سے الگ رہا، لیکن نظر اگر سطح سے گزر کر تہ تک پہنچے، اور محض عمل نہیں، محرکات عمل سامنے ہوں، تو پھر دیکھئے! لا دیکھ لے گا کہ دونوں ایک ہی مٹی سے پیدا، سرشت ایک، طینت ایک، قالب دو، روح ایک، حب اسلام کے جنوں میں دونوں گرفتار، عشق رسول و اسلام کے جام سے دونوں سرشار! ایک کی سیاست دوسرے کی شاعری دونوں اسی ایک رنگ سے رنگین، فرق صرف اتنا کہ ایک کے کلام میں حکیمانہ ذوق عرفان، دوسرے کے قلم و زبان میں جوش طوفان، دونوں دنیا میں جئے تو اسلام کی توحید کا کلمہ پڑھتے ہوئے، دونوں دنیا سے اٹھے تو آبروئے ما زنام مصطفےٰؐ کا وظیفہ جپتے ہوئے! ایک کے چہرے پر سیاست کا نقاب، دوسرے کے نام کا سخن گویوں کی محفل سے انتساب! حقیقتاً نہ یہ شاعر، نہ وہ سیاسی لیڈر[1]

اقبال کے بارے میں خود مولانا جوہر کی کیا رائے تھی؟ اس کا اظہار ان الفاظ میں ملتا ہے، دیگر لاکھوں ہندی مسلمانوں کی طرح جو واقف ہونے کے باوجود اقبال سے ناواقف تھے، میں بھی برسوں سے اقبال کو جانتا تھا اور کچھ عرصے سے جب مجھے کسی کام سے لاہور جانا پڑتا تو میں ان کا مہمان ہوتا اور دیکھتا کہ وہ وکالت صرف اس حد تک کرتے کہ ان کے حقے کا معمولی خرچ نکل سکے۔ باقی وقت وہ اپنے پسندیدہ ادبیات اور فلسفہ کے

---

[1] جوہر: اقبال نمبر ص ۷۲

مطالعہ اور زیادہ تر اس پُر اثر شاعری میں صرف کرتے، جس کے ذریعے وہ ہندی مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر رہے تھے ۔ بحیثیت شاعر اقبال بیسویں صدی کے ہند میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے اور اسلامی ہند اس پنجابی گوشہ نشین اور شرمیلے بیرسٹر سے زیادہ کسی اور کا ممنون نہیں، اردو داں دنیائے اسلام کا کوئی گھر ایسا نہیں، جو اقبال سے ناواقف ہو اور بلاشبہ میں ان کا قدر دان اور عاشق تھا۔[1] درحقیقت اقبال اور جوہر سیاسی نظریات سے قطع نظر دونوں ہی ایک دوسرے کے شیدائی اور قدر دان تھے۔

اقبال اور حسین احمد مدنی

۱۹۳۸ء میں کہیں مولانا حسین احمد مدنی نے ایک تقریر میں یہ کہہ دیا کہ اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اس کی تفصیل یو۔پی کے بعض اخبارات میں شائع ہوئی اس سے ظاہر یہی ہوتا تھا کہ مولانا نے مسلمانوں کو جدید نظریۂ وطنیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے، جس میں مذہب ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ علامہ اقبال عمر بھر وطنیت کے اس تصور کے خلاف مصروف جہاد رہے۔ اس لئے انہیں مولانا حسین احمد مدنی کے اس انداز نگر سے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، بے حد صدمہ ہوا اور انہوں نے یہ اشعار کہے جو زبان زد عام ہیں ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ\
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است\
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است\
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است\
بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست\
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است[2]

---

[1] ۔ آثار اقبال ص ۱۴۹

[2] ۔ ارمغان حجاز ص ۲۷۸

علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق ان کا یہ بیان اخبار میں پڑھا تھا، جو مولانا مدنی سے منسوب کیا گیا تھا۔ بیان یہ تھا :

"لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے بجز متحدہ قومیت کے اور کوئی رشتہ اتحاد نہیں، جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے"[۱]

ان الفاظ سے علامہ مرحوم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مولانا نے مسلمانان ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریہ وطنیت اختیار کریں[۲]۔ مولانا مدنی کی اس تقریر سے علامہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے محولہ بالا قطعہ کہا۔ وطنیت اور قومیت کا یہ مسئلہ چونکہ علامہ اقبال کی تحریر و تقریر اور شاعری کا موضوع خاص تھا، اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جس شد و مد سے علامہ مرحوم نے مولانا حسین احمد مدنی کے اس نظریہ کی مخالفت کی، اتنی ہندوستان کے کسی اور مفکر اور کسی مسلمان لیڈر نے نہ کی۔ انگلستان سے واپسی کے بعد علامہ اقبال اس نظریہ کے خلاف نہ صرف صدائے احتجاج بلکہ نعرہ جنگ بلند کرتے رہے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی جیسے ذمہ دار عالم دین کی تقریر پر جو اشعار علامہ کی زبان قلم سے ادا ہو گئے الفاظ کے لحاظ سے وہ یک گونہ جذباتی اور قدرے تند و تلخ سہی، تاہم اقبال کی طرف سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

حافظ بخود نپوشید ایں خرقہ مے آلود
اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را!

اس لئے کہ انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اسی مسئلہ قومیت کی توضیح و تشریح میں گزارا تھا اور وہ اس مسئلہ کو اسلام کے مسلک سیاسی و اجتماعی کا ایک بنیادی مسئلہ سمجھتے تھے، خصوصاً اس لئے

۱؎ اخبار انصاری مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۳۸ء

۲؎ روزنامہ احسان ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء

تھی کہ یہ عقیدہ ان کی روح پر چھا گیا تھا اور یہ مسلک ان کے دماغ سے اتر کر ان کے جذبات بلکہ ان کی پوری شخصیت میں پیوست ہو گیا تھا۔[1] بعض ناقدین کی رائے میں اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں اپنے محولہ بالا اشعار میں جن جذبات کا اظہار کیا، اس کا تعلق "ذاتیات" سے تھا۔ لیکن ایسا ہرگز نہ تھا، کیونکہ ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کے ایک متقی مستند عالم دین کی تقریر سے درد و کرب کا جو احساس شاعر مشرق کے وجدان و روح میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے خارج میں الفاظ کا یہ جامہ پہن لیا اور اقبال ذہنی و روحانی تڑپ کے ساتھ پکار اٹھے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال کا مقصد وحید در حقیقت مولانا حسین احمد مدنی کی ذات پر حملہ کرنا یا ان کے تقویٰ یا علم و فضیلت کا مذاق اڑانا نہ تھا، بلکہ ناموس شریعت کے محافظ اور اسرار دین کے ایک رازدار سے جو عقیدت و محبت اس دانائے راز کو تھی، اس نے اس موقع پر اس طنز کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اقبال کی اس طنز و تعریض کے پس پردہ بھی دراصل ان کی محبت و عقیدت ہی کار فرما تھی۔ زخمی محبت اور جھنجلائی ہوئی عقیدت۔

جس زمانے میں مولانا حسین احمد مدنی کی تقریر اخبارات میں شائع ہوئی، ان ہی دنوں علامہ مرحوم کے یہ اشعار چند ایک اخباروں کی زینت بنے۔ اس پر بحث و تمحیص کا آغاز ہو گیا، جس میں ہر دو اکابر کے عقیدت مندوں نے حصہ لیا۔ بعض موقع پرستوں نے جو ہمیشہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں، اس دوران علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی پر کیچڑ اچھالنے کی بھی کوشش کی اور چند مخلصین نے ان دونوں اکابر کی غلط فہمیوں کو رفع کرانا چاہا۔ مولانا مدنی کے ایک عقیدت مند طالوت نے ان سے "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کی تشریح و توضیح چاہی جس کے جواب میں مولانا مدنی نے واضح کیا کہ انہوں نے اپنی تقریر میں "قوم" کا لفظ استعمال کیا تھا، ملت کا نہیں اور یہ بتلایا کہ عربی لغت کی رو سے ان دونوں لفظوں میں زمین و آسمان کا

---

[1] اقبال کا سیاسی کارنامہ، ص ۲۵۲

فرق ہے[1] مولانا کی یہ وضاحت اخبار میں بھی شائع ہوئی - علامہ اقبال ان دنوں سخت علیل تھے - لیکن اس بیماری میں بھی جب کہ انہیں ضعف اور اختلاج قلب کے دورے پڑ رہے تھے، علامہ اقبال نے مولانا مدنی کی اس وضاحت کے جواب میں ایک مبسوط، جامع اور معرکتہ الآرا بیان جاری کیا۔

اپنے اس بیان میں علامہ اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنانے اور ان کی شخصیت پر طنز و تعریض کرنے کی بجائے اصل موضوع پر نہایت سنجیدگی اور عالمانہ انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یہ واضح کیا کہ حقیقی، تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے[2] پھر آپ نے ابتدائے بیان ہی میں الفاظ قوم اور ملت کے معنوں میں الجھنے کی بجائے اصل مابہ النزاع مسئلہ کی تنقیح کو ان الفاظ میں بیان کر دیا :

"چونکہ لفظ ملت کے معنی زیر بحث مسائل پر چنداں موثر نہیں، اس واسطے اس بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد مدنی کا ارشاد یہ تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔ مجھ کو حقیقت میں مولانا کے اس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں۔ اعتراض کی گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کہ یہ کہا جائے کہ زمانہ حال میں اقوام کی تشکیل اوطان سے ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ اس نظریہ کو اختیار کریں، ایسے مشورے سے قومیت کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آتا ہے، جس کا ایک اہم دینی پہلو ہے[3]"

علامہ اقبال کی مخالفت مولانا حسین احمد مدنی کی ذات سے نہ تھی، وہ تو جدید فرنگی نظریہ

---

[1] نظریہ قومیت، مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال ص ۲۲ بحوالہ مدینہ بجنور ۲۱ فروری ۱۹۳۸ء

[2] رسالہ اردو، اقبال نمبر ص ۳۳۵

[3] مضامین اقبال ص ۱۸۱

کے مخالف تھے۔ انہیں مولانا کی رائے پر بھی اعتراض نہ تھا، بلکہ معترض تھے تو اس مشورہ پر جو علامہ اقبال کے خیال میں مولانا حسین احمد مدنی مسلمانان ہند کو "فی سبیل اللہ" دے رہے تھے۔ اس کے باوجود علامہ اقبال نے مولانا مدنی کے عقیدت مندوں کے کہنے پر مولانا کی ذات سے متعلق اپنے جذبات و احساسات کی وضاحت کی۔ علامہ اقبال کی نیک نیتی اور صاف گوئی کا اندازہ اس جواب سے ہو جاتا ہے، جو انہوں نے طالوت نامی مولانا مدنی کے عقیدت کیش کو لکھا۔ علامہ نے فرمایا "میرے ذہن میں ایک بات آئی، جس کو گزارش گزار کر دینا ضروری ہے، امید ہے کہ آپ مولوی صاحب کو خط لکھنے کی زحمت گوارا فرما کر اس بات کو صاف کر دیں گے، جو اقتباسات آپ نے ان کے خط کے درج کئے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے یہ فرمایا کہ آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں، اگر ان کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے، تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ فرنگی سیاست کا نظریہ ایشیا میں مقبول ہو رہا ہے، البتہ اگر ان کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریہ کو قبول کر لیں، تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے، کیونکہ کسی نظریہ کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی۔ اس خیال سے کہ بحث تلخ اور طویل نہ ہونے پائے۔ اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ مولانا کا مقصود ان الفاظ سے کیا تھا۔ ان کا جو جواب آئے، وہ آپ مجھے روانہ کر دیجئے۔ مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلائیے کہ میں ان کے احترام میں کسی اور مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں۔ البتہ اگر مذکورہ بالا الفاظ سے ان کا مقصود وہی ہے، جو میں نے اوپر لکھا ہے تو میں ان کے مشورہ کو اپنے ایمان اور دیانت کی رو سے اسلام کی روح اور اس کے اساسی اصولوں کے خلاف جانتا ہوں۔ میرے نزدیک ایسا مشورہ مولوی صاحب کے شایان شان نہیں اور مسلمانان ہند کی گمراہی کا باعث ہوگا۔ اگر مولوی صاحب نے میری تحریروں کو پڑھنے کی کبھی تکلیف گوارا فرمائی ہے تو انہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے اپنی عمر کا نصف حصہ اسلامی قومیت اور ملت کے اسلامی نقطہ نظر کی تشریح و ترجیح میں گزارا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ مجھ کو ایشیا کے لیے اور خصوصاً اسلام کے لیے فرنگی

سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرہ عظیم محسوس ہوتا تھا۔ کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈہ کرنا نہ میرا اس سے پہلے مقصد تھا، نہ آج مقصود ہے، بلکہ وہ شخص جو دین کو سیاسی پروپیگنڈہ کا پردہ بناتا ہے، میرے نزدیک لعنتی ہے[1]

یہ خط علامہ اقبال نے اس وقت لکھا تھا، جب وہ اپنے ان ہی اشعار کی بدولت سب و شتم کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی کی تحقیر و اہانت ان کے پیش نظر نہ تھی، بلکہ ہر حال میں ہر مقام پر ان کا احترام مقدم تھا۔ جواب میں مولانا مدنی نے لکھا: میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سابق پر نظر ڈالی جائے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، یہ اس زمانہ کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ تم کو ایسا کرنا چاہیئے۔ خبر ہے، انشاء نہیں ہے۔ پھر اس سے مشورہ کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے[2]۔ اس خط کی نقل جب علامہ اقبال کو موصول ہوئی، تو انہوں نے حسب ذیل بیان جاری کیا۔

"مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانان ہند کو جدید نظریہ قومیت کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے عقیدت مندوں کے جوش عقیدت کی قدر کرتا ہوں، جنہوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں مجھے گالیاں دیں۔ خدائے تعالیٰ ان کو مولانا کی محبت سے زیادہ مستفید کرے۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا

---

[1] نظریہ قومیت، مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال ص ۳۸ - ۳۹ بحوالہ اُحسان، ۲۰ فروری ۱۹۳۸ء

[2] - نظریہ قومیت، مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال ص ۳۹

کی حمیت دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں گے[1]

مولانا حسین احمد مدنی، علامہ اقبال کے سیاسی معاصرین میں سے تھے۔ مولانا مدنی سے ان کے نظریاتی اختلاف تھے، لیکن ان نظریات کی آڑ لے کر انہوں نے نہ کبھی مولانا کی ذات کو ہدف تنقید بنایا اور نہ ہی کبھی ان کی دینی وجاہت کو چیلنج کیا۔ مولانا مدنی اور علامہ اقبال کے مابین نظریاتی بحث کا تعلق ایک علمی سیاسی و مذہبی موضوع سے تھا اور جب مولانا موصوف نے اس امر کی توضیح کر دی کہ وہ آج کل کے مقبول عام نظریہ وطنیت کو محض بیان کر رہے تھے اور انہوں نے اس نظریہ کو اختیار کرنے کا اسلامیان ہند کو ہرگز مشورہ نہ دیا تھا، تو علامہ مرحوم نے اس بحث کو نہ صرف ختم کر دیا، بلکہ مولانا کے علم و تقویٰ کے تعلق سے اپنے عقیدت مندانہ جذبات کا علی الاعلان اظہار بھی فرمایا — ایک روایت تو یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے مذکورہ بالا اشعار کو شائع کرنے کی ممانعت بھی فرما دی تھی[2] مگر ان کے یہ اشعار آج بھی "ارمغان حجاز" کی زینت ہیں اور نہ ہی ممانعت کی روایت کی تصدیق ملتی ہے۔

اقبال اور سر سکندر حیات

علامہ اقبال کی سیاسی زندگی میں ان کے معاصرین نے کئی بار کوشش کی کہ وہ علامہ کو غیر مشروط طور پر اپنے نظریات کا تابع بنالیں، مگر اقبال، سیاست کے میدان میں اپنے زریں اصول رکھتے تھے۔ وہ شروع ہی سے 'دو قومی نظریہ' کے داعی و علمبردار تھے اور اس نظریہ کی حمایت میں قائد اعظم ایسے عظیم رہنما کی بھی مخالفت مول لے لی، جو ابتدا میں کانگرس میں شامل تھے۔ اقبال کی سیاسی زندگی ان اصولوں کے گرد ہرگز نہ گھومتی تھی جو آئے روز تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ علامہ اقبال کے سیاسی نظریات اٹل اور ٹھوس تھے، وہ برصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن چاہتے تھے اور مسلمانوں کو برصغیر کی دیگر اقوام، جنہیں وہ بعض وزنی دلائل

---

[1] روزنامہ احسان لاہور ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء

[2] اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۲۵۹

کے پیش نظر اقوام بھی تسلیم نہ کرتے تھے، کے مقابلے میں ایک مضبوط اور واضح قوم سمجھتے تھے اور اسلام کی سربلندی و استحکام کے لیے کوشاں تھے۔ علامہ کے سیاسی اصولوں سے جو بھی ٹکرایا، انہوں نے اس طاقت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خواہ وہ طاقت انگریزی ہو یا ہندو کی۔ وہ ایسے مسلمانوں کے بھی مخالف تھے، جو انگریز بہادر کے اشاروں پر ناچتے تھے اور اسلامیان ہند کے جذبات سے کھیلتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اقبال اور سر سکندر حیات میں سیاسی رسہ کشی ہوتی رہی۔ مگر یہ رسہ کشی ذاتی اقتدار اور شخصی منفعت کے لیے ہرگز نہ تھی، بلکہ ایک اصولی مسئلہ کے متعلق تھی۔

میثاق جناح و سکندر کی رو سے طے ہوا تھا کہ سر سکندر اپنی پارٹی کے تمام مسلم ممبروں کو جو اس وقت مسلم لیگ کے رکن نہیں ہیں، مشورہ دیں گے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کے مسلک پر دستخط کر دیں، اس کے بعد وہ ان تمام قواعد و ضوابط کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہونگے، جو آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں نے نافذ کر رکھے ہیں، مگر اس سے یونینسٹ پارٹی کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔" علامہ اقبال یہ سمجھتے تھے کہ سکندر جناح میثاق کی رو سے سر سکندر اور ان کی یونینسٹ پارٹی کے اراکین مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں گے۔ اور سر سکندر اس میثاق کی ایسی تعبیر کرتے تھے کہ جس کی رو سے اقبال کے خیال میں وہ مسلم لیگ پر قابض ہو کر اس کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مسلم لیگ کی تنظیم اور مسلمانوں کا اتحاد ملی علامہ مرحوم کو دل سے عزیز تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ سر سکندر اور ان کی جماعت مسلم لیگ میں شریک ہو جائے، چنانچہ انہوں نے سر سکندر جناح میثاق طے پا جانے سے بہت پہلے مسٹر جناح کی توجہ اس جانب منعطف کرائی۔[1]

سکندر جناح میثاق سے علامہ اقبال نے دل خوش کن توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، لیکن ان کی امیدوں کے برخلاف جب سر سکندر حیات نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار نہ کی، تو علامہ اقبال نے جذباتی سیاست کی بجائے صبر، تحمل اور شائستگی سے کام لیا اور قائد اعظم کو

---

[1] اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۲۵۹

صحیح صورت حال سے آگاہ کرتے رہے" یہ جھگڑا سرسکندر اور علامہ اقبال کے درمیان جاری رہا۔ ۳۱ ؍اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سرسکندر نے اپنے چند رفقاء کو ساتھ لے کر علامہ سے ملاقات کی اور سکندر جناح میثاق کے منشا اور لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے تعلقات کی نوعیت کے متعلق گفتگو بھی ہوئی۔ سرسکندر چاہتے تھے کہ مسلم لیگ پر ان کی پارٹی کو جو حکمران پارٹی تھی برتری حاصل رہے اور علامہ کا منشا یہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کو ہرگز یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اسے عملاً ختم کر دے[۱]" اسی کیفیت اور کشمکش میں کئی ماہ گزر گئے۔ عوام میں یونینسٹ پارٹی اور خود سکندر حیات کے خلاف ایک ہیجان پیدا ہو گیا، تو علامہ اقبال نے ایک بیان مرتب کیا۔ اس موقع پر بھی علامہ اقبال نے شائستہ اور اصولی سیاست کو مدنظر رکھا، وہ چاہتے تو سرسکندر حیات کی زندگی کے بیشتر تضادات کے بارے میں بہت سے پوشیدہ حقائق کو منظر عام پر لا سکتے تھے، مگر انہوں نے یہ انداز فکر ہرگز نہ اپنایا اور بالآخر یہ فیصلہ کر لیا کہ سکندر جناح میثاق ہی کو ختم کر دیا جائے، تاکہ یونینسٹ پارٹی کا سیاسیات میں کوئی دخل ہی باقی نہ رہے اور لیگ ایک آزاد اور زندہ قومی ادارہ بن کر مسلمانوں کی زیادہ خدمت کر سکے۔

اقبال اور ابوالکلام آزاد

علم و فضل کے اعتبار سے علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد بہت بلند مراتب کے حامل تھے۔ دونوں ہمعصر تھے، لیکن دونوں کے نظریات جدا جدا تھے۔ مولانا ابوالکلام جمعیت علماء دہلی کے صدر ہونے کے علاوہ کانگرس کی مجلس عاملہ کے رکن تھے، جب کہ علامہ اقبال مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے صدر رہے۔ علم کے لحاظ سے تو دونوں میں بہت کم فرق تھا، مگر نظریات و سیاسیات کی روشنی میں دونوں میں بعد المشرقین تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطۂ زمین کے مخالف تھے، جب کہ علامہ اقبال کا نظریہ ان کے برعکس تھا۔ بقول اقبال مولانا اور ان کے ساتھی جو راہ اختیار

---

۱ ذکر اقبال ص ۲۰۷

کر چکے تھے، وہ ایسی راہ تھی، جس کو کوئی بھی مخلص اور ایک صحیح العقیدہ سچا مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس شدید اختلاف کے باوجود اور اپنے مسلک پر اس قدر مستحکم الیقان رکھنے کے باوصف حضرت علامہ نے مولانا آزاد پر کبھی زہر خند نہ کیا نثر میں نہ نظم میں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب 'تذکرہ' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا دیباچہ مولوی فضل الدین احمد نے لکھا جو ان دنوں الہلال اور الہلال پریس کے مینجر تھے۔ انہوں نے کہیں اس کتاب میں لکھ دیا کہ ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پھیلا حال جو کچھ سنا ہے، اس کے مقابلہ میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھئے تو سخت حیرت ہوتی ہے، اسرار خودی اور رموز بے خودی فی الحقیقت "الہلال" ہی کی صدائے بازگشت ہیں لیے یہ تحریر اس زمانے میں منظر عام پر آئی، جب اقبال کی شہرت برصغیر پاک و ہند سے نکل کر یورپ کے دور دراز گوشوں میں بھی پھیل چکی تھی 'بانگ درا' کی نظمیں بچے بچے کی زبان پر تھیں۔ نوجوان اقبال کے کلام پر سر دھنتے تھے، بوڑھے ان کے اشعار پر وجد کرتے تھے اور خواص کی محفلوں میں اسرار و رموز پر غور و فکر کیا جاتا تھا۔ گویا اس دور میں جب اقبال کا ستارہ اقبال ہندوستان اور یورپ کے افق پر جگمگا رہا تھا۔ تذکرہ کے دیباچہ نویس نے اپنی مبالغہ آمیز خوش عقیدگی کے اظہار کی خاطر یا تحقیر دیگران کے لیے مذکورہ بالا الفاظ لکھ کر اقبال کی شہرت و عظمت کا کریڈٹ بھی 'الہلال' کو دینا چاہا۔ اقبال اس زیادتی کے باوجود کوئی تلخ حقیقت زبان پر نہ لائے اور نہ ہی مولوی فضل الدین احمد اور مولانا آزاد کو برا بھلا کہا۔ اقبال اگر چاہتے تو ملک کے تمام اخبارات میں ابوالکلام کے متعلق، ان کے نظریات اور ان کی ذات کے بارے میں بہت کچھ طنز و تعریض کر سکتے تھے، مگر وہ خاموش رہے۔ ہاں البتہ انہوں نے اس موضوع کو ابلاغ عامہ کا موضوع بنانے کی بجائے صرف دو ایک نجی خطوط میں ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا۔ عشرت رحمانی کے نام

لے تذکرہ، ابوالکلام آزاد ص ۱۳

انہوں نے اپنے خط میں لکھا :

"آپ کا حسن ظن میری نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ حقیقت میں میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی نسبت دنیائے شاعری سے کچھ بھی نہیں اور نہ کبھی میں نے اس طرف توجہ کی ہے۔ بہر حال آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوں۔ باقی رہا یہ امر کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر پر ہے یا ہونا چاہیئے، اس کے متعلق کیا عرض کروں۔ مقصود تو بیداری سے تھا۔ اگر بیداریٔ ہندوستان کی تاریخ میں مرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں، لیکن مجھے آپ کے اس ریمارک سے بہت تعجب ہوا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابو الکلام صاحب آزاد کے 'تذکرہ' کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ نے جن الفاظ میں محمد علی شوکت علی اور میری طرف اشارہ کیا ہے۔ ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہو گئی ہے، لیکن اگر کسی کو بھی احساس نہ ہو تو اس کا رنج نہیں، کیونکہ اس معاملہ میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں[1]"

حضرت علامہ کو مولانا ابو الکلام آزاد کے تذکرہ کے دیباچہ میں لکھے گئے الفاظ کا جو صدمہ تھا، وہ ان کے مذکورہ خط کی سطور میں پوشیدہ ہے۔ اپنے اس صدمے کو اس خط میں تو انہوں نے مبہم ہی رکھا۔ مگر مولانا سید سلیمان ندوی سے جن سے علامہ کھل کر دردِ دل اور حالِ دل کہہ لیتے تھے، اس ذہنی و قلبی صدمے کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں : مولانا ابو الکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے، مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں، شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر انگریزی

۱۔ مکاتیب اقبال ج ا ص ۲۷۰

وارد ہیں موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں، بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ کہ نام آوری البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، تحریک الہلال نے مجھے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی، مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے، ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا سنا تھا اور سنی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھا، جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، کسی طرح ان لوگوں کے شایان شان نہیں، جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین احمد صاحب کہاں ہیں، ورنہ یہ موخرالذکر شکایت براہ راست ان سے کرتا۔ اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو، تو میری شکایت ان تک پہنچایئے"[1]

علامہ اقبال نے مذکورہ خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کی معرفت، مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ ذاتی طور پر کسی شخصیت سے قدح نہ رکھتے تھے۔ ورنہ یہ تو سیاست کا اصول رہا ہے کہ ہر سیاسی مخالف کو غدار اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا جاتا ہے۔ اقبال کی مخالفت، اپنے سیاسی معاصرین سے خالصتاً نظریاتی نوعیت ہی کی ہوتی رہی۔ اور وہ کسی لحظہ بھی مسلمانوں کے مفاد سے ہٹ کر نہ سوچتے تھے جبکہ ابوالکلام آزاد اور ان کے بعض ساتھیوں کا نظریہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ ایک ہی آزاد وطن میں رہ کر اپنے دین کو فروغ دیں اور اپنے کلچر کو عام کریں۔ اقبال کے نزدیک ہندوؤں میں رہ کر مسلمانوں کے لیے اپنا ملی تشخص برقرار رکھنا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا اور وہ اس معاملے میں کسی قسم کی سودے بازی کو سیاسی غلطی ہی نہیں، ایک گناہ سمجھتے تھے۔

---

[1] مکاتیب اقبال ج ۱ ص ۱۱۰-۱۱۱

اقبال اور پنڈت نہرو

اب تک ایسا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا، جس سے ہویدا ہو کہ پنڈت جواہر لال نہرو سے کبھی علامہ اقبال ملے ہوں۔ پنڈت نہرو، علامہ کے ہمعصر تھے اور ان سے بھی علامہ کی سیاسی چشمک رہی۔ دونوں رہنماؤں کے درمیان افکار و نظریات کی ایک ایسی وسیع خلیج حائل تھی، جس پر کوئی پل نہ بنایا جا سکا۔ علامہ اقبال اور پنڈت جواہر لال نہرو کے سیاسی کردار کا تجزیہ کچھ یوں ہے کہ وہ وطنیت کے سخت دشمن اور یہ اس پر نثار ہونے کے لیے تیار، وہ مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے حامی اور یہ متحدہ قومیت کے علمبردار، وہ مسلم ثقافت و شائستگی کے شارح و ترجمان اور یہ ان اصطلاحات کی معنویت سے یکسر ناآشنا، وہ دین و سیاست کی جدائی کے مخالف، یہ مذہب و سیاست کی تفریق کے قائل، وہ دین کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے اور خدا کی خلوتوں میں کھوئے ہوئے اور یہ مذہب دشمن خدا بیزار، وہ محمدؐ کے فدائی اور یہ مارکس کے شیدائی[۱] ذہن و فکر کے اس بعد کے باوجود اقبال، ہندو لیڈروں میں سے سب سے زیادہ مداح پنڈت جواہر لال نہرو ہی کے تھے۔ وہ پنڈت جی سے محبت بھی کرتے تھے اور ان کا احترام بھی۔

"اسلام اور قادیانیت" کے عنوان سے حضرت علامہ اقبال نے ایک شہرہ آفاق مضمون لکھا تھا، اقبال کے ممدوح پنڈت نہرو نے یہ مضمون پڑھا تو "ماڈرن ریویو" میں اس پر تنقید بھی لکھ بھیجی، جو چھپ گئی۔ علامہ مرحوم نے اس تنقید کے جواب میں ایک اور تنقیدی مضمون "اسلام اور احمدیت" لکھ بھیجا۔ اس مضمون میں انہوں نے پنڈت جی کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

> "میرے لئے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ پنڈت جی کو مشرق بلکہ ساری دنیا کے ایک عظیم الشان مسئلہ سے جو دلچسپی ہے، میں اس کا

۱۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۲۶۹ - ۲۷۰

Speeches and statements of Iqbal, P. III

خیر مقدم کرتا ہوں۔ میری رائے میں یہ پہلے ہندوستانی قوم پرست ہیں جنہوں نے دنیائے اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

اس مضمون میں پنڈت جی کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد اقبال نے اس نکتہ کی وضاحت کی، جو ان کے اور ان کے ممدوح کے مابین مابہ النزاع تھا۔ فرماتے ہیں: میں اس واقعہ کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایک ایسے انسان ہیں، جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں۔ میرا ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ جن سوالات کو وہ سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ تاہم جس طریقے سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے، جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ میں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا، جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصولوں کے مطابق تشریح کی گئی تھی، اس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانان ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل دیا ہے۔ اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمالی مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو۔ میری رائے میں ان کا یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستانی قومیت کے لیے ملک کی مختلف تہذیبوں کو مٹا دینا چاہیئے، حالانکہ ان تہذیبوں کے باہمی عمل و اثر سے ہندوستان ایک ترقی پذیر اور پائیدار تہذیب کو نمو دے سکتا ہے۔ ان طریقوں سے جو تہذیب نمو پائے گی، اس کا نتیجہ بجز باہمی تشدد اور تلخی کے اور کیا ہو گا۔ یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانان ہند کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا یہ مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا۔ کہ پیغمبر عرب کی امت سے ہندوستانی پیغمبر ایک

نئی امت تیار کریں - حیرت کی بات ہے کہ میری یہ کوشش کہ مسلمانانِ ہند کو اس امر سے متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گزر رہے ہیں، اس میں ان کا اندرونی استحکام کس قدر ضروری ہے، اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے جو اسلامی تحریکات کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں۔ پنڈت جی کو یہ موقع دیتی ہے کہ ایسی تحریکوں (احمدیت) سے ہمدردی کریں - بہر کیف میں پنڈت جی کے محرکات کی تحلیل کے ناگوار فرض کو جاری رکھنا نہیں چاہتا[۱] اس ساری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنے ممدوح اور سیاسی معاصر سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی حلیمی، بردباری، میانہ روی، شائستگی اور ہمدردی کا دامن نہ چھوڑتے تھے۔

اقبال کو پنڈت جواہر لال نہرو کے افکار اور سیاسی پالیسی سے اختلاف تھا، لیکن وہ ان کے ایثار، اور ان کی شرافت سے انکار نہیں کرتے تھے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار علامہ نے نجی صحبتوں اور عوامی اجتماعات میں بھی کیا - عبدالرشید طارق رقمطراز ہیں: ایک روز جب کہ میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، بدرالدین بدر اور پنجاب کے مشہور شاعر بابو کرم سراج الدین نظامی اور دو ایک دوست ان کے پاس بیٹھے تھے، تو کانگرس اور مسلم لیگ کا تذکرہ چھڑا، نئے انڈیا ایکٹ کے نفاذ کی آمد آمد تھی اور کوشش ہو رہی تھی کہ مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کیا جائے - ہم میں سے کسی نے کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو اچھے خاصے مخلص کارکن ہیں اور دل سے خواہاں ہیں کہ مسلمان بھی کانگرس کے دوش بدوش جہادِ حریت میں شریک ہوں۔ آپ فرمایئے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ہاں جواہر لال مخلص ہیں، کانگرس ساری مخلص نہیں وہ خالص ہندوؤں کی جماعت ہے، اس لئے ہر حال میں ان ہی کے حقوق اور مفاد کو مدِ نظر رکھتی ہے - اگر مسلمان الگ ہو کر کانگرس میں شامل ہوں تو ملت اور اس کے مفاد سے غداری کریں گے، اپنی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کریں گے - یہ بات نہ ہونی چاہیئے۔ مسلمانوں کو اپنی سیاسی شخصیت کو کسی صورت میں بھی نہ

---

[۱] Speeches and Statements of Iqbal, P.112-113.

کھونا چاہیئے اور انہیں یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ جب تک کانگریس بحیثیت قوم کے ان کے سیاسی وجود کو تسلیم نہ کرلے، اس میں ہرگز شامل نہ ہوں اور علیحدہ رہ کر اپنے حقوق آزادی کے لیے لڑیں[۱]" اقبال فی الواقعی مسلم لیگ کو برصغیر میں مسلمانوں کی حقیقی سیاسی جماعت تصور کرتے تھے، اس لئے پنڈت نہرو کی قدر کرنے کے باوجود وہ کانگریس کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھے - جو مسلمانوں کی آزادی کے خلاف ہو۔

علامہ اقبال کو پنڈت جواہرلال نہرو کی سیاسی پالیسی سے جس قدر سخت اختلاف تھا، اتنی ہی کشادہ دلی کے ساتھ وہ نہرو کے خلوص کی قدر کرتے تھے۔ اس کا اظہار علامہ نے عوامی سطح پر بھی کیا۔ ایک بار فرمایا۔ "مجھے پنڈت جواہرلال نہرو سے ملنے کی مسرت حاصل نہیں ہوئی، تاہم میں نے ہمیشہ ان کے خلوص اور ان کی صاف گوئی کی قدر کی ہے۔ انہوں نے حال ہی میں اپنے مہاسبھائی ناقدروں کے جواب میں جو بیان شائع کرایا ہے۔ اس میں ایک ایسے خلوص کا پتا چلتا ہے، جو ہندوستان کے موجودہ سیاستدانوں کے اعلانات میں بہت کم دکھائی دیتا ہے[۲]۔"

جواہرلال نہرو کی شخصیت بھی ایک طرح سے تضادات کا مجموعہ تھی۔ وہ مذہب سے بیزار اور خدا کے منکر ہونے کے باوجود، گاندھی جی کی مذہبی رسومات میں شریک اور ان کی روحانیت کے قائل تھے۔ بقول محمد احمد خاں "اشتراکی ہونے کے باوجود انہوں نے ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو والی تحریک کو اسٹالن گراڈ کے تحفظ پر ترجیح دی اور ہندوستان کی آزادی کو ساری دنیا کی اشتمالی وجمہوری قدروں کے مقابلہ میں زیادہ عزیز رکھا۔ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی کانگریس کے رجعت پسند عناصر کو اپنے ساتھ لئے رہے، اس تضاد کے باوجود ہر ہندوستانی اور ہر ترقی پسند انہیں محبوب رکھتا ہے۔ مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کو انہوں

---

[۱] ملفوظات اقبال ص ۲۱۶

[۲] Speeches and statements of Iqbal P.208.

نے کبھی تسلیم نہیں کیا، مسلم ثقافت و تہذیب ان کے نزدیک ہمیشہ بے معنی اصطلاحات رہیں، حتیٰ خود اداریت کے بھی وہ بڑی حد تک مخالف ہی رہے[۱]" لیکن ان رجحانات کے باوجود ان کی عزت و ہر دلعزیزی کا راز ان کی دلنوازانہ شخصیت میں مضمر تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی نے بہت سے سالار، کئی سرفروش مجاہد اور جانباز پیدا کئے۔ اور پنڈت نہرو بھی تحریک آزادی ہند کے اولین رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ اقبال ان سے نظریاتی اختلافات رکھنے کے باوجود ان کے خاندان، خدمت وطن اور ذوق آزادی کے مداح تھے۔' جاوید نامہ میں انہوں نے نہرو اور اس کے خاندان کی مدح دستائش میں جو اشعار کہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان نہرو کے کسی اور رکن سے زیادہ علامہ کے پیش نظر جواہر لال کی شخصیت تھی۔ فرماتے ہیں ؎

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد؟
صید را سودائے صیادی کہ داد؟

ہند کو ذوق آزادی کس نے بخشا؟ غلامی کی زنجیروں کو ریزہ ریزہ کرنے کی جرأت کس نے دلائی ؎

آں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالۂ احمر ز روئے شاں خجل

برہمن زادوں نے جن کے دل زندہ ہیں اور چہرے سُرخ ہیں۔ پنڈت نہرو کی مدح دستائش کا ایک پہلو تو یہ بھی تھا کہ اس وقت ہندو، پنڈت نہرو اور بعض دوسرے ہندو لیڈروں کی قیادت میں بیدار ہو چکے تھے، اِدھر مسلمان تھے کہ وہ گرد ہی سیاست کا شکار تھے اور اپنوں ہی کی ستم رانیوں سے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ اقبال جہاں سوئے ہوئے مسلمانوں کی حالت پر افسوس کرتے تھے۔ وہاں پنڈت نہرو کے ذوق آزادی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ: تحریک آزادی میں پیش پیش کون برہمن زادے تھے؟ گاندھی جی! وہ تو بنیئے تھے۔ مالویہ جی! ہاں وہ تو برہمن تھے، لیکن کیا وہ لالہ رخ تھے؟ راجہ جی! وہ بھی تو برہمن تھے۔ لیکن ذرا آگے چلیئے، آزادی ہند کے اس ہیرو کی

---

[۱] اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۲۷۴

اور خصوصیات بھی تو شاعر گناتا ہے ؎

تیز بین و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش

ہم آزادی کا یہ سپہ سالار کیسا ہے؟ وہ تجربہ کار ہے، جیلوں کی سختیاں اس نے جھیلی ہیں، پولیس کی لاٹھیاں اس نے کھائی ہیں، فوجوں کی سنگینوں کے سامنے اس نے اپنے سینے کو پیش کیا ہے! پھر اس کی نگاہ تیز ہے اور اس تیز نظر سے وہ "فرنگی" کو بھی شکار کرلیتا ہے۔ مالویہ جی اور راجہ جی پختہ کار بھی ہیں اور سخت کوش بھی، لیکن انگریز کب ان سے تلملا اٹھا۔ ان کی میانہ روی اور اعتدال پسندی کا تو وہ ہمیشہ معترف ہی رہا۔ انقلاب کی ہوا بھی انہیں چھو کر نہ گئی! پھر آزادی کی اس برات کا دلہا کون ہے؟ آگے چلیئے فرماتے ہیں :؎

اصلِ شاں از خاکِ دامن گیرِ ماست
مطلعِ ایں اختراں کشمیرِ ماست

محاذ حریت کا سپہ سالار مہم آزادی کا رہبر برہمن زادہ ہے، اس کا چہرہ سرخ و سفید ہے۔ وہ پختہ کار بھی ہے اور سخت کوش بھی۔ وہ ایسا انقلابی ہے کہ اس کی نگاہ سے بزم فرنگ میں ہلچل مچ جاتی ہے اور اس کا تعلق خاک کشمیر سے ہے! سر تیج بہادر سپرو برہمن زادے بھی تھے اور کشمیری بھی، ان کا چہرہ سرخ و سفید تھا اور ان کا ذہن پختہ کار لیکن سخت کوشی اور انقلاب سے ان کو کیا تعلق؟ اقبال کی نظر میں آزادئ ہند کا راہبر راجکوٹ کا گاندھی، یوپی کا مدن موہن، مدراس کا راج گوپال اور الہ آباد کا تیج بہادر نہیں، بلکہ کشمیر کا جواہر لال ہے۔

اقبال اور جواہر لال دونوں برہمن زادے ہیں۔ دونوں کشمیری نژاد ہیں۔ یہ وجہ نہیں ہے کہ اقبال نہرو جی کو اتنا عزیز رکھتے ہیں، بلکہ نہرو کی شخصیت میں انہیں وہ آفاقی (Internationalist) نظر آتا ہے، جو اقبال کو بہت محبوب ہے۔ کردار کی خوبیوں کے علاوہ پنڈت جی کے ذہن کی بعض خصوصیات سے بھی وہ

متاثر نظر آتے ہیں اور یہ ذہنی سرمایہ دونوں میں مشترک ہے ۔ دونوں میں وسعت قلب ونظر ہے، دونوں صحیح آفاقیت (اور سچی) انسانیت کے قائل ہیں، دونوں ایشیا کی بیداری کے دل سے خواہاں ہیں، دونوں سرمایہ داری کے پکے مخالف اور ایک نظام نو کو برسرکار دیکھنے کے متمنی! اگر اقبال اور نہرو میں مفاہمت ہو جاتی، اگر ان کے ذہنوں کی درمیانی خلیج پر کوئی پل بنایا جا سکتا، تو اس برعظیم کے مستقبل کی تاریخ کیا ہوتی؟ برعظیم کے مستقبل کی تاریخ واقعی مختلف ہوتی، مگر یہ ناممکن تھا کہ پنڈت نہرو متحدہ قومیت کے مسلک کو چھوڑ دیتے یا مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطہ زمین کے مطالبہ کو دل سے مان لیتے اور نہ ہی یہ ممکن تھا کہ اقبال مسلم ثقافت و شائستگی کے شارح و ترجمان ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کی آزادی کے لیے جدوجہد کو تج دیتے ۔ اقبال مسلمانان ہند کے حقیقی خیر خواہ تھے اور اسلام اور برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کی خاطر وہ ایک کشمیری برہمن زادہ تو کیا، ہزاروں کشمیری برہمن زادوں کی دوستی اور تعلقات کو قربان کر سکتے تھے، اس لئے کہ وہ ملت اسلامیہ کے سچے ہمدرد تھے ۔ ان کی سیاست بھی اسلام کے منفرد اور زریں اصولوں کے گرد گھومتی تھی ۔

اقبالؔ اور قائد اعظمؔ

دو قومی نظریہ اور مسلم لیگ میں شمولیت کے معاملے میں علامہ اقبال، قائد اعظم محمد علی جناح سے سینئر تھے ۔ جیسا کہ بتایا جاتا ہے کہ جس زمانے میں علامہ اقبال برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے اجتماعی مفاد اور دو قومی نظریہ کی حمایت کر رہے تھے، اس وقت قائد اعظم کانگریس کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے برسرکار تھے ۔ پھر وہ وقت بھی آیا ۔ جب مسلمانوں کی سیاسی خدمات کے معاملات میں قائد اعظم، اقبال سے سبقت لے گئے اور انہوں نے شاعر مشرق کے خواب کو سچ کر دکھایا ۔ جناح اور اقبال، پیشے کے اعتبار سے دونوں بیرسٹر تھے ۔ دونوں نے مغربی تعلیم حاصل کی اور طبعاً جذباتی ہونے کی بہ نسبت اعتدال پسند واقع ہوئے تھے ۔ ان مشترک قدروں کے باوجود دونوں کے مابین ایک عرصہ تک سیاسی

اختلافات بہے اور شدید رہے ، ۱۹۲۷ء میں دہلی میں مسلم زعما کا اجلاس ہوا اور تجاویز دہلی منظور کی گئیں تو قائداعظم نے ان تجاویز کی تائید کی ، مگر اقبال ان تجاویز کے حق میں نہ تھے۔ ان کی رائے تھی کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کے حق سے کسی صورت بھی دستبردار نہ ہوں۔ اس سے اگلے سال سائمن کمیشن کا قیام عمل میں آیا تو قائداعظم کمیشن کے سخت مخالف اور اس کا بائیکاٹ کرنے والوں کی صف اول میں شامل تھے ، لیکن علامہ اقبال ، سر شفیع کے ہمراہ کمیشن سے ہر حال میں تعاون کرنے والوں کے گروہ میں شامل تھے۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ شائع ہوئی۔ قائداعظم اس رپورٹ کو چند ترمیمات کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ تھے ، مگر اقبال کا کہنا تھا کہ نہرو رپورٹ کو کلیتاً دریا برد کر دیا جائے۔ پھر ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال نہرو رپورٹ کے خلاف آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا متحدہ محاذ بنانے میں پیش پیش اور قائداعظم آل پارٹیز کنونشن میں اپنی ترمیمات مسترد کیے جانے پر پریشان اور خاموش تھے۔ ۲۱ جولائی ۱۹۲۹ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی مشہور قرارداد مرتب کرنے میں اقبال نے دن رات ایک کیا ، جب کہ ابھی قائداعظم اس وقت کوئی حتمی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔

برصغیر کے سیاسی حالات گواہ ہیں کہ ۱۹۲۹ء تک قائداعظم اور اقبال دو متضاد سیاسی مکاتیب خیال سے تعلق رکھتے تھے اور دونوں اپنے اپنے مسلک کو عوام میں مقبول اور حکومت سے تسلیم کرانے کی جدوجہد میں شریک تھے۔ اسی سال قائداعظم نے اپنے سیاسی مسلک کو بدل کر آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نقطۂ نگاہ کو قبول کر لیا اور اپنے مشہور و معروف چودہ نکات کو پیش کیا تو اقبال اور قائداعظم کے سیاسی عقائد ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ قائداعظم اور اقبال نے باہم مل کر مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں کو متحد کرنے کی کوشش کی ، مگر خاطر خواہ کامیابی کے آثار نہ دیکھ کر قائداعظم نے بددل ہو کر ترک سکونت کر لی اور ہندوستان سے لندن جا کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ علامہ اقبال گو فطرتاً عزلت نشین تھے ، تاہم وہ قائداعظم کو واپس وطن لانے میں گہری سوچ بچار کرتے رہے ، اسی دوران میں قائداعظم انگلستان سے ہندوستان تشریف لائے اور قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کے مضرت رساں اثرات سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے مسلمانوں کو تنبیہہ کی کہ وہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے

جمع ہوں اور ایک ہو کر اپنے دشمنوں کا مقابلہ کریں - علامہ اقبال نے قائداعظم کے اس مستحسن اقدام کی تائید کی اور فرمایا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم لیگ کو ان حالات میں زیادہ سے زیادہ فعال بنایا جائے۔

۱۹۳۶ء کے انتخابات میں ملت اسلامیہ کی وحدت کو برقرار اور مستحکم کرنے کے لیے قائداعظم کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ ہر صوبہ میں قائم ہو۔ لیکن ان کی یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی، پنجاب میں سر فضل حسین نے اس درخواست کو ٹھکرا دیا۔ مگر اقبال نے ببانگ دہل قائداعظم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کی صوبہ میں تشکیل کا اعلان فرمایا اور نہ صرف اس دور ہی میں، بلکہ دم واپسیں تک تمام سیاسی معاملات میں خواہ وہ پنجاب سے متعلق ہوں یا ان کا تعلق کل ہند مسائل سے ہو، قائداعظم کو مسلسل مشورے دیتے رہے اور ان کے احکامات کو تسلیم کرتے رہے۔

"۱۹۳۷ء-۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر صاحب مسلسل بیمار اور ضعف بصارت اور پیرانہ سالی کے باوجود بستر علالت پر لیٹے لیٹے ہی خاموشی کے ساتھ مسٹر جناح کو لگاتار اس امر پر آمادہ کرتے رہے کہ وہ نظریہ اسلامی ہند کو تسلیم کر کے اس کو مسلمانوں کا ایک متحدہ مسلک اور مطالبہ بنا دیں - مسٹر جناح کو خاص طور پر اس طرف متوجہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت کی روشنی میں یہ دیکھ لیا تھا کہ مسٹر جناح ہی وہ واحد عملی سیاستداں ہیں، جو ان کے اس نظریہ کو جامۂ عمل پہنا سکتے ہیں"[1]

قائداعظم کی ذات پر علامہ اقبال کو مکمل اعتماد تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ قائداعظم ہی ان حالات میں مسلمانوں کے نجات دہندہ بن سکتے ہیں۔ اسی مقصد کی خاطر انہوں نے بھرپور کوشش کی کہ قائداعظم، لندن سے واپس ہندوستان چلے آئیں اور مسلمانوں کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد پر پہنچا دیں۔ قائداعظم کو یوں تو برصغیر کے سیکڑوں مسلمانوں نے بالعموم اور زعماء نے بالخصوص خطوط لکھے تھے اور تار ارسال کئے تھے، لیکن وہ اسلامیان ہند کے رویہ سے دل برداشتہ ہو چکے تھے، اس لئے خاموش رہے۔ اسی دوران جب

---

[1] اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۲۶۷

انہیں اقبال کا پیغام ملا، تو ان کی خاموشی کو زبان مل گئی اور انہوں نے واپس آکر برصغیر کے مسلمانوں کی رہبری کا فیصلہ کر لیا۔ قائداعظم کے متعلق اقبال کے جذبات کس قسم کے تھے، اس کا اندازہ جناح اقبال خطوط سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو اقبال نے حضرت قائداعظمؒ کو ایک خط ارسال کیا تھا، جس کا متن یہ ہے:

مائی ڈیر مسٹر جناح

آپ کے اس خط کے لیے بہت بہت شکریہ، جو مجھے کل ہی وصول ہوا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک بہت ہی مصروف انسان ہیں، لیکن میں ساتھ ہی یہ توقع بھی رکھتا ہوں کہ آپ کو میری بار بار کی مراسلت ناگوار خاطر نہ ہوگی، کیونکہ ہندوستان میں آج آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں۔ جس کی ذات سے مسلم جماعت اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں آرہا ہے، محفوظ رہنمائی کی توقع کرنے کا حق رکھتی ہے[لہ]

آج اقبال کے بدترین مخالف بھی، ان کی سیاسی بصیرت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کا یہ ایمان ہے کہ اگر جون ۱۹۳۷ء میں اقبال، قائداعظم کے مورال کو بلند نہ کرتے، تو شاید پاکستان کے قیام کا منصوبہ ادھورا رہتا۔ تاریخ کے واقعات شاہد ہیں کہ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء سے لے کر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء تک قائداعظم کے نام اقبال کے خط سے لے کر قرارداد پاکستان کی منظوری تک قائداعظم محمد علی جناح کے قلب و ذہن میں ایک انقلاب برپا رہا اور " اس انقلاب کے پیدا کرنے اور اس کو پروان چڑھانے میں پس پردہ علاوہ دیگر عوامل کے اس دانائے راز کی شخصیت بھی کارفرما تھی، جس کو مخالفوں نے بے عمل سیاستدان، ٹوڈی اور رجعت پسند مشہور کر رکھا تھا" اس کا بین ثبوت، خود قائداعظم کا اعتراف ہے جو انہوں نے اقبال کے خطوط مطبوعہ ۱۹۴۳ء کا پیش لفظ تحریر کرتے ہوئے کیا۔ قائداعظم نے فرمایا:

لہ Letters of Iqbal to jinnah, P. 18

"یہ خطوط بڑے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں بخصوصاً وہ خطوط جن میں انہوں نے مسلمانانِ ہند کے سیاسی مستقبل کے متعلق واضح و غیر مبہم الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کے خیالات بنیادی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ہندوستان، جن دستوری مسائل سے دوچار تھا، ان کے محتاط تجزیہ اور مطالعہ کے بعد ان ہی خیالات نے مجھے اس نتیجہ کی طرف رہبری کی اور کچھ عرصہ کے بعد یہی خیالات مسلمانانِ ہند کی اس متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے، جس کا آغاز کل ہند مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء والی منظور شدہ قرارداد لاہور میں کیا گیا تھا اور جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہے[1]"

قائداعظمؒ خود اقبال کی عظمت کے معترف تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے جہاں شاعرِ مشرق کی زندگی میں کیا، وہاں ان کے انتقال کے بعد انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ قائداعظمؒ نے اقبال کی رحلت پر فرمایا: وہ میرے ایک دوست رہنما اور فلسفی تھے اور ان تاریک ترین لمحات میں بھی جن میں سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا، وہ ایک چٹان کی مانند جمے رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی اس موقف سے پیچھے نہ ہٹے[2]۔ ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یوم اقبال کی صدارت کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لیے زندہ رہوں اور اس وقت مجھ سے کہا جائے کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیس اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف اقبال کی تصنیفات ہیں۔ تم دونوں میں سے ایک چیز چن سکتے ہو، تو میں اقبال کی تصانیف کو ترجیح دوں گا[3] اقبال کو قائداعظم کا اس سے بڑھ کر اور کیا خراج تحسین ہو سکتا تھا۔ آج دنیا ان دونوں قائدین کی سیاسی

۱۔ پیش لفظ اقبال کے خطوط، از قائداعظم

2. Iqbal His art and Thought, P. 21.

۳۔ روزنامہ ڈان ۲۷ مارچ ۱۹۴۰ء

صلاحیتوں کی معترف ہے۔

سیاسی زندگی کا تجزیہ

اقبال کا دور سیاست ایک لحاظ سے اقبالی سیاست ہی کا دور تھا۔ شعروادب کے میدان میں بھی اس دور میں علامہ اقبال نے نوجوان نسل پر جو اثرات مرتسم کئے وہ ایسے نہ تھے کہ آسانی سے محو کیے جا سکتے۔ ان اثرات کی تازگی اور ان کے نقوش آج بھی چمک دمک رہے ہیں۔ ان اثرات و نقوش کا احاطہ مشکل اور ناممکن ہے۔

ناقدین کی رائے میں اقبال ایک خوش نصیب شاعر اور بدنصیب سیاست دان تھے۔ مشاہیر کو ہمیشہ ان کی زندگی ہی میں مدح و قدح سے سابقہ رہا ہے۔ اسی لیے شاید ناقدین نے اقبال کو بدنصیب سیاستدان کے نام سے یاد کیا ہے، مگر یہ خطاب' اقبال کے ساتھ ایک صریحاً زیادتی ہے۔ جن بزرگوں نے قائداعظم، اقبال اور تحریک پاکستان کا جوش وخروش اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ اقبال کو بدنصیب سیاستدان کہنے کی بجائے 'مصورِ پاکستان' کے خوبصورت خطاب سے یاد کرتے ہیں اور اقبال کو بدنصیب سیاستدان کہنے والے وہ فردِ جرم پیش کرتے ہیں' جو علامہ کی زندگی ہی میں ان پر لگ چکی تھی۔ اس فردِ جرم کے مطابق اقبال انگریز کے دوست، وطن کے دشمن، سرمایہ دار کے حامی، غریبوں کے مخالف' فرقہ پرست، ٹوڈی، رجعت پسند اور نہ جانے کیا کیا تھے؟

• علامہ اقبال نے جس زمانہ میں سیاسیات کی خارزار وادی میں قدم رکھا، جذبات کا ایک تلاطم برپا تھا۔ اسی جذبات کی رو میں ان پر انگریز دوستی کا الزام عاید کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ: جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی نہیں تھی اور ان کے کمالات بھی غیر معمولی تھے۔ وہ آسمانِ حکمت و فلسفہ، شعر و سخن، تحریر و تقریر، دل و دماغ و دیگر کمالات علمیہ و عملیہ کے درخشندہ آفتاب تھے، مگر باوجود کمالات گوناگوں ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے[1] علامہ اقبال کی انگریز دوستی اور برطانوی استعمار کی اطاعت کے ثبوت میں

---

[1] متحدہ قومیت اور اسلام، مولانا مدنی ص ۷

جو سب سے بڑی اور مضبوط دلیل دی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے انگریز سرکار کی جانب سے اس زمانے میں سر کا خطاب قبول کر لیا، جب کہ انگریز حکومت کے دیئے گئے خطابات کو واپس کرنے اور آئندہ سے خطابات نہ لینے کی تحریک جاری تھی۔ ان حالات میں جب اقبال کو مجبور کیا گیا کہ وہ سر کا خطاب قبول کر لیں، تو اقبال کے خلاف اخبارات میں طنز و تعریض کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے حضرت علامہ کی ہجو میں اشعار لکھے اور انہیں طعنہ دیا کہ وہ نائٹ ہڈ کا خطاب قبول کر کے اپنی جرأت و بیباکی کا گلا خود اپنے ہی ہاتھوں سے گھونٹ دیں گے۔ اس کے برخلاف اقبال نے میر غلام بھیک نیرنگ کے مراسلے کے جواب میں وضاحت کی:

"سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی، جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی، جس کے ذریعہ سے مجھ کو خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں، اس کا دل مومن ہے[1]"

اس خط سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اقبال اس قسم کے خطابات کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اور دوسرے یہ کہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق سے باز رہنے پر مجبور نہ کر سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے میں برطانوی حکومت نے خطاب دیا تھا، اس سے قبل اقبال کی علمی شہرت یورپ کے دور دراز گوشوں میں پھیل چکی تھی، ان کی قابلیت کا سکہ انگلستان کے علمی اداروں پر بیٹھ چکا تھا، ان کے فلسفہ اور شاعری کا ڈنکا مشرق و مغرب میں بج رہا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں پروفیسر نکلسن نے اسرار خودی کا ترجمہ شائع کیا اور اس کے بعد ہی یورپ کے مشہور اہل علم ڈاکٹر صاحب کے پیام و کلام کی طرف متوجہ ہو گئے، چنانچہ مشہور نقاد ادب مسٹر اے ایم فارسٹر نے انگلستان کے نامور و مقبول ادبی جریدہ اینتھم میں مثنوی پر ایک مفصل تنقید شائع کی۔ پھر کیمبرج کے پروفیسر ڈکنس نے رسالہ نیشن (NATION)

---

[1] مکاتیب اقبال ج ۱ ص ۲۰۶

ہفتہ وار میں ایک تبصرہ لکھا[۱] الغرض اسرار خودی کے ترجمے اور اس پر تنقید و تبصرہ کی وجہ سے اقبال کی شہرت و عزت ممالک اسلامیہ اور یورپ کے علمی و ادبی حلقوں میں پھیل چکی تھی۔ اس عالم گیر شہرت و عزت کی بنا پر اقبال کو سر کا خطاب دینے پر انگریز حکومت مجبور تھی کہ وہ اپنے اور خطابات کی لاج رکھ سکے۔ بقول مرزا جلال الدین بیرسٹر: گورنمنٹ کی طرف سے آپ کے روبرو خان بہادر کے خطاب کی تجویز پیش کی گئی، جسے آپ نے ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد شمس العلماء کی تجویز ہوئی، اسے بھی آپ نے رد کر دیا۔ بالآخر نائٹ ہڈ کی تجویز ہوئی، اس کے قبول کرنے میں بھی آپ کو تامل تھا لیکن آپ نواب ذوالفقار علی کے اصرار پر وہ اس پر رضامند ہو گئے۔[۲] صرف یہی نہیں، بلکہ آپ نے یہ شرط بھی عاید کر دی کہ میں خطاب صرف اس صورت میں قبول کر سکتا ہوں، جب کہ میرے استاد کو اول شمس العلماء کا خطاب دیا جائے گورنمنٹ کو اس شرط کے ماننے میں تامل تھا، اس لیے کہ علامہ میر حسن مرحوم باایں ہمہ علم و فضل کسی غیر معمولی شہرت کے مالک نہیں تھے، لیکن اقبال نے اپنی یہ شرط بھی پوری کرا ہی لی اور اپنی نائٹ ہڈ کے ساتھ مولوی صاحب کو بھی شمس العلماء بنوا دیا۔[۳] یہ ایک بیّن ثبوت ہے کہ اقبال کسی خطاب کے خصوصاً انگریز سرکار کی طرف سے کسی عنایت کے طلبگار ہرگز نہ تھے۔

سر کا خطاب کے بعد

اقبال کی سیاسی زندگی ایک صاف و شفاف آئینے کی طرح سب کے سامنے ہے۔ شاعر مشرق کے مخالف بھی اس آئینے میں جھانکتے ہیں، تو انہیں مصور پاکستان کا چہرہ معصوم اور بے داغ نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ اقبال نے دوسروں کی خطاب کی تمنا کی نہ برضا و رغبت قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اور نہ ہی انہوں نے سر کا خطاب پانے کے بعد انگریز حکومت سے مسلمانوں کے مفادات پر کوئی سودے بازی کی۔ اقبال کے نظریات جو خطاب

۱؎ اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۱۸۳

۲؎ ملفوظات اقبال ص ۸۰

۳؎ سیرت اقبال، محمد طاہر فاروقی ص ۱۶

سے پہلے تھے۔ وہ بعد میں بھی قائم رہے۔ بلکہ مسلمانوں کے مطالبات کے سلسلے میں ان کے لب و لہجے میں حکومت کے ساتھ مذاکرات یا مفاہمت کے معاملات میں تلخی و ترشی آتی چلی گئی اور ایک وقت میں انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ برطانوی حکومت کو مسلمانوں کو آزادی دینا ہی پڑے گی۔ اور میں مسلمانوں کے اس مطالبہ پر کسی قسم کی سودے بازی نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی دو قومی نظریہ سے دستبردار ہوں گا۔

اقبال کی سیاسی زندگی کے خد و خال بڑے نمایاں تھے۔ ان کی سیاست ہنگامہ آرائی، شور و شغب، جوش و خروش، جلاؤ گھیراؤ، توڑ پھوڑ اور منفی ردعمل سے کوسوں دور تھی۔ ان کے ہاں نہ جلسوں کی ہمہ ہمی تھی، نہ جلوسوں کی فراوانی، دھواں دھار تقریریں نہ وقت بے وقت کی بیان بازیاں، اتحاد سازیاں اور نہ احتجاجی مظاہروں کا رنگ و عمل تھا۔ وہ زندہ باد اور مردہ باد کے نعروں کو بھی بہت کم اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے جب بھی اظہار خیال کیا، نہایت دھیمے لہجے میں، بردباری حلیمی اور صبر و استقلال سے مسلمانوں کا موقف پیش کرتے رہے۔ ان کی سیاست ادنیٰ طرز کی ڈپلومیسی، سطحی نوعیت کی چالبازی، ذلیل قسم کی سودے بازی اور ہیچ انداز کی سازشوں سے بلند اور بہت بلند تھی۔ انہوں نے ذاتی مفاد کی خاطر کوئی جماعت بنائی اور نہ کسی جماعت میں شریک ہوئے۔ مسلم لیگ کے شفیع گروپ میں ان کی شرکت محض اصولی اور مشترکہ قومی مقاصد کے لیے تھی۔ یہ گروپ گو اپنی رجعت پسندی اور سرکار نوازی کے لیے بدنام تھا، لیکن علامہ اقبال کے بدترین مخالفین بھی ان پر اس نوع کا الزام نہیں لگاتے کہ کبھی انہوں نے اس گروپ کی وساطت سے ذاتی منفعت حاصل کی ہو۔ مرزا جلال الدین بیرسٹر کے بقول: "اقبال پنجاب کونسل کی رکنیت کے لیے اس لئے آمادہ ہو گئے تھے کہ اس زمانے میں کونسل کی رکنیت کو ذاتی ترقی کا ایک زینہ سمجھا جاتا تھا[1] لیکن عجیب اتفاق ہے کہ وہ کونسل کے رکن ہو کر بھی ذاتی ترقی کے لیے کوشاں نہ ہوئے، بلکہ ہر لمحہ مسلمانوں اور غریب عوام کی فوز و فلاح اور بہتر مستقبل کی خاطر صرف کیا۔

---

[1] ملفوظات اقبال ص ۶۵

سیاست میں سو مصلحتیں اور درپردہ سازشیں بھی ہوتی رہتی ہیں، لیکن اقبال کی سیاست ان مصلحتوں اور سازشوں سے مبرّا تھی۔ وہ ایسے فقیر منش سیاستدان تھے، جو لگی لپٹی رکھے بغیر حق بات سب کے سامنے کہہ دیتے تھے۔ جوڑ توڑ انہوں نے کسی سے سیکھا تھا اور نہ وہ اس "فن" سے آگاہ تھے۔ بہت سے زعماء نے سیاسی شطرنج کی بازی میں ان کی سادہ لوحی اور سادگی سے انہیں ہرانا چاہا، مگر اقبال اس جوڑ توڑ کی سیاست سے بے نیاز تھے، وہ ایسے سیاستدان نہیں تھے، جو دوسروں کو نیچا دکھا کر اور سیاسی مہرے بدل کرکے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنے سوا اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ اگر اقبال جوڑ توڑ کی سیاست روا رکھتے اور سیاسی سازشوں میں مصروف ہو جاتے، تو پھر قائداعظم کو کبھی آگے آنے اور انہیں ملت کی باگ ڈور سنبھالنے کا مشورہ نہ دیتے۔ اقبال کی یہی سیاسی فکر انہیں، ان کے سیاسی معاصرین سے تمیز کرتی ہے اور ان کے بلند مرتبت ہونے کی دلیل ہے۔

اقبال کا پاکستان

حصول پاکستان کی کہانی یوں تو محمد بن قاسم سے شروع ہوتی ہے اور قائداعظم پر آکر ختم ہوتی ہے، لیکن اس کہانی کا نقطۂ عروج، زمانے کا وہ ماحول ہے، جب اقبال نے تصور پاکستان پیش کیا اور اپنے دسمبر ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد میں واضح طور پر فرمایا کہ ہندوستان کی سیاسی گتھی سلجھانے کا واحد حل یہ ہے کہ جب تک ہندوستان کو دو خطوں "مسلم انڈیا" اور "ہندو انڈیا" میں تقسیم نہیں کر دیا جاتا۔ شاعر مشرق نے مزید کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے، کیونکہ ہندوستان کے لاینحل سیاسی تنازعات کا واحد حل یہی ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی نمایاں اکثریت ہے، خصوصیت سے ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کے چار صوبے پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو برصغیر ہند سے علیحدہ کرکے یہاں ایک آزاد اسلامی مملکت قائم کر دی جائے۔

علامہ اقبال کے خطبہ صدارت میں اس قدر جامعیت اور حقیقت مضمر تھی کہ اسلامیان ہند یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اس تقسیم کو کس طرح معرض وجود میں لایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس

سلسلے میں مسلم لیگ نے واضح طور پر اپنا لائحہ عمل طے کیا اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبال کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی خاطر لاہور کے تاریخی میدان اقبال پارک میں قرار دادِ پاکستان منظور کرنے کے بعد برصغیر کے گوشے گوشے سے تحریک آزادی کی عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ یہ جدوجہد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس جدوجہد میں اقبال نے عملی اور روحانی طور پر جو کردار ادا کیا، اس کی داستان بڑی فکر انگیز اور طویل ہے اور اس کا ایک ایک لفظ ایمانی قوت کا آئینہ دار ہے۔[1]

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے اقبال اور تحریک پاکستان، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

اقبال
کا
سفرِ آخرت

مسلمانوں کی سیاسیات سے حضرت علامہ اقبال کے شغف کا عالم یہ تھا کہ آپ آخری دم تک دو قومی نظریہ اور اسلامیان ہند کے سئے ایک علیحدہ مملکت کے حصول کی خدمت میں مصروف رہے۔ فکر و شعر کی کیفیت یہ تھی کہ حیات کے آخری دو برس "ارمغان حجاز" کی ترتیب میں بسر ہوئے اور چودھری محمد حسین ایم اے اور سید نذیر نیازی، مختلف نظموں اور رباعیوں کو آپ کی صوابدید کے مطابق مرتب کرتے رہے۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ آپ حجاز جانے کا عزم صمیم کر چکے تھے، یہاں تک کہ آپ نے سفر حجاز کے تمام انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ جب مسولینی کو آپ کے عزم حجاز کا علم ہوا، تو اس نے اپنے کارکنوں کو حکم دے دیا کہ اقبال جب بحیرہ احمر میں داخل ہوں، تو بندرگاہ مصوع پر انہیں اطالیہ کی طرف سے ایک شاندار استقبالیہ دیا جائے۔" ارمغان حجاز" کی متعدد نظموں اور رباعیوں سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال تصور ہی تصور میں عرصہ دراز سے حجاز کی جانب سفر کر رہے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اصلی سفرنامہ حجاز تو وہ ہوگا، جو حجاز سے واپسی پر لکھا جائے گا۔" اس سلسلے میں آپ نے جو آخری اردو نظم کہی، اس کی تاریخ ۷ فروری ۳۸ء ہے، یہ چھ شعر کا ایک مختصر قطعہ ہے، جس کا موضوع ہے حضرت انسان[1]۔ اس کے بعد حضرت علامہ نے اردو میں کوئی نظم نہ کہی۔

اقبال کی علالت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ افغانستان سے واپس آنے کے دو ہی مہینے بعد ان کا طویل سلسلہ علالت شروع ہو گیا تھا، جس کے بعد وہ دوبارہ نہ سنبھل سکے۔ سالک مرحوم کے بقول "علامہ کی علالت کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے جاری تھا، لیکن جب ۱۹۳۸ء کا آغاز ہوا اور آل انڈیا پیمانے پر پہلا یوم اقبال نہایت کامیابی سے منایا جا چکا تو علامہ کی علالت نے

---

[1] اقبال کا مطالعہ، سید نذیر نیازی ص ۱۳۹

یک بیک ایک نیا پلٹا کھایا۔ اس زمانے میں حکیم محمد حسن قرشی ان کا علاج کر رہے تھے۔ علامہ کو ضیق النفس کے خفیف دورے شروع ہوئے، پچھلی رات بے خوابی ہونے لگی، دو ایک دن نقرس کی تکلیف بھی رہی۔ ضیق النفس کے لئے حکیم قرشی صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا تھا، جسکے استعمال سے سکون ہو جاتا تھا۔ حکیم صاحب کی تشخیص یہ تھی کہ علامہ کو دمہ قلبی ہے اور اس کی وجہ ضعف قلب ہے، چنانچہ ڈاکٹروں نے بھی اس تشخیص کی تائید کی[1]۔ ان دنوں اکثر دیکھا گیا کہ علامہ بستر پر بیٹھ کر تکیہ اپنے روبرو رکھ لیتے اور اس پر اپنا سر وقفے وقفے کے بعد ٹیک دیتے۔

مرض کا آغاز

علامہ اقبال کی علالت کے اجمالی حالات تو ان کے خطوط سے معلوم ہو سکتے ہیں جو "اقبال نامہ" میں درج ہیں، لیکن ان مفصل حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو عید کا دن تھا اور سوء اتفاق اس دن سردی نہایت سخت تھی اور صبح ہی سے تیز اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، علامہ صاحب نماز عید ادا کرنے کے لئے شاہی مسجد کو روانہ ہوئے، تو ان کو موٹر میں آتے جاتے یہ سرد ہوا لگی، اس پر طرہ یہ کہ جاڑے کی شدت سے زمین یخ بستہ ہو رہی تھی اور چونکہ شاہی مسجد کے دروازے سے محراب تک بہت فاصلہ ہے اور علامہ صاحب کو آتے جاتے دو بار صحن مسجد سے گزرنا پڑا، اس لیئے دونوں بار ان کے پاؤں نے سردی محسوس کی۔ نماز عید پڑھ کر واپس آئے تو دہی کے ساتھ سویاں کھائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے روز ان کو نزلے کی شکایت ہو گئی، سخت کھانسی آنے لگی اور گلا بیٹھ گیا، جس کے لئے غرغرے تجویز کئے گئے، دوائیں لگائی گئیں، مگر بے سود، بالآخر ایکسرے کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ قلب کے اوپر ایک رسولی بن رہی ہے چونکہ یہ علامت نہایت خطرناک ہے، اس لیے کچھ دنوں کے بعد پھر یہ عمل کیا گیا اور صاف صاف معلوم ہو گیا کہ علامہ صاحب کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس کے بعد حکیم نابینا صاحب کا علاج شروع ہوا اور اس سے معتد بہ فائدہ بھی ہوا، لیکن آواز کا مسئلہ جوں کا توں رہا۔ اگرچہ اب گلے کی حالت بہتر تھی اور آواز بھی نسبتاً بڑھ گئی تھی، لیکن آواز کا دھیما پن بدستور قائم رہا۔

---

[1] ذکر اقبال ص ۲۱۸، ۲۱۹

جنوری ۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں بنفشی شعاعوں کا عمل شروع ہوا اور اس دوران میں حکیم نابینا صاحب کی دوائیں بند کر دی گئیں، اس کا اثر یہ ہوا کہ چار دفعہ بجلی کے علاج کے بعد آواز میں خفیف سا فرق پیدا ہوا، لیکن بجلی کے علاج اور حکیم نابینا صاحب کی دواؤں کے باوجود مرض کا استیصال نہ ہوا، بالخصوص ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں ان کی صحت بتدریج گرنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ یہ کیفیت ہوگئی، کہ چارپائی سے اٹھ کر دو قدم چلے اور ہانپنے لگے۔

تین ڈاکٹر

۱۹۳۸ء کے آغاز میں حالت اور بھی خراب ہوگئی اور ضیق النفس کے خفیف سے دورے پڑنے لگے اور ۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو آخر شب میں ان پر ضعف قلب کے باعث غشی طاری ہوگئی، گویا یہ علامہ صاحب کے مرض الموت کا آغاز تھا۔ اگرچہ اس کی اطلاع حکیم نابینا صاحب کو کر دی گئی، مگر اب قرشی صاحب کا علاج شروع ہوا۔ اور چند ہی دنوں میں علامہ صاحب کو لحظہ بہ لحظہ افاقہ ہونے لگا، لیکن اس دوران میں مرض الموت کی رفتار کچھ عجیب سی رہی اور ان کے چہرے اور پاؤں پر ورم آگیا، اب پیٹھ کے درد سے بھی خاصی تکلیف رہتی تھی مگر رفتہ رفتہ ان علامات میں تخفیف ہونا شروع ہوگئی، لیکن اگلے ہی روز بیماری نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ علامہ صاحب کے بائیں جانب تمام جسم پر ورم پھیل گیا اور انہوں نے معائنہ کے بعد قطعاً مایوسی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ گئے، تو علامہ صاحب کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے تسکین کے دو چار کلمے کہنے چاہے لیکن علامہ صاحب نے فرمایا، میں مسلمان ہوں اور موت سے نہیں ڈرتا، اس کے بعد اپنا یہ شعر پڑھا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

دوسرے دن ڈاکٹر جمعیت سنگھ پھر تشریف لائے۔ ڈاکٹر یار محمد خاں بھی ساتھ

تھے۔ شام کو کپتان الٰہی بخش بھی آ گئے اور باہمی مشورے سے دواؤں اور انجکشنوں کی تجویز ہونے لگی، اگلے دن قریشی صاحب بھی پہنچ گئے۔ اب ہر قسم کی تدابیر ہو رہی تھیں، قدیم اور جدید سب، بالآخر وہ وقت آ پہنچا، جس کا کھٹکا مدت سے لگا ہوا تھا، شام کے وقت جب ان کے معالجین ایک ایک کر کے جمع ہوئے، تو انہیں بتلایا گیا کہ علامہ صاحب کو کل شام سے بلغم میں خون آ رہا ہے، یہ علامت نہایت یاس انگیز تھی، اس لئے کہ خون دل سے آ رہا تھا۔ اس حالت میں کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ شاید وہ آج کی رات جانبر نہ ہو سکیں، مگر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے، تدبیر کا دامن آخر وقت تک نہیں چھوڑتا، قریشی صاحب نے بعض دوائیں تلاش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو موٹر کی ضرورت محسوس ہوئی اور راجہ حسن اختر صاحب موٹر کی تلاش میں نکلے۔ ادھر ڈاکٹروں کی رائے ہوئی کہ کرنل امیر چند صاحب کو بھی مشورہ میں شامل کر لیا جائے، کرنل صاحب تشریف لائے، تو ان کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی، یعنی ان کے حواس ظاہری کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ پھر امید بندھ گئی، اس لئے طے ہوا کہ کچھ تدابیر اس وقت اختیار کی جائیں اور کچھ صبح، تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحبان چلے گئے اور ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کو رات کے لئے ضروری ہدایات دیتے گئے۔[1]

مرض لاعلاج

۲۵ فروری ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال کو دمہ کا دورہ ہوا۔ اس کو روکنے کے لئے انہوں نے جوشاندہ پیا، مگر کچھ افاقہ نہ ہوا، پھر ایلوپیتھک علاج شروع ہوا، جس میں دورے کو روکنے اور نیند لانے کی تدبیر کی جاتی تھی، چند یوم تو بخیر و عافیت آرام سے گزر گئے، لیکن ۲ مارچ کی شب علامہ پر ضعف قلب سے غشی طاری ہو گئی اور وہ اسی حالت میں پلنگ سے گر پڑے۔ دوسرے دن حکیم قریشی صاحب نے ان کو دیکھا اور نیازمندوں کو بتایا کہ اب علامہ کا مرض لاعلاج ہے۔ قلب نہایت ضعیف ہو چکا ہے، جگر اور گردے ماؤف ہو چکے ہیں، مگر اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے، مناسب تدابیر اور احتیاط سے شاید افاقہ ہو جائے۔ سالک مرحوم کا بیان ہے، اس حالت کے پیش نظر معالجین اور عقیدت مندوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اب وقت آخر قریب

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر، سید نذیر نیازی

ہے، لیکن حضرت علامہ کی ذہنی و فکری مستعدی کو دیکھ کر یہ یقین متزلزل ہو جاتا تھا، اس لیے کہ وہ بدستور اپنے ہم نشینوں اور ملاقاتیوں سے سیاسیات یورپ، اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل اور دوسرے موضوعات پر گفتگو فرماتے رہتے تھے۔ حکیم محمد حسن قرشی طبیب کی حیثیت سے نہیں، بلکہ انتہائی مخلص عقیدت مند کی حیثیت سے حضرت علامہ کے علاج میں مصروف تھے۔ گھنٹوں بلکہ بعض اوقات رات کے ایک ایک بجے تک علامہ کی خدمت میں حاضر رہتے، خوشگوار دوائیں کھلاتے، خوشگوار باتیں کرتے اور علامہ کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔

ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر جمعیت سنگھ سے بھی کبھی کبھی مشورہ کر لیا جاتا اور وہ بھی انتہائی توجہ سے علاج کرتے، لیکن علامہ ڈاکٹری دواؤں کی تلخی و ناگواری سے بے حد گھبراتے تھے اور علاج جاری نہ رہ سکتا تھا۔ معالج سب کے سب متفق تھے کہ علامہ کو عظم و اتساع قلب کا عارضہ ہے، چونکہ قلب ضعف کی وجہ سے اپنے وظائف پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے دمہ عارض ہے، گردوں کی کیفیت دیکھ کر حکیم قرشی صاحب کا خیال تھا کہ استسقاء کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹری دواؤں سے علامہ کو نفرت ہوتی تھی، لیکن جب انہیں خمیرہ گاؤزبان، عنبری یا دوا ءالمسک اوراق نقرہ میں رکھ کر دی جاتی تو بے حد خوش ہوتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری دواؤں کے اثرات صدیوں کے تجربے سے ثابت ہیں۔ آج کل کی دواؤں کا کیا ہے؟ ادھر ایجاد ہوئیں، اُدھر متروک۔

۷ مارچ سے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ خبر گیری اور تیمارداری کا تسلسل ضروری تھا، چنانچہ میاں محمد شفیع تو مستقل طور پر جاوید منزل ہی میں اٹھ آئے تھے اور رات بھر جاگ کر علامہ کو دوائیں کھلایا کرتے تھے۔ آدھی رات تک چودھری محمد حسین، راجہ حسن اختر، حکیم قرشی صاحب بیٹھے ہوئے علامہ کا دل بہلاتے رہتے۔ حضرت علامہ کو اپنے احباب کے جذبۂ خدمت گزاری کا متشکرانہ احساس تھا اور وہ خلوت میں اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے۔ ایک شام جب علامہ انتہائی درد و کرب کی حالت میں تھے، علی بخش نے بے اختیار رونا شروع کیا، نیازمندوں نے اس کو تسلی دی تو فرمایا: رونے دیجئے تیس پینتیس برس کا ساتھ ہے۔ جی ہلکا ہو جائے گا۔
انتقال سے دو ایک روز پہلے احباب سے مختلف مسائل پر بات چیت کر رہے تھے کہ رباعی لکھوائی

بہشتے بہر ارباب ہمم ہست   بہشتے بہر پاکان حرم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش   بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

ان دنوں بھی مسلمانان عالم کے حالات، اسلامی ملکوں کے واقعات، وطنیت پرستی کی لعنت مسلمانوں کے ذہنی و اخلاقی انحطاط پر نہایت دردمندی سے اظہار تاسف فرماتے اور اکثر رونے لگتے۔ ایک دن مرض قلب کا ذکر ہوا تو یہ شعر پڑھا ؎

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگ محتسب،
بر دلِ ما آمد و ایں آفت از مینا گزشت،

اس شعر کے پڑھنے کے بعد سخت رقت طاری ہوئی، یہاں تک کہ ہم نشین مضطرب ہو گئے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق اس حد تک تھا کہ ذکر مبارک کے ساتھ ہی اشکبار ہو جاتے اور بیماری کے آخری ایام میں تو فرطِ ادب سے یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی زبان پر لانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیتے کہ ان کے حواس اور بدنی حالت میں کوئی خرابی تو نہیں[1]

۲۰۔ اپریل کی سہ پہر

اس وقت علامہ اقبال درد پشت کی وجہ سے بہت مضطرب اور بیقرار تھے کہ اتنے میں ان کے ایک پرانے ہم جماعت بیرن فان فلٹ ہائم جو ہائیڈل برگ جرمنی میں ان کے ہم سبق تھے، اتفاق سے ملاقات کو آ نکلے۔ ان کا ایک پارسی دوست بھی ساتھ تھا۔ علامہ نے ان سے خوب جی بھر کے باتیں کیں اور طالب علمی کے زمانے کی باتیں بڑے لطف سے یاد کرتے رہے یہ صاحب آخری بیرونی ملاقاتی تھے، جو علامہ کی خدمت میں باریاب ہوئے، وہ چلے گئے، تو بعض دوسرے لوگوں سے کانگرس اور لیگ کی باتیں ہوتی رہیں۔

آج کئی اصحاب اس کے دعویدار ہیں کہ جس وقت علامہ اقبال نے اپنی جان جان آفریں کے

---

[1] ذکر اقبال ص ۲۲۱

سپرد کی، تو یہ لوگ آپ کے پاس موجود تھے، بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وقت نزع شاعر مشرق کا سر ان کی گود میں تھا یا وہ آپ کے پاؤں داب رہے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب علامہ کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کیا، اس وقت صرف علی بخش ان کے پاس تھا۔

ڈاکٹر عبدالقدیم ملک کا بیان ہے کہ ۲۰- اپریل کی شام کو ڈاکٹر جمعیت سنگھ جو حکیم الامت کے فیملی ڈاکٹر تھے، تشریف لائے، تو علامہ مرحوم کی حالت کے پیش نظر انہوں نے MERSALYL کا ٹیکہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ مجھ سے انہوں نے مشورہ کیا تو میں نے بھی تائید کی۔ ان دنوں چونکہ اس ٹیکے سے پیشتر ایمونیم کلورائیڈ (نوشادر) دینا ضروری سمجھا جاتا تھا، تاکہ پیشاب کھل کر آجائے اس لئے ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے میری ڈیوٹی لگائی کہ میں بازار سے ایمونیم کلورائیڈ لاکر علامہ مرحوم کو پلا دوں، تاکہ صبح ٹیکہ لگایا جا سکے چنانچہ میں اسی وقت بازار سے مطلوبہ دوا لے آیا۔ ایمونیم کلورائیڈ بہت تیز اور بد ذائقہ ہوتا ہے اور مجھے علامہ مرحوم کے مزاج سے واقفیت تھی کہ آپ کڑوی کسیلی دوا کے بہت خلاف تھے، اس لئے دوا کے ذائقے کو گوارا بنانے کے لئے اس میں تھوڑا سا گلیسریزا[ل] بھی ملا دیا، لیکن اس کے باوجود جب دوا آپ کو پلائی گئی تو اس کا ذائقہ انہیں بہت ناگوار گزرا اور آپ نے بُرا سا منہ بنا کر فرمایا۔ تم ڈاکٹروں کی دوائیں انتہائی بد ذائقہ ہوتی ہیں اور تم مریض کے مزاج کا قطعاً خیال نہیں رکھتے۔ اس رات ڈاکٹر جمعیت سنگھ کو اور مجھے اس کا احساس تھا کہ یہ رات علامہ مرحوم کے لئے خطرناک ہے، کیونکہ ان کی حالت اس کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ شاید ہی آج کی رات گزار سکیں۔ اس لئے ڈاکٹر جمعیت سنگھ اور میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ رات کو میں جاوید منزل ہی میں ٹھہروں گا۔ چنانچہ اس فیصلے کے تحت علامہ مرحوم کی زندگی کی آخری رات میں ان کے پاس موجود رہا۔

نعت خواں کی تلاش

رات کے بارہ بجے تک کافی لوگ وہاں موجود تھے اور باتیں بھی ہو رہی تھیں، لیکن علامہ

[ل] Ext. Glycerhiza Liq. یہ عام ملٹھی کا مرکب ہوتا ہے۔

مرحوم زیادہ تر خاموش ہی رہے اور صرف ہوں، ہاں ہی میں کسی بات کا جواب دیا، ہاں جس چیز کا انہوں نے اس رات بار بار ذکر کیا وہ پنجابی کی کوئی نعت تھی، جو آپ نے کبھی سُنی تھی، اس کے متعلق ان کا فرمانا تھا کہ ویسی نعت انہوں نے اُردو، فارسی یا عربی میں نہ تو کہیں پڑھی اور نہ ہی کبھی سُنی ہے۔ وہ اپنے احباب سے اس نعت کی تعریفیں کرتے رہے کہ پنجابی زبان کی وہ نعت اس قدر بلند پایہ ہے کہ اپنی ساری زندگی میں کوشش کے باوجود وہ خود بھی اس کے ہم پلہ کوئی نعت نہیں کہہ سکے۔ آپ کی شدید خواہش تھی کہ ایک دفعہ پھر وہ نعت اس آدمی کی زبانی سنیں، جس سے کہ پہلے سنی تھی۔ اس خواہش کا اظہار بار بار انہوں نے اپنے دوستوں سے کیا، چنانچہ ایک ایک کر کے سارے دوست جو اس وقت وہاں موجود تھے، یہ وعدہ پورا کر کے چلے گئے کہ اُس نعت خواں کو لے کر آتے ہیں۔ اس طرح تقریباً ایک بجے تک تمام احباب چلے گئے[۱] اور حکیم الامت علامہ اقبال کے پاس اُس رات، جو ان کی زندگی کی آخری رات تھی، صرف ڈاکٹر عبدالقیوم ملک اور علی بخش رہ گئے۔ علامہ مرحوم دم واپسیں تک اس نعت خواں کے منتظر رہے مگر صد افسوس کہ وعدہ کر کے جانے والوں میں سے کوئی بھی واپس نہ آیا اور شاعر مشرق کی یہ آخری خواہش تشنہ تکمیل ہی رہی۔

زندگی کی آخری رات

رات ایک بجے کے بعد علامہ اقبال کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی اور ان پر نزع کا عالم طاری ہو گیا، زندگی کی یہ رات کسمپرسی، بیچارگی اور بے چینی کی رات تھی، وہ رات کہ جس کا علامہ اقبال کو ایک عرصہ سے انتظار تھا، وہ ایک سچے مسلمان تھے اور موت سے ہرگز نہ ڈرتے تھے۔ اس لئے انہیں اس رات کوئی ڈر اور خوف محسوس نہ ہوا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ اپنے تمام دوستوں، مداحوں اور نیازمندوں کو ایک ایک کر کے جانے کی اجازت نہ دیتے۔ اس آخری رات میں علامہ کی بے چینی اور اضطراب کا نقشہ میاں محمد شفیع نے یوں کھینچا ہے:

---

[۱] اقبال درونِ خانہ ص ۱۷۰ - ۱۷۱

علامہ اقبال کی موت ۲۱- اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح کے کوئی پانچ بجے واقع ہوئی اور مجھے اس بات کا شرف حاصل ہے کہ میں ان تین اشخاص میں سے ایک ہوں، جو علامہ کی موت کی شہادت دے سکتے ہیں۔ علامہ مرحوم کے انتقال کے وقت میرے سوائے اور دو اشخاص بھی تھے جن میں سے ایک تو علی بخش تھا اور دوسرے دیوان علی تھے۔ علی بخش علامہ مرحوم کا ایک وفادار نوکر تھا، جو کوئی چالیس برس سے علامہ کے ہاں ملازم تھا۔

علامہ اقبال کی موت سے کوئی چوبیس گھنٹے پیشتر ہی تمام گھر والے اور عزیز و اقارب پریشان تھے، ان کے خاندان کا ہر فرد اس غم میں برابر کا شریک تھا۔ علامہ اقبال کا آخری دن ان کی کئی ایک خصوصیات کا اظہار بھی کر رہا تھا۔ گو کہ بعض وقت وہ شدت درد سے بیتاب ہو جاتے تھے تاہم ان کے چہرے پر خوشی اور مسرت کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ موت کی آخری گھڑی تک بہ صحت تھے۔

ان کی موت ایک ایسی رات کو واقع ہوئی، جس میں وہ بہت کم سوئے۔ موت سے ایک دن قبل کوئی دن کے ایک بجے علامہ اقبال نے کہا کہ ان کے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے۔ میں نے انہیں ایک خوراک دوا پیش کی، جس کو ان کے پرائیویٹ ڈاکٹر نے تجویز کیا تھا۔ یہ نیند آور دوا تھی، لیکن انہوں نے اسے پینے سے انکار کر دیا اور کہا: میں اس کی ایک خوراک بھی نہیں پیئوں گا۔ اس میں افیون ہے اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ مرتے وقت بے ہوش نہیں رہوں گا پانچ بجنے میں ابھی کوئی دس منٹ باقی تھے کہ علامہ اقبال نے شربت کا ایک گلاس پینے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے گلاس میں تھوڑا سا شربت انڈیلا اور اسے ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ انہوں نے کہا: لیکن یہ تمام میں کیونکر پی سکتا ہوں؟ اور پھر وہ خود بولے: خیر میں اسے پی لوں گا۔ اور پھر وہ ایک ہی سانس میں سارا گلاس پی گئے۔

اس کے چند ہی لمحے بعد علامہ کے سینے میں شدت کا درد ہونے لگا اور انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے "ہائے" کہا۔ علی بخش فوراً اٹھ بیٹھا اور سیدھا علامہ کے بستر کے قریب جا پہنچا اور انہیں اپنے ہاتھوں سے سہارا دیا۔ تب علامہ اقبال نے کہا، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے کوئی میرے دل میں کوئی چیز چبھو رہا ہے۔ اور اس کے بعد انہوں

نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اللہ" اور یہی وہ آخری لفظ ہے جو ان کی موت سے قبل ان کے منہ سے نکلا۔ علی بخش فوراً علامہ سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ علامہ بستر پر دراز ہو چکے تھے، جیسے ہی ان کا سر تکیے سے لگا، علی بخش نے فوراً آپ کا چہرہ قبلے کی طرف پھیر دیا اور اس کے چند ہی لمحوں بعد شاعر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

موت سے قبل

اپنی موت سے ایک دن قبل علامہ اقبال روزمرہ کی طرح جلد اپنے بستر سے اُٹھ بیٹھے اور پھر ایک پیالی چائے پی لی۔ اس عرصہ میں چائے پیتے رہے اور میں انہیں اخبار پڑھ کر سناتا رہا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد حجام آیا اور داڑھی بنائی۔ اس وقت علامہ میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ سوائے اس کے کہ میں نے آپ کی آنکھوں میں چند لال لال ڈورے دیکھے۔ پھر اقبال اپنے دفتر چلے گئے، جو کہ ملاقاتی کمرہ سے ملحق تھا اور وہاں جا کر آپ بستر پر لیٹ گئے۔ آپ تکیے کے سہارے بہت دیر بستر پر لیٹے رہے۔ آپ کو کھانسی نہایت شدت کی ہونے لگی۔ بعض دفعہ تو اتنی شدت سے کھانسی ہونے لگتی کہ آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور آپ بالکل بے بس اور لاچار دکھائی دیتے تھے۔

آپ کی رحلت سے ایک دن قبل ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے علامہ اقبال بہت مسرور اور خوش دکھائی پڑتے تھے۔ ہوا یہ کہ آپ کا پرانا ساتھی اور ہم جماعت بیرن آپ سے ملنے آیا۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا۔ علامہ نے اٹھنے کی کوشش کی اور اپنے پرانے ساتھی کو خوش آمدید کہا۔ سب سے پہلے بیرن نے علامہ کو وہ دن یاد دلائے، جب کہ وہ اور علامہ ایک ساتھ میونخ یونیورسٹی میں تعلیم پایا کرتے تھے۔ پرانے واقعات کو یاد کر کے علامہ بہت خوش ہوئے اور ان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ علامہ اقبال نے اپنے پرانے ساتھی پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ انہوں نے لیڈی بیرن، بیرن کی بیٹی اور اپنے کئی دیگر ساتھیوں کے متعلق حالات دریافت کئے۔ اس کے بعد دونوں میں خاصی دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ ان کی بات چیت سے

میں نے اندازہ لگایا کہ بیرن افغانستان جانا چاہتا تھا۔ اقبال نے جنہیں کابل کے متعلق بہت کچھ معلوم تھا، اس کے دلفریب مناظر، میوے، پھل اور موسم کے متعلق باتیں کرنے لگے، بیرن نے آپ سے کابل کے مشہور مقامات کے متعلق بھی بات چیت کی۔ وہ جنہیں علامہ سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے، بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں اور وہ باتیں کرتے ہوئے تھکتے نہیں تھے۔ اس موقع پر علامہ نے بیرن سے جرمن فلسفہ سے متعلق بھی بحث چھیڑ دی اور اس کے بعد وہ دونوں سیاسیات پر باتیں کرنے لگے۔ بیرن نہیں چاہتا تھا کہ ایک ایسے وقت وہ اپنی گفتگو کو طویل بنائے، جبکہ علامہ کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے کہا شاید میری اس غیر متوقع مداخلت سے آپ کی صحت پر بُرا اثر پڑ رہا ہو گا۔ اقبال نے فوراً جواب دیا "یہ بالکل ہی دوسرا راستہ ہے میرے دوست، آپ کی ہر سانس میرے لئے مرہم کا کام کر رہی ہے۔"

اقبال اور بانو

یہ دلچسپ گفتگو کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد اختتام کو پہنچی اور بیرن چلا گیا۔ اسی شام کا ایک قصہ "بانو" سے متعلق ہے۔ "بانو" علامہ اقبال کی چھوٹی لڑکی کا نام ہے۔ وہ تیز تیز دوڑتی ہوئی علامہ کے کمرے میں داخل ہوئی اور خاموشی سے آپ کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ علامہ کی نظر کافی کمزور ہو چکی تھی۔ آپ نے بچی کے سر پر ہاتھ رکھا اور پیار سے کہا "کون آیا ہے، شاید بانو ہو گی" ایک اور موقع پر جیسے ہی بانو کمرے سے باہر نکلی، آپ نے فرمایا "وہ بخوبی جانتی ہے کہ اس کے باپ کی موت کی گھڑی قریب آ چکی ہے۔"

بانو حسب معمول اپنے باپ سے ملنے کے لئے تین دفعہ آیا کرتی تھی۔ ایک تو مدرسے جاتے وقت، دوسرے واپسی کے وقت، تیسرے سونے سے قبل، اقبال، بانو سے اکثر کھانے کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے "تم نے آج کیا کھانا کھایا اور کتنا کھایا؟" شاعر نے پوچھا "اتنا کھایا؟" بانو معصومیت سے اپنے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتی اور شاعر مسکرانے لگتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ چھوٹے بچوں سے صرف کھانے پینے کے بارے میں ہی پوچھنا چاہیئے۔ یہی وہ آسان طریقہ

ہے، جس سے بچے کا دل موہ لیا جا سکتا ہے۔

موت سے ایک دن قبل، دوپہر کے وقت بانو آپ سے بغل گیر ہو گئی۔ نہ جانے اس دن اقبال کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ رو رہے تھے اور بانو حیرت سے اپنے باپ کا منہ تک رہی تھی۔

جاوید کی معنوی تشریح

اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی ارغوانی شعاعیں علامہ مرحوم کے مکان کو چھوتی ہوئیں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ علامہ کا بستر ان کے دیوان خانے میں بچھا دیا گیا، اس موقع پر ایک تانگہ راستہ سے گزرا۔ تانگے والا ایک غمگین گیت الاپ رہا تھا۔ شاعر نے جب اس کی درد بھری آواز سنی، تو ایک سرد آہ بھری اور چھت کو گھورنے لگے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دیر بعد فاطمہ بیگم اقبال سے ملنے آئیں۔ فاطمہ ایک مقامی اناث کالج کی پرنسپل تھیں۔ شاعر نے آپ سے لڑکیوں کے متعلق مذہبی مسائل پر بات چیت کی۔ آپ نے کہا کہ مسلمان لڑکیوں کو سختی سے اسلام کی تعلیم دینی چاہیئے۔

اس وقت آپ کے سارے دوست احباب اور رشتہ دار جمع ہو چکے تھے۔ وہ تمام جانتے تھے کہ اب اقبال کا وقت قریب آ چکا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے دبی آواز میں پوچھتے "کیا آج رات اقبال زندہ رہ سکیں گے؟" اور یہی ایک ایسا سوال تھا، جو ہر ایک دماغ کو پریشان کر رہا تھا۔ اسی لمحے جاوید اندر آیا۔ جاوید جیسے ہی کمرے میں آیا، اقبال نے کہا "یہ کون آیا ہے؟" اور جب انہیں بتایا گیا کہ جاوید آیا ہے، تو آپ نے جاوید کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور پھر فرمانے لگے "جاوید کے معنی فارسی میں غیر فانی کے ہیں۔" محمد حسین جو کہ آپ کے ایک قریبی دوست تھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جاوید کے پیدا ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد آپ مجدد الف ثانی کے مقبرہ پر جو سرہند میں واقع ہے، حاضر ہوئے تھے، جہاں آپ نے دعا فرمائی تھی کہ وہ نومولود کو زمانہ حاضر کی خراب باتوں کی ناپاکی سے پاک کر دے

واضح رہے کہ مجدد الف ثانی عہد جہانگیر کے ایک مشہور ولی اور اللہ کے برگزیدہ

اس روز بہت شدت کی گرمی پڑ رہی تھی اور شاعر نے خواہش کی کہ ان کا بستر صحن میں منتقل کر دیا جائے۔ یہاں پر تین مشہور ڈاکٹروں نے آپ کا معائنہ کیا اور جاتے ہوئے وعدہ کر گئے کہ وہ دوبارہ انجکشن دینے آئیں گے۔ شاعر نے ڈاکٹروں سے کہا کہ وہ بلا کھٹکے ان کی صحت کے متعلق صحیح حالات کہہ دیں، کیوں کہ وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتے رات کے کوئی بارہ بجے ہونگے کہ شاعر کی بے چینی میں اضافہ ہوگیا اور انہیں دوبارہ ان کے دیوان خانے میں لایا گیا۔ علی بخش آپ کے ہمراہ تھا۔ اس سے آپ کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور وہ بے اختیار رونے لگا۔ جب اقبال کی نظر اپنے وفادار نوکر کے بہتے ہوئے آنسوؤں پر پڑی تو آپ نے فرمایا۔ علی بخش مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری چالیس سال کی دوستی عنقریب ختم ہونے والی ہے۔

آخر شب دید کے قابل

تقریباً آدھی رات بیت چکی تھی اور اقبال نیند نہ آنے کی وجہ سے بہت بے چین ہو گئے تھے۔ آپ کے دوست احباب اس وقت بھی آپ کے قریب تھے۔ ان میں سے ایک نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ نیند آور خوراک کی ایک دوا ہی پی لیں تو رات کا باقی حصہ نہایت آرام سے گزر جائے گا۔ اس دفعہ بھی انہوں نے اس دوا کو پینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد دوستوں نے آپ سے اجازت چاہی اور آپ سونے کے لئے چلے گئے۔ انہیں غیر متوقع طور پر جلد ہی نیند آگئی، لیکن ابھی وہ گھنٹہ بھی سونے نہ پائے تھے کہ پھر بیدار ہو گئے اور کہا: میرے پیٹ میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ عبدالقیوم جو کہ آپ کے قریبی رشتہ دار تھے انہوں نے پھر سے علامہ سے درخواست کی کہ وہ نیند آور دوا پی لیں۔ مگر وہ برابر انکار کرتے رہے، وقت تیزی سے گزرتا رہا اور شاعر کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ شاید یہ آخری رات تھی، جس میں انہوں نے حقّہ نہیں پیا۔ اس موقع پر اب ہم صرف تین اشخاص باقی رہ گئے تھے علی بخش، دیوان علی اور میں، وہ منظر بڑا ہی جگر سوز اور دل خراش تھا، جب کہ شاعر نے ہم سے درد بھری آواز میں کہا کہ ہم ان کے نزدیک بیٹھ جائیں۔ اور جب ہم سے کوئی

اونگھنے لگتا تو وہ کہتے "صرف تمہیں آج رات ہی جاگنے کی تکلیف گوارا کرنی ہوگی۔"

پنجابی گیت کی فرمائش

اس کے بعد انہوں نے دیوان علی سے کہا کہ وہ انہیں ایک پنجابی گیت سنائے۔ دیوان علی انہیں خوشی سے گیت سنانے کے لئے راضی ہو گئے۔ اب شاعر کی موت میں صرف چار گھنٹے باقی تھے، لیکن ان کے ہوش وحواس قائم تھے۔ دیوان علی نے پنجاب کے مشہور شاعر بلہے شاہ کے چند گیت الاپے، ان گیتوں سے شاعر بہت متاثر دکھائی دیتے تھے۔ بالآخر میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

رات کے کوئی تین بجے ان کی حالت انتہائی خراب ہو گئی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں حکیم محمد حسن قرشی کو بلا لاؤں جو کہ لاہور کے ایک نامی گرامی طبیب تھے۔ ان کا مکان کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں سائیکل پر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ان کے مکان پر پہنچا اور اپنی پوری قوت سے انہیں آواز دی۔ لیکن وہ اپنے بنگلہ کی تیسری منزل پر سو رہے تھے۔ میری آواز بیکار ثابت ہوئی اور مجھے مایوس لوٹنا پڑا۔ اقبال نے جب مجھے بغیر حکیم کے دیکھا تو کہا: اب کیا کیا جائے۔

نسیمے از حجاز.....

تھوڑے ہی وقفہ کے بعد شاعر نے یوں محسوس کیا کہ درد میں کمی ہو رہی ہے اور اس طرح انہیں سکون مل رہا ہے لیکن آہ — یہ جلتی ہوئی چنگاری کی آخری چمک تھی۔ اب انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی لکھی ہوئی نظم کے یہ اشعار گنگنانا شروع کئے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

سویرا آہستہ آہستہ نکل رہا تھا، لیکن شاعر کی زندگی ختم ہو رہی تھی۔ اس وقت صبح کے کوئی پانچ بجا چاہتے تھے کہ ان کے درد میں اچانک شدت پیدا ہو گئی۔ لیکن انہوں نے صبر و استقلال سے اسے برداشت کیا۔ بجائے آہ و فغاں کرنے کے انہوں نے ہم سے کہا کہ ان کا بستر دارالمطالعہ میں منتقل کر دیا جائے۔ جہاں انہوں نے سالہا سال فلسفہ اور ادب پر غور و فکر کرتے ہوئے گزارے تھے۔ یہ ان کا پسندیدہ کمرہ تھا۔ وہ "اللہ" کہتے ہوئے بستر پر لیٹ گئے۔ اور شاعر مشرق موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اپنی موت سے کوئی ایک ہفتہ قبل اقبال نے یہ تحریر اپنے بھائی کے ہاں روانہ کی تھی، جو آپ کی بیماری سے سخت پریشان تھے۔ "مجھے اجازت دیجیے کہ میں ایک سچے مسلمان کی خصوصیت آپ پر ظاہر کر دوں، جب وہ مرے تو مسکراتے ہوئے چہرے سے، موت کو خوش آمدید کہے"۔ ——— اور میں نے اچھی طرح اندازہ لگایا کہ اقبال نے بستر مرگ پر اپنے اس کہے پر پوری طرح عمل کیا۔ جب ان کی آخری گھڑی آن پہنچی، تو میں نے دیکھا کہ ان کے لبوں پر ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔[1]

انا للہ وانا الیہ راجعون

جس صبح علامہ اقبال کا انتقال ہوا، اُس رات ان کا بستر جاوید منزل کے پورچ میں لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ملک راوی ہیں کہ ساری رات آپ وہیں بستر میں خاموش لیٹے رہے اور ایک پل کے لئے بھی آنکھ نہیں جھپکی۔ پچھلے پہر کچھ خنکی ہو گئی، اس لئے صبح ہونے کے بالکل قریب آپ نے فرمایا: بھائی! مجھے اندر کمرے میں لے چلو، یہ وہ آخری الفاظ ہیں، جو علامہ مرحوم نے وفات سے چند لمحے قبل کہے، میں اور علی بخش انہیں چارپائی سمیت اٹھا کر ان کے کمرہ خاص میں لے گئے، جو جاوید منزل کی نشست گاہ سے ملحق ہے اور جس کی دو کھڑکیاں باہر برآمدے میں کھلتی ہیں، رات بھر جاگنے سے میری طبیعت کسلمند ہو

---

[1] جنگ کراچی، اقبال نمبر ۱۹۶۱ء

رہی تھی، اس لئے کچھ دیر سستانے کی خاطر باہر لان میں آکر لیٹ گیا اور علامہ مرحوم کے پاس اندر صرف علی بخش رہ گیا۔ میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ علی بخش نے کمرے میں چلا کر مجھے پکارا کہ ڈاکٹر صاحب جلدی آیئے، میں بھاگ کر اندر پہنچا تو آپ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ گردن ڈھلک کر چہرہ خود بخود قبلہ رو ہو گیا تھا، آنکھیں نرمی سے بند اور لبوں پر ہلکا ہلکا تبسم رقصاں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے آپ بڑے آرام سے محو استراحت ہیں۔ میں نے جلدی سے آپ کی نبض ٹٹولی اور مایوس ہو کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے جب چادر سے آپ کا چہرہ ڈھانپا تو علی بخش آپ کے قدموں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس وقت ہر جانب سے صبح کی اذانوں کی پرسطوت صدائیں آرہی تھیں[۱]۔ ان اذانوں کے ساتھ ہی حکیم الامت شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال اپنے خالق حقیقی کے پاس جا چکے تھے اور وہ آواز جس نے گزشتہ ربع صدی سے چار دانگ عالم میں غلغلہ برپا کر رکھا تھا، ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

ہر دل اُداس، ہر آنکھ اشکبار

حضرت علامہ اقبال کے انتقال پُر ملال کی خبر دل شگاف نہایت سرعت کے ساتھ تمام شہروں میں پھیل گئی، سرکاری دفاتر عدالتیں، کالج، سکول اور نجی ادارے بند کر دیئے گئے۔ اور ہر شہر کے گوشے گوشے سے علامہ مرحوم کے عقیدت مند جوق در جوق جاوید منزل کا رُخ کرنے لگے، تاکہ اس درویش خود آگاہ و خدا آگاہ کی آخری زیارت سے شرف یاب ہو سکیں۔ علامہ کے احباب، نیاز مند اور خدام کی حالت وفور غم سے ناقابل بیان ہو رہی تھی۔ ہر دل اداس تھا، ہر آنکھ اشکبار تھی۔ علی بخش اپنے ڈاکٹر صاحب کی جدائی میں بیقرار تھا۔ جاوید اور منیرہ خاموش اور سہمے ہوئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ابا جان کو کیا ہو گیا ہے؟ جاوید منزل اس بیوہ کی مانند نظر آ رہی تھی، جس کا سہاگ اجڑ گیا ہو، جس کی مانگ کا سیندور خشک ہو گیا ہو، جس کے ہاتھوں کی مہندی اتر گئی ہو۔ کیفیت غم کا یہ عالم تھا کہ صدہا مشتاقان دید قطار اندر قطار حضرت علامہ اقبال

---

[۱] اقبال درون خانہ ص ۱۷۲ - ۱۷۳

کا چہرہ دیکھ دیکھ کر گزرتے جاتے تھے اور حضرت کے چہرے پر سکون و اطمینان کے علاوہ ایک ہلکا سا تبسم بھی تھا، جو خود علامہ کی زبان میں کہہ رہا تھا ؎

چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

علامہ اقبال تو اپنے پیچھے ہزاروں اور لاکھوں مداحوں اور نیازمندوں کو داغ مفارقت دے کر دور جا چکے تھے، لیکن ہر اداس دل اور ہر اشکبار آنکھ اس تمنائے بیتاب کی متمنی تھی کہ حکیم الامت، شاعر مشرق اور مفکر اسلام کا مرقد کسی ایسے مقام پر ہو، جو ان کی شخصیت کے مصداق نمایاں اور ممتاز رہے۔ کیونکہ یہ مدفن صدیوں تک "سجدہ صاحب نظراں" کا مورد رہنے والا ہے۔ ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور چودھری محمد حسین کی رائے تھی کہ حضرت علامہ مرحوم و مغفور کو شاہی مسجد لاہور کے کسی حجرے میں دفن کر دیا جائے، اس کے لئے سرکاری اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ عبدالمجید سالک کا کہنا ہے۔ سردار سکندر حیات خاں کلکتہ گئے ہوئے تھے اور وہاں سے واپس آ رہے تھے، لیکن انتظار خارج از بحث تھا۔ بہر حال قرار یہ پایا کہ چند اشخاص شاہی مسجد جا کر مدفن کی جگہ تجویز کریں۔ چنانچہ چودھری محمد حسین، سید محسن شاہ، خلیفہ شجاع الدین، خان سعادت علی خاں، میاں نظام الدین، میاں امیرالدین، مولانا غلام مرشد اور مولانا غلام رسول مہر شاہی مسجد گئے۔ اور دیکھ بھال، بات چیت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ حجرہ مناسب نہیں، مسجد کی سیڑھیوں کے بائیں جانب جو قطعہ زمین خالی پڑا ہے، وہ حضرت علامہ کے مدفن کے لئے موزوں رہے گا۔ اس کے بعد حصول اجازت کے لئے پانچ حضرات کا ایک وفد سر ہنری کریک گورنر پنجاب سے ملا۔ یہ مسئلہ آثار قدیمہ سے متعلق تھا اور مرکزی حکومت کی منظوری دہلی سے منگوانا ضروری تھی۔ سر ہنری کریک نے انتہائی ہمدردی سے کام لے کر خود حکومت ہند سے بات چیت کر کے دوپہر تک اجازت منگوا دی۔

نماز جنازہ

شام کے پانچ بجے تک جاوید منزل میں ہزاروں مسلمانوں کا مجمع ہو گیا اور پنجاب بھر کے عمائد و اکابر تو بلا امتیاز مذہب و ملت جمع تھے۔ وزرائے حکومت، عدالت عالیہ کے

جج، حکام، شعراء، ادباء، اخبار نویس، کالجوں کے پروفیسر، طلبا، سجادہ نشین، علما، تجار، صناع اور عام فرزندان اسلام جنازے کے ساتھ باچشم گریاں آہستہ آہستہ جا رہے تھے اور رونے والوں کی آوازوں سے ہر طرف ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھ دیئے گئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کندھا دے سکیں۔ گورنر پنجاب اور نواب بہاول پور کی طرف سے ان کے سیکرٹریوں نے پھولوں کی چادریں جنازے پر چڑھائیں۔ جنازے کے آگے آگے پیدل اور سوار پولیس، احرار کے سرخ پوش رضا کار، نیلی پوش والنیٹر، خاکساروں کے جیش، کامریڈ مسلم جیش، الہلال پارٹی، غرض متعدد جیوش اپنی اپنی وردیوں میں جنازے کے ہمراہ تھے۔ جاوید منزل سے یہ عظیم الشان جلوس ریلوے اسٹیشن اور ریلوے روڈ سے ہوتا ہوا اسلامیہ کالج کے وسیع سبزہ زار میں پہنچا، جہاں نماز جنازہ پڑھنے کے لئے کم و بیش بیس ہزار مسلمان جمع تھے۔[1] لیکن جب جلوس برانڈرتھ روڈ سے دہلی دروازے کی طرف چلا، تو جنازے کے ساتھ کوئی پچاس ساٹھ ہزار مسلمان، ہندو اور سکھ ضرور ہوں گے۔ سات بجے کے بعد جلوس شاہی مسجد پہنچا، نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی بے پناہ کثرت کے باعث وضو اور ترتیب صفوف میں ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ آٹھ بجے شب نماز جنازہ ادا کی گئی اور پونے دس بجے یہ عزیز و محبوب جسم سپرد خاک کر دیا گیا۔[2]

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

تعزیتیں اور قراردادیں

حضرت علامہ اقبال کی رحلت کا ہر شخص نے بلا تمیز دین و ملت ماتم کیا۔ بہت سے شعراء نے قطعات تاریخی لکھے۔ اخبارات و رسائل نے خصوصی ایڈیشن شائع کئے۔ اکابرین ہند اور اعاظم

لہ اقبال کامل ص ۳۴۳ پر سب رس اقبال نمبر ص ۹۶ کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ علامہ اقبال کی نماز جنازہ میں ساٹھ ستر ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔ قریب قریب یہی تعداد اخبارات نے بھی لکھی (ایم۔ ایس۔ ناز)

عہ ذکر اقبال ص ۲۲۵

رجال عالم نے ماتم پرسی کے پیغامات بھیجے۔ شعراء نے مرثیے کہے غیر منقسم ہندوستان تو ایک طرف، دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ رہا تھا، جس کے اکابر سیاست اور اہل فضل وکمال نے اس نابغۂ عظیم کے حضور تحسین وعقیدت کا خراج پیش نہ کیا ہو۔ ان میں ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو، سر سلطان احمد، مسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم بہار، نواب بہادر یار جنگ، سوبھاش چندر بوس صدر کانگرس، محمد علی جناح، صدر مسلم لیگ اور ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے بیانات قابل ذکر ہیں۔ بنابریں جا بجا ماتمی جلسے ہوئے، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے جو جلسہ ہوا، اس کی صدارت میاں عبدالحی وزیر تعلیم حکومت پنجاب نے کی۔ حیدر آباد کا سب سے بڑا تعزیتی جلسہ زیر صدارت مسز سروجنی نائیڈو ہوا اور اس میں ہز ہائینس ولی عہد بہادر شہزادہ بلند والا شان نواب معظم جاہ بہادر رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری، سر مرزا اسمٰعیل دیوان میسور، سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب، سر غلام حسین ہدایت اللہ، راجہ صاحب محمود آباد، ڈاکٹر سید محمود، قائد اعظم محمد علی جناح، مرزا یار جنگ بہادر، سر امین جنگ بہادر، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے بیانات پڑھے گئے اور نواب مہدی یار جنگ بہادر، راجہ پرتاپ گیرجی، ڈاکٹر یوسف حسین، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور نواب کیقباد جنگ بہادر نے تقریریں کیں۔ ان میں راجہ پرتاپ گیرجی نے ہندوؤں اور نواب کیقباد جنگ بہادر نے پارسیوں کی نمائندگی میں تقریریں کیں۔ اس جلسے کے علاوہ انجمن خواتین دکن، جمعیت مسلم نونہالان سکندر آباد اور مدرسہ فرقانیہ دارالشفا کی طرف سے بھی ماتمی جلسے ہوئے[۱]۔ ہندوستان سے باہر کیمبرج یونیورسٹی مسلم سوسائٹی کی جانب سے ۲۲۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو نماز جمعہ کے بعد ایک تعزیتی جلسہ ہوا اور علامہ کے لئے غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ غرض پاک وہند کے علاوہ دنیا کے کئی اور ملکوں اور شہروں میں علامہ مرحوم کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

قطعاتِ تاریخ

حضرت علامہ اقبالؒ کی رحلت پر جن اہل فکر نے قطعات تاریخ تصنیف کئے، ان کا ذکر ایک

---

[۱] اقبال کامل ص ۳۴

الگ کتاب کا متقاضی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ "آج تک کسی شخص کی وفات پر اتنی تاریخیں نہیں کہی گئیں، جتنی اقبال پر کہی گئی ہیں[1]۔ حفیظ ہوشیارپوری مرحوم نے کئی کئی تاریخیں نکالیں۔ مثلاً "آہ مفکرِ اعظم" سے ان کی وفات کی ہجری تاریخ ۱۳۵۷ نکلتی ہے اور پیغمبر دین خودی کے عدد ۱۹۳۸ء ہیں حفیظ ہوشیارپوری نے علامہ اقبال کے ایک مصرع "صدق و اخلاص و وفا باقی نماند" سے بھی ہجری تاریخ نکالی۔ راجل ہوشیارپوری نے "خضرِ راہ اسلام" سے عیسوی تاریخ نکالی۔ خواجہ دل محمد نے بھی عیسوی اور ہجری تاریخیں بڑی خوبی سے نکالیں اور انہیں یوں نظم کیا ؎

"شمع خاموش" سال ہجری ہے
عیسوی "شمع شاعری خاموش"

علامہ اقبال نے خود اپنی لوحِ مزار پر لکھنے کے لئے یہ رباعی کہی تھی ؎

نہ پیوستم دریں بستان سرا دل
ز بندِ این و آں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دمے چند
گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

لیکن جب سرراس مسعود کا انتقال ہوا، تو خود اقبال کو معلوم ہوا کہ اس رباعی کا مضمون ان سے زیادہ سرراس مسعود کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے، اس لئے اس رباعی کا انہوں نے ان کی لوحِ مزار کے لئے انتخاب کیا[2] ــــــ علامہ اقبال کی رحلت پر کہی گئی چند اور مشہور تاریخیں یہ ہیں ؎

بے زوال علم و حکمت مرگ سر اقبال کی
۱۳۵۷ھ — مولانا احسن ماہروی

جگر میں قوم کے ناسورِ غم رہے گا یہ سال
۱۳۵۷ھ — سید ہاشمی فریدآبادی

---

[1] حیات اقبال ص ۱۴۶-۱۴۷ [2] اقبال نامہ ص ۳۲۹

بادِ رحمت ہائے حق بر تربتش   آمد "المغفور" سالِ رحلتش

۱۳۵۷ھ

حامد حسن قادری

ملّتِ اسلام ، اقبال کا ماتم ہے آج

۱۳۵۷ھ

ڈاکٹر سید عابد حسین

مزارِ اقبال

حضرت علامہ اقبال کا مزار ہر وقت مرجع خلائق رہتا ہے جمعرات اور جمعہ کے روز تو مزار پر ایسا ہی ہجوم ہوتا ہے، جیسا بزرگان دین اور اولیائے کرام کے مزارات پر خلقت خدا دیوانہ وار جمع ہو۔ اتوار کو زیادہ تر غیر ملکیوں کی آمد رہتی ہے۔ کئی ملکوں کے سلطان، حکمران، وزراء اور ادباء و مشاہیر بھی اکثر حاضری دینے آتے رہتے ہیں۔ حضرت علامہ کا مزار ان کی اپنی زندگی کی طرح سادگی کا مظہر ہے۔ روزگار فقیر کے مطابق حضرت علامہ کے انتقال کے بعد ہی ۱۹۳۸ء میں مزار کمیٹی تشکیل پاگئی تھی، تاہم مزار کی تعمیر کا آغاز ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ اس مزار کا نقشہ حیدر آباد کے ممتاز ماہر فن نواب زین یار جنگ نے بنایا۔ مزار پر نہ کوئی گنبد ہے نہ مینار۔ اس کے باوجود بڑا پر شکوہ دکھائی دیتا ہے۔ سردار صلاح الدین سلجوقی جو ہندوستان میں حکومت افغانستان کے سفیر تھے، علامہ کے بڑے قدردان تھے۔ ان کی تحریک پر حکومت افغانستان نے تعویذ اور لوح بنا کے بھیجی، جو نصب کی گئی۔ یہ تعویذ اور کتبہ دنیا کے سب سے قیمتی پتھر سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ پتھر ص ۱۰۱ صرف افغانستان اور وسطی ایشیا میں دستیاب ہوتا ہے۔ مزار پر جو اشعار نقش ہیں انہیں مشہور خطاط ابن پروین رقم نے کمال فنکاری سے تحریر کیا ہے۔

تصنیفاتِ اقبال

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے ملتِ اسلامیہ کے لیے گراں قدر وافر سرمایہ چھوڑا، اس کی حیثیت اس سمندر کی سی ہے، جس سے لاکھوں اور کروڑوں لوگ صدیوں تک بہرہ ور ہوتے رہیں گے، تشنگانِ علوم اس سے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے، گم گشتگانِ راہ، اپنی منزل کے نشان تلاش کرتے رہیں گے اور اقبال کی فکر ان کے اذہان کو بیدار کرنے اور ان کے قلوب میں سوزِ آرزو پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ اقبال کا ہر شیدائی اور عقیدت مند ان کے اس گراں قدر وافر سرمایہ کو دیکھ کر حسرت آمیز لہجے میں یہی کہتا ہے کہ اے کاش، اقبال چند سال اور زندہ رہ جاتے، تو کچھ اور بیش قیمت تصانیف چھوڑ جاتے، جو ملّت کے فکر کو صراطِ مستقیم پر لانے اور دینِ اسلام کے لازوال معارف کو دنیا کے سامنے روشن کرنے میں بڑا کام دیتیں۔ صد افسوس، اجل نے انہیں اتنی مہلت نہ دی، ورنہ وہ تشکیل فقہ جدید، حاشیہ قرآن مجید اور سفرنامہ حجاز کی صورت میں ملت کے لئے مزید ہدایت و رہنمائی کا سامان مہیا کر دیتے۔

اس امر میں کلام نہیں کہ اقبال اس عالم رنگ و بو میں ایک معمار کی حیثیت سے تشریف لائے، ان کا جذبۂ تعمیر صرف خواص ہی کے لئے نہیں، عوام کے لئے بھی تھا۔ انہوں نے سوئی ہوئی ملّت کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے حسبِ موقع خطابت کی اور سیاست میں بھی حصہ لیا۔ تبصرے کئے اور تنقید کا حق بھی ادا کیا، حکمت کی باتیں کیں اور ندائے حق بھی بلند کی، کلیم نہ ہوتے ہوئے بھی خدا سے ہمکلام ہوئے اور اپنے الہامات کو شعروں کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا اور یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ وہ ملّت اسلامیہ کے ہر فرد کو تعمیری رنگ میں رنگا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، اسی خاطر انہوں نے ہر وہ ذریعہ اختیار کیا اور ہر وہ راستہ، اپنے فن سے ہموار کیا، جس سے کہ وہ مسلمانانِ عالم میں بالعموم اور مسلمانانِ ہند

میں بالخصوص ایک نئی روح ڈال سکیں۔ ان کی خدمات کا بین ثبوت ان کا گراں قدر اور وافر سرمایہ ہی ہے، جو خطبات، مضامین، تقاریر، بیانات، خطوط اور شاعری کی لافانی کتب کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ سرمایہ بلاشبہ ایک امانت ہے، ایک نظر میں حضرت علامہ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

اردو:- علم الاقتصاد[1]، بانگ درا[2]، بال جبریل[3]، ضرب کلیم[4]۔

فارسی:- اسرار خودی[5]، رموز بیخودی[6]، پیام مشرق[7]، زبور عجم[8] (مع گلشن راز جدید[9] و بندگی نامہ)[10] جاوید نامہ[11]، پس چہ باید کرد، اے اقوام شرق[12] (مع مسافر)[13] ارمغان حجاز[14] (اس میں ضرب کلیم اور اقوام شرق و مسافر کے بعد کا فارسی اور اردو کلام جمع ہے)

انگریزی:- ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر[15]، ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعیات کا ارتقاء، اسلام کا مذہبی تخیل[16] (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

غیر مطبوعہ:- تاریخ عالم[17] (جرمن زبان میں)

علامہ اقبال کے بیشتر خطوط اور احباب و معتقدین کے نام ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ کئی اور کتب اور رسائل لکھنا چاہتے تھے، لیکن صحت اور عمر نے وفا نہ کی اور اقبال کی یہ تمنا حسرت تعمیر ہی رہی، مثلاً ان کے ذہن میں تھا کہ "اپنے ذہنی ارتقاء کی سرگزشت" لکھیں۔ فرماتے ہیں کہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے نہایت ضروری ہے، مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔[1] اسی سرگزشت کے بارے میں مزید فرمایا "خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے، اگر کبھی فرصت ہوئی تو لکھوں گا، فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔"[2] حیف کہ حکیم الامت کی یہ تمنا ان کے لئے دل ہی میں رہی، اسی طرح اقبال

---

[1] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی، مورخہ ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء

[2] مکتوب بنام عشرت رحمانی، مورخہ ۲۔ نومبر ۱۹۱۹ء

"اجتہاد" کے موضوع پر ایک طویل مقالہ قلمبند کرنا چاہتے تھے، فرماتے ہیں: میں نے اپنے مضمون "اجتہاد" میں ان کی (یعنی عبادات کی) ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔[1] کہا جاتا ہے کہ اس مضمون کا ابھی بہت کم حصّہ سپردِ قلم کیا گیا تھا کہ بصارت میں کافی ضعف آ گیا اور اقبال، اسے مکمل نہ کر سکے۔

اقبال نے ایک بار نواب صاحب بھوپال سے ان کی تحریک پر یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ "قوانین اسلام کا فلسفہ" کو کتابی شکل میں تحریر کریں گے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: انشاءاللہ موسم سرما میں "وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا، جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے، اس کتاب میں زیادہ تر قوانینِ اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے۔"[2] یہ امید بھی پوری نہ ہو سکی۔ فرمایا: اسلامی اصول فقہ کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن اب یہ امید بھی موہوم معلوم ہوتی ہے۔[3] "قوانین اسلام کا فلسفہ" کا موضوع ایک عرصہ سے اقبال کے ذہن میں تھا۔ اور وہ اس بارے میں مطالعہ بھی فرما رہے تھے، خود اعتراف کرتے ہیں کہ یہ خیال بالکل آخر میں ذہن میں نہیں آیا تھا "میری مدت سے آرزو تھی کہ زمانہ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے، مگر غلامانہ انداز میں نہیں، بلکہ ناقدانہ انداز میں، اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا ہے، یونان کا فلسفہ ایک زمانے میں انسانی علوم کی انتہا تصور کیا گیا، مگر جب مسلمانوں میں تنقید کا مادہ پیدا ہوا تو انہوں نے اسی فلسفہ کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا، اس عصر میں معاملات کے متعلق بھی ایسا ہی کرنا ضروری ہے۔"[4] یہی موضوع اقبال اور نواب صاحب بھوپال کے درمیان زیرِ بحث آیا، تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ "قوانین اسلام کا فلسفہ" لکھیں گے، مگر اقبال علالت کے باعث اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

---

[1] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی مورخہ ۷۔ اپریل ۱۹۲۶ء۔ [2] ایضاً مورخہ ۷۔ اگست ۱۹۳۶ء
[3] مکتوب بنام خواجہ غلام السیدین مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۷ء۔ [4] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی مورخہ ۷۔ اپریل ۱۹۲۶ء۔

اپنے ایک مکتوب میں علامہ اقبال نے یہ بھی لکھا ہے: اس طرح میرے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا، جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں، لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا، اگر مجھے حیات مستعار کی باقی گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے، تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر کوئی پیشکش مسلمانان عالم کو نہیں کر سکتا۔[1] اسی مقدس تمنا کا اظہار ایک دوسرے مکتوب میں بھی کرتے ہیں: چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم کے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں، جو تھوڑی سی ہمت طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے، اسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں، تاکہ قیامت کے دن آپ کے جدِ امجد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا، کوئی خدمت بجا لا سکا۔[2] سر راس مسعود کے نام اپنے ایک دوسرے مکتوب میں اقبال نے فرمایا: انشاء اللہ امید ہے کہ سال آئندہ حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالت میں بھی حاضری دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانان ہند یاد کریں گے۔[3] علامہ اقبال کی زیارت حرمین شریفین کی تمنا میں بھی گویا کسی اہم تصنیف کا عزم تھا، جو پورا نہ ہو سکا۔

اسلام کے موضوع پر حضرت علامہ اقبال نے لندن میں چند خطبات دیئے تھے، مگر یہ خطبات بھی کتابی شکل میں شائع نہ ہو سکے۔ نیز بہت سے ایسے مضامین بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف جرائد میں طبع ہوتے رہے، مگر انہیں مرتب کر کے شائع نہ کیا جا سکا۔ ہاں البتہ بعض اصحاب نے کچھ تحریروں، تقریروں، مضمونوں اور خطوں کو یکجا کر کے اقبال کے گراں قدر وافر سرمایہ کا ایک حصہ تو محفوظ کر دیا اور ابھی اقبال کے بہت سے افکار، تحقیق و جستجو کرنے والوں کی راہ تک رہے ہیں۔ اقبال کی تحریروں کے سرمایہ پر اب تک جو کام ہو چکا ہے، اس میں مضامین اقبال، حرف اقبال

---

[1] مکتوب بنام سر راس مسعود، مورخہ ۲۶- اپریل ۱۹۳۵ء، [2] مکتوب بنام سر راس مسعود مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء، [3] ایضاً مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء۔

خطباتِ اقبال Speeches and statements of Iqbal
مقالاتِ اقبال کے علاوہ، شاد اقبال، خطوط اقبال بنام جناح، اقبال کے خطوط بنام عطیہ فیضی مکاتیب اقبال کی دو جلدیں اور خطوط بنام سید نذیر نیازی قابلِ ذکر ہیں،

اقبال کا نثری سرمایہ

حضرت علامہ نے اپنی شاعری کے ذریعے جو بے مثل خدمات انجام دیں، اس کا اعتراف اپنوں کے علاوہ دشمن بھی کرتے ہیں۔ اقبال کے شیدائیوں اور ناقدین کی توجہ کا زیادہ تر مرکز ان کی شاعری ہی رہی ہے۔ یوں تو ان کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر کافی کچھ لکھا گیا ہے مگر اقبال نے نثر کے میدان میں بھی جو کارنامہ انجام دیا، وہ لوگوں کے سامنے اس قدر اجاگر نہیں۔ اب تک اقبالیات میں ۹۸ فیصد مضامین تو ان کی شاعری کے بارے میں ہی شائع ہوتے رہے ہیں، حالانکہ اقبال کے نثری سرمایہ کی حیثیت، ان کے شعری سرمایہ سے زیادہ نہیں، تو کسی صورت کم بھی نہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول اگر شبلی نے حکیمانہ نثر کی آن قائم کر رکھی ہے تو اقبال نے کلیمانہ نثر کا وزن بڑھایا اور اس کا رتبہ اونچا کیا ہے۔[1] لیکن عوام اور پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت اقبال کے اس مرتبہ سے ناآشنا ہے۔ اس لاعلمی کے متعدد اسباب ہیں جو سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ شاعری کی دلآویزی اور جاذبیت نے لوگوں کو کسی اور طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ خود علامہ اقبال نے بھی کچھ اپنی طبعی بے نیازی اور تساہل کے باعث اور کچھ شاید عدم فرصت کے سبب اپنی نثری تحریروں کو وہ اہمیت نہ دی، جس کی وہ واقعتاً حقدار تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ نثر میں ان کا کارنامہ بالعموم نظروں سے اوجھل رہا اور ان کی زندگی کے ہر دور میں فقط اس مضمون یا خطبے کا چند روز چرچا رہا، جو خاص دور میں لکھا یا پڑھایا گیا اور پھر وہ ذہنوں سے اُتر گیا۔[2] الغرض شاعری نے تو اقبال کے دھڑکتے ہوئے دل کو پردے میں چھپا رکھا ہے، جب تک کوئی

---

[1] ماہنامہ ادبی دنیا، اقبال نمبر ص ۱۶۱ [2] اقبال کی عظیم نثر، پروفیسر محمد عثمان بحوالہ مطالعہ اقبال ص ۳۸۷۔

اس کو ہٹانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، وہ دیدار اقبال سے مشرف نہیں ہو سکتا، لیکن نثر میں اقبال کا دھڑکتا ہوا دل ہرگز مستور نہیں، جو چاہے، اور جب خواہش کرے، اس دل کی دھڑکن کو محسوس کر سکتا ہے اور اقبال سے ہمکلام ہو سکتا ہے۔ بقول رئیس احمد جعفری بہت سے نجی اور پرائیویٹ خطوط اقبال نے اپنے دوستوں، قدر شناسوں، عزیزوں اور ملت کے سر برآوردہ اصحاب کے نام لکھے ہیں: انہیں اب تک صرف خطوط کی حیثیت سے پڑھا گیا، لیکن میں نے ان کے بین السطور میں اقبال کا دل دھڑکتا دیکھا ہے، ان خطوں میں اقبال محو تکلم نظر آتے ہیں اور محو جستجو بھی، ان خطوط میں کہیں ایسی باتیں بھی اقبال کی زبان پر آجاتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے، اقبال کا انداز فکر کیا ہے؟ کیسے کیسے سوالات ان کے دل میں آتے ہیں، وہ کس طرح سوچتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں[1]۔ یہ مختصر تجزیہ اقبال کی شاعری اور ان کی نثر کا موازنہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

اقبال کی عظیم نثر کا سلسلہ عین ان کے عالم شباب میں ۱۹۰۴ء میں شروع ہوا اور ان کی حیات کے آخری سال ۱۹۳۸ء تک جاری رہا۔ اس عرصہ کے دوران عالم اسلام کئی مسائل سے دوچار ہوا۔ مسلمانان ہند متعدد مشکلات سے دوچار ہوئے، قومی زندگی میں ابتلاء و آزمائش کے مختلف مراحل آئے، غیروں نے یاوری اور اپنوں نے بے وفائی کی اور اقبال ان ۳۴ برس کے واقعات کو مشاہدات کی صورت میں اپنے ذہن ہی میں نہیں، قلم سے بھی صفحہ قرطاس پر محفوظ کرتے چلے گئے۔ اس عرصہ میں ان کی نثری تحریریں بالتزام اور کہیں کہیں منتشر حالتوں میں ملتی ہیں۔ ان تحریروں کو یکجا کیا جائے، تو برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں نے اقبال کی شاعری اور نثر دونوں کا مطالعہ کیا ہے، ان کی رائے یہ ہے کہ اقبال کی نثر میں بھی وہی خلوص اظہار، گہرائی اور گیرائی، فکر و خیال کی ہم آہنگی اور استدلال کا وہی زور اور احساس کی وہی دردمندی پائی جاتی ہے، جو ان کے اشعار کا طرۂ امتیاز ہے۔ "اقبال نے اپنے شعر سے دلوں کو گرمایا۔ لیکن اپنی نثر کے ذریعے انہوں نے قومی مسائل کو ٹھنڈے دل اور گہری نظر کے ساتھ سمجھنے اور متانت اور معقولیت کے ساتھ بیان کرنے کی ایک اعلیٰ

---

[1] ادبی دنیا، اقبال نمبر ص ۱۶۲

روایت سے ہمیں سرفراز کیا، ہمارے ہاں قومی مسائل سے حقیقت پسندی اور دردمندی کے ساتھ عہدہ برا ہونے کی روایت کا آغاز سید احمد خاں سے ہوتا ہے۔ درمیان میں محسن الملک نواب وقار الملک اور کسی حد تک مولانا حالی، ابوالکلام آزاد، اور مولانا محمد علی جوہر نے اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی، مگر اس روایت کو جو بلندی اور اثر ونفوذ علامہ اقبال کے ہاتھوں نصیب ہوا، اس کی مثال برعظیم پاک وہند میں مسلمانوں کی تاریخ نہ پہلے پیش کر سکتی تھی اور نہ اب کر سکتی ہے۔[1] بے شک اقبال کی نثر کا سرمایہ عظیم اور وقیع ہی نہیں، بیشتر قابل ذکر اور ممتاز نثر نگاروں کی نگارشات سے زیادہ وسیع اور ضخیم بھی ہے

اقبال کا پہلا مضمون "قومی زندگی" کے عنوان سے "مخزن" کے اکتوبر ۱۹۰۴ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ یہ مضمون قدرے طویل تھا۔ اس وقت علامہ اقبال گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ابھی یورپ نہیں گئے تھے۔ اس مضمون میں اقبال نے ڈاروِن کے نظریے میں اور بالخصوص جہد للبقا کے پس منظر میں بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کے خیال کو عام فہم اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ پھر انہوں نے زمانہ حال کی ان اقوام کی نشاندہی کی ہے۔ جو اپنی محنت شاقہ، تنظیم واعتماد اور جدوجہد کی بدولت عروج پر پہنچ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اقبال نے اہل ہند اور مسلمانانِ برصغیر کو بطورِ خاص یہ مشورہ دیا ہے۔ کہ وہ کارگہ حیات میں کامیابی و کامرانی کے حصول کے لئے اپنے تمدن کی اصلاح کریں اور تعلیم کی روشنی کو دور دور تک پھیلائیں۔ مضمون کے آخری حصے میں قومی ترقی کی ضرورتوں پر انہوں نے نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی ہے اور استدلال سے کام لیا ہے نیز مذہبی فکر کے ارتقاء اور جدید زمانے کے تمدنی تقاضوں کے باہمی تعلق کو اجاگر کرتے ہوئے نئی اور پرانی نسل کو دعوت دی ہے کہ وہ غور کرے اور مفاہیم و مطالب کو سمجھے۔ اس ذیل میں حضرت علامہ نے امام ابوحنیفہؒ کی دینی خدمات کا جو ذکر کیا ہے، وہ پڑھنے کے قابل ہے —— فرماتے ہیں:۔

---

[1] مطالعہ اقبال ص ۳۸۹

"اگر مذہب اسلام کی رو سے مجسموں کے ذریعے بڑے بڑے حکماء اور علماء کی یادگاریں قائم رکھنے کا دستور جائز ہوتا تو یہ عظیم الشان فقیہ اس عزت کا سب سے پہلا حقدار تھا۔ دینی خدمت کے اس حصّے یعنی فلسفہ شریعت کی تفسیر و توضیح میں امیر المومنین جناب علیؓ کے بعد جو کچھ اس فلسفی امام نے سکھایا ہے، قوم اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی، لیکن اگر موجودہ حالات زندگی پر غور و فکر کیا جائے تو جس طرح اس وقت ہمیں تائیدِ اصول مذہب کے لئے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے، اسی طرح قانونِ اسلامی کی جدید تفسیر کے لئے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے، جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بنا پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم کر سکے، بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے، جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔[1]"

تمدنی اصلاح کے ضمن میں اقبال نے سب سے پہلے "حقوق نسواں" بیان کئے ہیں اور اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اپنی بچیوں کو سرکاری مدرسوں کے رحم و کرم پر ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیئے، بلکہ ان کی تعلیم کا اپنے طور پر مناسب اور فوری انتظام کرنا چاہیئے۔ پھر اقبال نے "پردے" کے موضوع پر دلچسپ اور خیال افروز بحث کی ہے اور آخر میں مسلمانوں کو محنت، تنظیم اور کفایت شعاری کی تلقین کی ہے۔ "قومی زندگی" سے کم و بیش چھ برس بعد اقبال نے "ملت بیضاء پر ایک عمرانی نظر" ڈالی اور یہ چھ سال اقبال کی ذہنی زندگی کے غالباً اہم ترین سال تھے، کیونکہ اس زمانے میں وہ ایک زبردست فکری انقلاب سے گزر رہے تھے۔ "ملت بیضاء پر ایک عمرانی نظر" دراصل ایک قیمتی لیکچر تھا، جو حضرت علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ء کے آغاز سرما میں اسٹریچی ہال محمڈن کالج علی گڑھ میں دیا تھا۔ یہ لیکچر انگریزی زبان میں اسلام کے نظام معاشرت کے موضوع پر تھا، جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا اور اسے اقبال ہی کی صدارت میں برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں منعقد ہونے والے مئی ۱۹۱۱ء کے جلسہ میں سنایا۔ اس لیکچر کا پس منظر

---

[1] مقالات اقبال سید عبدالواحد معینی

یوں ہے کہ :- ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اقبال انگلستان اور جرمنی میں تھے اور انہوں نے اس شدید نفرت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا، جو یورپ کے نیشنلزم کی بدولت اہل یورپ کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بھڑک رہی تھی ۱۹۰۸ء میں واپس آکر جب اقبال نے اپنے بدلے ہوئے اندازِ نظر کی روشنی میں ہندوستان کی مخصوص سیاسی صورتِ حال کا بغور مطالعہ کیا، تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیئے جدید قومیت کو اپنانا نہ صرف ان کی اپنی جداگانہ ہستی کے لیئے پیغامِ موت ہوگا، بلکہ اس سے خود انسانیت کے بہترین مفاد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ ان کے نزدیک نسلِ انسانی کی بہترین خدمت یہ تھی کہ اس کے سامنے اسلام کے تصوّرِ قومیت کو اجاگر کیا جائے، تاکہ نفرت کی وہ دیواریں ڈھائی جا سکیں، جو جدید نیشنلزم نے قوموں اور ملکوں کے درمیان کھڑی کر دی تھیں۔ "ملتِ بیضاء پر ایک عمرانی نظر" دراصل اقبال کے اس تازہ یقین والقان کا ایک شاہکار ہے[1] اور نفسِ مضمون کا اندازہ خود نام سے ظاہر ہے۔

علامہ مرحوم ادب اور فلسفہ کے علاوہ عمرانیات کے نہایت بالغ نظر ماہر تھے۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس مضمون میں انہوں نے اسلام پر مجلسی اور معاشی نقطہ نظر سے بحث کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حکمت ایمانی اور مصلحت عمرانی کا مطالعہ ایک دوسرے سے تعلق کی روشنی میں خوب دقتِ نظر سے کیا تھا۔ مسلمان کو شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں، سب سے اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے، جو قومی کام کے لیئے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے، یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے، اس کا فرض ہے کہ ہندوستان کی تمام اقتصادی حالت پر نظرِ غائر ڈال کر ان اسباب کا پتہ لگائے، جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ کسی اور مسئلے پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصّہ لیا ہے، جو آجکل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ جو شخص اس گتھی

---

[1] مطالعہ اقبال ص ۳۹۵

کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے، اسے چاہیئے کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرف داری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے۔ اس لئے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں[1]

مضمون کے پہلے حصے میں اقبال نے اسلام کے تصور قومیت کو احسن انداز میں خوبصورتی اور محکم دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور لکھا ہے "ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے، نہ اشتراک وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآبؐ نے قائم فرمائی تھی، اس لئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم کو ترکے میں ملی ہیں، وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں[2]

مضمون کے اس حصے کا تتمہ اقبال کی زبان میں کچھ یوں ہے: اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے، بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا، جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں، بالفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے، جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے، جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی، ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔[3] اس کے بعد اقبال نے مضمون کے دوسرے حصے میں اسلام کی یک رنگی و ہمہ گیری پر خیال آفریں بحث کی ہے اور تیسرے حصے میں ایک ایسے اسلوب سیرت اور نمونہ کردار کی نشاندہی کی ہے، جو ہمارے عہد کی احتیاج کو پورا کرتا ہو۔ اس ضمن میں اقبال نے تیمور، جہانگیر اور اورنگ زیب عالمگیر کے کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے مضمون کے آخر میں اقبال نے حقیقت پسندی اور دردمندی سے اقتصادی احوال کا جائزہ لیتے ہوئے نوجوانوں کو تجارت و صنعت کی طرف مائل

---

[1] قومی زندگی اور ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، پیش لفظ عبداللہ قریشی ص ۷-۸

[2] ایضاً ص ۶۷ [3] قومی زندگی اور ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر ص ۷۵-۷۶

کرنے اور صنعتی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ الغرض "ملت بیضاء پر ایک عمرانی نظر" میں حضرت علامہ نے مذہب، سیاست، تہذیب اور تعلیم و معاشیات کے بارے میں ایسے پختہ اور ایمان افروز افکار کا اظہار کیا ہے کہ اس میں ہمارے قومی کردار کے نقوش جاوداں ملتے ہیں۔ اسی لئے دوربین تجزیہ نگاروں اور مورخوں کے نزدیک اقبال کے اس لیکچر کو پاکستان کا پہلا منشور (Manifesto) قرار دیا جاسکتا ہے۔

اقبال نے اپنی زندگی میں اور بھی کئی مضامین لکھے۔ ان کا آخری مضمون "جغرافیائی حدود اور مسلمان" تھا، جو ان کی رحلت سے چند ماہ قبل لاہور کے روزنامہ "احسان" میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں اقبال نے اسلام، وطنیت اور برِعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کے بارے میں اپنے خیالات کو واضح کیا ہے۔ یہ مضمون اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد مسلمانانِ عالم اور اسلامیانِ ہند کے لئے اقبال نے جو مؤقف اختیار کیا وہ دمِ آخر تک اس پر قائم رہے۔ اس مضمون میں حضرت علامہ نے فرمایا:

> "مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے، اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں، جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟"[1]

اقبال نے نثر نگاری کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی رہبری کی اور ان کی آزادی کے لئے کوشاں رہے۔ ان کے مضامین اسلام کی عالمگیر صداقتوں اور ان کے اپنے کردار کی پاکیزگی اور بے باکی کے مظہر ہیں۔ جن کے مطالعہ سے مسلمانوں کو حال میں رہتے ہوئے بھی نشانِ منزل ملتا ہے۔ ان کی نثر خود ان کی زبان میں ع "نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے" کی طلبگار رہے۔ اقبال کی نثر اور

---

[1] روزنامہ احسان ۲۶ دسمبر ۱۹۳۷ء

شاعری میں فکر کے اعتبار سے تو کوئی فرق نہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ ان کی شاعری کے جام میں نزاکت ہے، لطافت ہے، حسن ہے اور نثر کے جام میں سادگی اور صفائی، بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں۔ یوں کہنا چاہئیے کہ ان کے ہاں شراب تو ایک ہی ہے۔ جام دو قسم کے ہیں۔ شاعری کے جام خوبصورت تھے، اس لئے محفل میں ان کی گردش شروع ہوگئی۔ لیکن نثر کے جام سادہ تھے، اس لئے بہت کم نگاہیں اس طرف متوجہ ہوئیں۔

علم الاقتصاد

علامہ اقبال کی تصنیفات کا زیادہ تر حصہ اگرچہ نظم میں ہے، لیکن ان کی سب سے پہلی کتاب جو شائع ہوئی وہ نثر میں تھی اور اس کا نام "علم الاقتصاد" ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں یہ سب سے پہلی کتاب تھی[1] مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کو ایک خط میں بھی علامہ نے لکھا تھا، تصنیف و تالیف کا سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے، علم الاقتصاد پہ اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی۔[2] آثار اقبال کے مطابق یہ کتاب مسٹر آرنلڈ کی تحریک پر لکھی گئی اور لالہ جیارام صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور مسٹر فضل حسین بی اے، کینٹب بیرسٹر ایٹ لاء نے اس کی تصنیف کے لئے اپنے کتب خانوں کی کتابیں عنایت فرمائیں اور مولانا شبلی علیہ الرحمہ نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی۔

"علم الاقتصاد" ۱۹۰۲ء میں لکھی گئی۔ اس وقت علامہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ سالک مرحوم کے بقول جب علامہ لاہور میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد پروفیسر مقرر ہوئے، ان دنوں انہوں نے اکنامکس پر اردو میں ایک کتاب لکھی۔ جو "علم الاقتصاد" کے نام سے شائع ہوئی، لیکن چونکہ وہ ان کی ابتدائی کوشش تھی اور اس کے بعد اقتصادیات کے نظریات و اصطلاحات وغیرہ میں خاصے تغیرات ہو چکے ہیں، اس لئے وہ اُسے دوبارہ چھاپنے کے روادار نہ ہوئے۔[3] بعد میں منشی محمد دین فوق

---

1. Iqbal, his Art and Thought, P. 10.

2. شاد اقبال ص ۸۵

3. ذکر اقبال ص ۲۹۵

نے لکھا ہے کہ یہ کتاب آج کل نایاب ہے۔ مگر اب اس نایاب کتاب کا ایک نیا ایڈیشن اقبال اکادمی کراچی بڑے اہتمام سے شائع کر چکی ہے اور ماہرین نصاب کی رائے میں یہ کتاب "آج بھی اقتصادیات اور اس کے طالب علموں کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ افلاس آبادی، اقتصادیات اور اخلاق کے باہمی تعلق اور تعلیم جیسے موضوعات پر اقبال نے جن خیالات کا جیسی سلیس، مؤثر اور متین زبان میں اظہار کیا ہے، اس کی افادیت اور رہنمایانہ نشان آج بھی مسلم ہے۔ اور فی الواقعی اکنامکس کے طالب علموں کے لئے یہ کتاب مفید اور نفع مند ہے۔"

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

نثر میں علامہ اقبال مرحوم کی یہ عظیم کاوش تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ The reconstruction of religions Thought in Islam. کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ ان سات فلسفیانہ خطبات کا مجموعہ ہے، جو علامہ اقبال نے مدراس اور حیدرآباد میں ارشاد فرمائے اور آج بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ خطبات حضرت علامہ نے اسلام کے افکار مذہبی کی تشکیل نو کی غرض سے پیش کئے۔ آج یورپ، امریکہ، روس، مشرق وسطیٰ اور برعظیم پاک و ہند کا شاید ہی کوئی عالم ہو، جس نے اسلام، مذاہب عالم اور جدید مسائل حیات میں گہری اور سچی دلچسپی کی خاطر ان سات خطبات کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ علم اور روحانی تجربات، روحانی تجربات کا فلسفیانہ معیار، ذات واجب کا تصور اور حقیقت عادت انائے انسانی اور جبر و اختیار، تمدن اسلامی کی روحیت، نظام اسلام میں روح حرکت یعنی اجتہاد، اس کتاب میں گویا ایک جدید اسلامی علم کلام کے بانی کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں، ان مسائل پر اسلام اور فلسفہ جدید کے رو سے سیر حاصل بحث کر کے مفکرین زمانہ حاضر کے لئے اسلام پر غور و فکر کے دروازے کھول دیئے ہیں۔[۳] "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے

---

[۱] نیرنگ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۲ء ص ۱۲

[۲] اقبال ریویو اپریل ۱۹۶۷ء

[۳] ذکر اقبال ص ۲۹۴

پہلے ایڈیشن میں صرف چھ خطبے شامل تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں آپ کا ساتواں خطبہ بھی شامل کر دیا گیا، جو آپ نے ارسٹائلین سوسائٹی لندن کی درخواست پر ۱۹۳۲ء میں لکھا تھا۔ اس کا موضوع ہے "کیا مذہب ممکن ہے"؟ اس کتاب کا اردو ایڈیشن بھی چھپ چکا ہے۔ مسائل مذکورہ پر علامہ نے اسلام اور فلسفہ کے نقطہ نظر سے بحث کی ہے، اس لئے اس کتاب کو اسلامی علم کلام کی جدید تالیف کہنا زیادہ مناسب ہے۔ الٰہیات و طبیعیات کے دقیق مسائل پر متکلمین نے جس قدر اضافے کئے ہیں، ان کو علامہ نے انگریزی خواں طبقہ کی رہنمائی کے لئے خوش اسلوبی سے اس کتاب میں درج کیا ہے۔ شاعری کے علاوہ علامہ اقبال کے منظم فکر پر آگاہی حاصل کرنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کا مطالعہ کیا جائے۔

ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سے قبل اقبال نے وہ کتاب لکھی تھی، جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ فلسفۂ ایران پر انگریزی میں تھی۔ یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں انگلستان میں شائع ہوئی۔ اردو میں "فلسفۂ عجم" کے نام سے اس کا ترجمہ میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) نے کیا، مترجم کی حیثیت سے وہ اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں، ۱۹۲۷ء میں علامہ اقبال سے اس ناچیز نے اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ علامہ موصوف نے ازراہ کرم اجازت دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ یہ کتاب اس سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی، اس وقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سے انقلابات آ چکے ہیں، جرمن زبان میں غزالی، طوسی وغیرہ پر علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں۔ میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصّہ ہے، جو تنقید کی زد سے بچ سکے، الغرض ۱۹۰۸ء میں علامہ اقبال نے اپنی ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالہ ایران کے مابعد الطبیعیاتی اور متصوفانہ افکار کی تاریخ پر تحریر کیا تھا، وہ افکار کی ثروت، مصنف کی ناقدانہ نظر اور محققانہ تلاش و ترتیب کے

---

[1] سیرت اقبال طاہر فاروقی ص ۲۷۰۔

باعث ان گنت ارباب فکر و نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اور اس کی افادیت اور شہرت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

اسرارِ خودی

اقبال کی نثری تخلیقات کے بعد وہ شعری تصانیف مستقل حیثیت رکھتی ہیں، جو اقبال کی زندگی میں دو دو چار چار سال کے وقفوں سے شائع ہوتی رہیں اور جن سے علامہ اقبال کے فکر کی عظمت کا غلغلہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا۔ اسرار خودی اس سلسلے کی پہلی مستقل تصنیف ہے جو فارسی میں ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کا آغاز تو اردو سے ہوا تھا اور انہوں نے بہت تھوڑے دنوں میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی، اسی لئے ابتدا ہی سے اردو کلام کے مجموعے کی ترتیب و اشاعت کا تقاضا ہو رہا تھا، لیکن چونکہ کلام اس قدر نہ تھا کہ اسے ایک باقاعدہ مجموعہ کی شکل دی جا سکتی، اس لیے اقبال عوام کے تقاضا کو اس وقت بحسن و خوبی پورا نہ کر سکے، اس کا ذکر انہوں نے منشی سراج الدین کے نام اپنے خط محررہ ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء میں ان الفاظ میں کیا "ترتیب اشعار کی خود مجھے فکر ہو رہی ہے، مگر یہ خیال ہے کہ ابھی کلام کی مقدار تھوڑی ہے، بہر حال جب یہ کام ہو گا، تو آپ کے صلاح و مشورہ کے بغیر نہ ہو گا"[1] اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں اقبال انگلستان چلے گئے۔

یورپ میں قیام کے دوران علامہ اقبال کے خیالات میں جو انقلابات و تغیرات رونما ہوتے، انہوں نے ان کو ایک پر جوش مسلمان بنا دیا اور انگلستان سے واپسی کے بعد یہی پر جوش خیالات ان کی نظموں میں ظاہر ہونے لگے۔ اس طرح ان کی شاعرانہ شہرت میں اور بھی غیر معمولی اضافہ ہوا لیکن اس کے باوجود ان کے اُردو کلام کا مستقل مجموعہ شائع نہ ہو سکا، بلکہ سب سے پہلے ان کی ایک فارسی مثنوی اسرار خودی، کے نام سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اور یہی وہ مثنوی تھی، جو یورپ اور امریکہ میں حضرت علامہ کی شہرت و توقیر کا باعث بنی۔

"اسرار خودی" کو علامہ اقبال نے سر سید علی امام مرحوم کے نام نامی سے معنون کیا اور اس

---

[1] اقبال نامہ ص ۲۱

کے پہلے اڈیشن کے دیباچہ میں لکھا۔ یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پُراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ خودی یا انا یا میں، جو اپنے ردعمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے، مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد واقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی، جس کے حکماء وعلماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔

اقبال مزید لکھتے ہیں: مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے، جو عمل سے لازوال ہوسکتی ہے، مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب وغریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نکتہ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی، جس نے مسلمانوں کے ذہن و دماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے، شیخ اکبر کے علم وفن اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانیؒ اور فخرالدین عراقیؒ ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودہویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگین ہو گئے —— آخر میں فرماتے ہیں:۔

"میں نے اس دقیق مسئلہ کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔۔۔ یہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے۔"

حکیم الامت علامہ اقبال سے قبل "خودی" کا لفظ عام طور پر کبر و غرور کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا اور صرف فلسفہ و تصوّف کی کتابوں میں "نفس" کے مفہوم پر دلالت کرتا تھا اور جس کو دبانے اور مغلوب کرنے پر روحانی ارتقاء کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔ علامہ اقبال نے ۱۹۱۴ء کے جلسہ انجمن حمایت اسلام میں پہلی بار اپنا فلسفہ خودی پیش کیا اور بتایا کہ "خودی" کا حقیقی مفہوم انسان کی "انا" ہے اور یہ وحدت وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے، جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں "اس تصنیف میں علامہ نے مختلف طریقوں سے ثابت کیا ہے کہ تمام کائنات خودی کی تابع فرمان ہے، جب خودی کے ساتھ عشق کا امتزاج ہوتا ہے، تو خودی تمام عالم وماورائے عالم پر چھا جاتی ہے۔ خودشکنی اقبال کے نزدیک گناہ عظیم ہے اور خودگری اور خودشناسی مقصد حیات[1]" اس لئے حضرت علامہ نے "اسرار خودی" کے ذریعے عرفان خودی کی راہ بتائی ہے اور ان مدارج سے آگاہ کیا ہے جن سے گزر کر خودی تکمیل کی معراج پا سکتی ہے اور عارف خودی کو خلیفۃ اللہ فی الارض کا اہل بنا دیتی ہے۔

اقبال اپنے وطن میں برسوں زمزمہ پرداز رہے۔ ان کی قدر و منزلت ان کی زندگی میں بھی ہوئی لیکن انگریزی خواں نوجوان طبقہ کے کان درحقیقت ان کی سامع نوازی سے اسی وقت لذت گیر ہوئے۔ جب کیمبرج کے پروفیسر نکلسن نے ان کی مثنوی "اسرار خودی" کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ دیباچہ میں پروفیسر نکلسن نے لکھا ہے: اسرار خودی، پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں بمقام لاہور شائع ہوئی۔ میں نے اسی زمانہ میں اسے پڑھا اور اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اقبال کو جن سے میری کیمبرج میں ملاقات ہوئی تھی، اس کے انگریزی ترجمہ کی اجازت کے لئے لکھا۔ اس کے بعد پروفیسر نکلسن لکھتا ہے:

"اقبال ایک ہندوستانی مسلمان ہے۔ اس نے مغربی ممالک میں رہ کر موجودہ فلسفہ کا اچھی طرح مطالعہ کیا ...... اس کا پیغام نہ صرف مسلمانان ہند کے لئے

---

[1] سیرت اقبال ص ۲۶۷

مخصوص ہے۔ بلکہ وہ تمام عالم اسلامی کے لئے ہے، چنانچہ اسی مقصد کو مدنظر رکھ کر اس نے اُردو کی جگہ فارسی کو ادائے مطلب کے لیئے منتخب کیا ہے، کیونکہ اوّل تو فارسی دنیائے اسلام میں بہت زیادہ مقبول ہے، دوسرے فلسفیانہ خیالات جس خوبصورتی اور وضاحت سے اس زبان میں ادا ہو سکتے ہیں۔ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں"

پروفیسر نکلسن نے دیباچہ میں مزید لکھا ہے: پہلے پہل جب اسرار خودی عالم وجود میں آئی، تو اس نے ہندی نوجوانوں کو محو حیرت کر دیا۔ بہت سوں نے کہا کہ اقبال کا وجود ایک مسیحا سے کم نہیں کہ اُس نے ہماری مردہ لاش میں جان ڈال کر اسے متحرک کر دیا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے اسرار خودی کے پیغام کے ذریعے مسلمانوں کو زندہ قوموں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا

رموزِ بیخودی

شاعر اقبال ابتدا ہی میں ایک شعلہ بیان شاعر تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد تو ان کے انداز بیان میں اور بھی جوش اور لطف پیدا ہو چکا تھا، لیکن "اسرار خودی" کی اشاعت کے ساتھ ہی ان کی حیثیت ایک فلسفی اور مفکر کی ہو کر رہ گئی۔ اور شاعری کی دنیا سے نکل کر ایک دوسرے عالم میں آگئے اور خود اعلان فرمایا کہ ؎

شاعری زین مثنوی مقصود نیست ۔۔۔ بت پرستی بت گری مقصود نیست
حسن انداز بیان از من مجو ۔۔۔ خوانسار و اصفہان از من مجو

شاید یہی اعلان تھا کہ "ڈاکٹر صاحب کے آتش فشاں اردو کلام کے مقابلہ میں ابتداءً ان کی فارسی مثنوی ان کے شیدائیوں اور عقیدت مندوں کو بے جان اور سرد معلوم ہوئی"[1] پھر جب اسرار خودی کا دوسرا حصہ "رموز بیخودی" کے نام سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ تو بعض ناقدین

---

[1] آثار اقبال ص ۲۰۵

کی رائے ہیں ان کی ادبی حیثیت اور شاعرانہ عظمت کو اس سے مزید نقصان پہنچا، جیسا کہ عبدالواحد علیگ کا خیال ہے۔ بقول ان کے "یہ مثنویاں جا بجا تو منشی کا پتہ دیتی ہیں۔ خصوصاً "رموز بیخودی" جس میں بے رس فلسفہ اور واعظانہ رنگ زیادہ ہے اور شعریت کم۔ اپنے شاعرانہ کمال کے بہترین نمونے اقبال نے بعد میں پیش کئے، جن کے آگے یہ مثنویاں پھیکی ہیں"[1] مگر یہ رائے زیادہ درست ثابت نہ ہوئی اور حقیقت پسند ناقدین کو بلا تعصب یہ تسلیم کرنا پڑا کہ:

"مثنویاں تو بہت لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ لیکن یہ امتیاز شاید کسی کو حاصل ہو کہ ملک و قوم تک کوئی ضروری پیغام پہنچانے کے لئے مثنوی کو ذریعہ اظہار خیال بنایا جائے۔ خدا جزائے خیر دے شیخ محمد اقبال کو، جنہوں نے اس زمانہ انحطاط میں ملت اسلامیہ کو مثنوی "اسرار خودی" کے ذریعے سے پیغام عمل دیا ہے اور "رموز بیخودی" میں مژدہ حیات سنایا ہے۔

دنیا میں سب سے بڑی مثنوی غالباً مثنوی مولانا روم علیہ الرحمۃ ہے، جس کو اسلامی ممالک میں اکثر لوگ قرآن مجید کے بعد اعلیٰ درجہ کی مذہبی کتاب سمجھتے ہیں اور "قرآن در زبان پہلوی" کا خطاب دیتے ہیں، اس کی زبان ایسی سلیس اور انداز بیاں ایسا دل نشین ہے کہ خاص و عام میں مقبول ہے۔ یہ عالیشان ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ اس کی کئی ضخیم جلدیں ہیں، جن میں کلام الٰہی کے ضروری مسئلے جا بجا عام فہم پیرایہ میں اور مثالوں اور حکایتوں کے ذریعے لوگوں کو سمجھائے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد مذہب اسلام کی خدمت ہے۔ تصوف کا عنصر اس میں غالب ہے اور اس لئے یہ کتاب علماء اور صوفیہ دونوں میں مقبول ہے اور فلسفی بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" میں طرز مثنوی مولوی کا تتبع کیا گیا ہے"[2]

مثنوی "رموز بیخودی" کی پہلی اشاعت کے بعد یہ تبصرہ شیخ عبدالقادر نے کیا تھا، جو اعلیٰ پایہ

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۵۳ [2] مخزن

کے نقاد ہونے کے علاوہ سب سے بڑے اقبال شناس بھی تھے۔" بانگ درا" کے مقدمہ کے سلسلے میں حضرت علامہ کی نگہ انتخاب ان ہی پر پڑی تھی۔ اس سے رموز بیخودی کی حیثیت کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ جس طرح اسرار خودی میں اقبال نے فرد میں احساس نفس کے نشوونما کی طرف توجہ دلائی تھی، اسی طرح "رموز بیخودی" میں انہوں نے قومی و ملی انا، کے تسلسل کو محفوظ و قائم رکھنے کے رموز و اسرار بیان کئے اور اس کے دیباچے میں خود فرمایا: جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعیین عمل و ذوق حقائق عالیہ، احساس نفس کے تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے، اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر "قومی انا" کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیات ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افراد قوم کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں، تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقص مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے، افراد کی صورت میں احساس نفس کا تسلسل قوت حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے، گویا قومی تاریخ حیات ملیہ کے لئے بہ منزلہ قوت حافظہ کے ہے، جو اس کے مختلف مراحل کے حیات و اعمال کو مربوط کر کے "قومی انا" کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نقطہ کو مدنظر رکھ کر میں نے ملت اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ امت مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطہ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبال کا لکھا ہوا یہ دیباچہ صرف پہلے ہی ایڈیشن میں شائع ہو سکا۔ اس مثنوی میں علامہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ حیات ملی کے لئے بہترین ضابطہ وہ ہے۔ جو اسلام نے مہیا کیا ہے۔ بظاہر "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" کے ناموں کو دیکھا جائے تو گمان ہوتا ہے کہ حضرت اقبال نے اضداد کے جمع کرنے کی سعی کی ہے۔" اور یہ نکتہ چینی زبان قلم سے بے اختیار نکلنے کو ہوتی ہے کہ پہلے تو ملت اسلامیہ کو پیغام دیا کہ اس کا ہر فرد خودداری سیکھے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد زیست کے میدان میں مردانہ وار کارزار کے لئے تیار ہو اور پھر دوسری کتاب میں خود ہی خودی سے بیگانہ بن کر بیخودی کا جادۂ فرسودہ اختیار کر لیا۔ لیکن جب

"رموزِ بیخودی" کو غور سے پڑھیں تو یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔ اوّل تو یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے "رموزِ بیخودی" میں ان اصولوں سے بالکل انحراف نہیں کیا جو "اسرارِ خودی" میں اصولِ زندگی قرار دیئے گئے تھے اور دوسرے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں افراد کے لئے خودی اور خودداری ذریعہ استواری ہے، وہیں افراد کا اپنی ہستی، ہستی قومی میں محو ہو کر دینا اور اپنی انفرادی زندگی کے جزو کو قومی زندگی کے کل میں شامل کر دینا قومی ترقی کے لئے لازم ہے اور اس کو "بیخودی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا یہ وہ بیخودی ہے، جو خودداری اور خودشناسی کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جو فرد و قوم دونوں کے لئے عین نفع ہے[1] اس کے بعد اقبال نے بتایا ہے کہ ربطِ افراد کا نام ہی ملّت ہے اور قوم کا اندازِ نظر بدل دینا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اقبال نے "رموزِ بیخودی" میں یہ بھی بتایا ہے کہ یاس و ناامیدی قومی زندگی کے لئے زہر کا حکم رکھتی ہے، اس لئے سوائے خدا کے کسی سے ڈرنا شانِ ایمان کے خلاف ہے پھر ملّتِ اسلامی کی خصوصیات پر معنی اشعار میں بیان کی گئی ہیں کہ حریت اور مساوات اس ملت کی سرشت میں داخل ہیں۔ مثنوی کا یہ حصہ بڑا جاندار ہے۔ آخری باب میں اقبال نے مثنوی کے مطالب کا خلاصہ اور سورۂ قل ھو اللّٰہ احد کی تفسیر کی ہے۔ کتاب کا تتمہ عرضِ حال مصنف پر ہوتا ہے، جو بارگاہِ رسالت مآب میں کی گئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی دردانگیز حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ اپنی منزل سے بہت دور نکل چکے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے راہِ راست پر آنے کی دعا کی گئی ہے۔

"رموزِ بیخودی اور "اسرارِ خودی" — دونوں مثنویاں بظاہر مسلمانوں کے لئے ہیں۔ لیکن درحقیقت اقبال کا مخاطب تمام عالم ہے۔ ان کے ذریعہ انہوں نے عہدِ حاضر کے ان تمام غلط نظریوں کا ابطال کیا ہے، جو ملتِ اسلامیہ کے بارے میں قائم کئے گئے ہیں اور مسلم اقدار کی حفاظت، بقا، تسلسل اور ترقی کے لئے صحیح رہنمائی کی ہے۔ ان دونوں مثنویوں کے بعد ایک بات رہ جاتی ہے اور اس بات کی طرف خود علامہ نے یوں اشارہ کیا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص الہیئت جماعت کا انحطاط زائل کرنے

---

[1] ادبی دنیا، اقبال نمبر ص ۵۷

اور اس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصّوں میں آچکا ہے، مگر مفصل جواب کے لئے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیئے، اگر وقت نے مساعدت کی، تو اس مثنوی کا تیسرا حصّہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔[1]

اسی طرح حضرت علامہ نے اپنے ایک مکتوب محررہ ۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں فرمایا: یہ مثنوی[2] دو سال کے عرصہ میں لکھی گئی، مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجود صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصہ بھی ہوتا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصّہ اس حصّہ سے زیادہ لطیف ہوگا۔ کم از کم مطالب کے اعتبار سے، گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے، جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔ ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں، جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم کے منہ سے ہوئی، صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشاء اللہ دوسرے حصّے میں دکھاؤں گا کہ تصوّف کیا ہے؟ اور کہاں سے آیا؟ صحابہ کرامؓ کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے، جس کا تصوف حامی ہے[3] چنانچہ اقبال نے اپنی آرزو کے مطابق "اسرار خودی" کا دوسرا حصہ "رموز بیخودی" مکمل کیا اور بعد ازاں یہ دونوں مثنویاں "اسرار و رموز" کے نام سے یکجا کر دی گئیں۔

---

[1] دیباچہ "اسرار خودی"، اولین ایڈیشن

[2] اشارہ "اسرار خودی" کی طرف ہے

[3] مکتوب بنام منشی سراج الدین بحوالہ مکاتیب اقبال۔

پیامِ مشرق

"اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی" دونوں مثنویوں کے بعد اگرچہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے اردو کلام کا سلسلہ بھی جاری رکھا، تاہم انہوں نے اپنی زیادہ توجہ فارسی شاعری کی طرف مرکوز کئے رکھی اور اس ضمن میں جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے "مغربی دیوان" کا جواب لکھنا شروع کیا، جس کا نام انہوں نے "پیام مشرق" تجویز کیا۔ اس بات کا اشارہ علامہ کے اس خط میں بھی ملتا ہے، جو انہوں نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو لکھا۔ سید سلیمان ندوی کو مطلع فرماتے ہیں فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں، جس کا قریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے، کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی، کچھ اردو میں[۱]۔ لیکن اس وقت تک "پیام مشرق" کا جو نسخہ چھپ رہا ہے۔ اس میں اردو کی کوئی نظم نہیں، ممکن ہے کہ عجلت میں رہ گئی ہوں، کیونکہ علامہ اقبال نے ۱۷ اپریل ۱۹۲۲ء کے اپنے ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو لکھا ہے: "پیام مشرق" اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گی، چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں، لیکن افسوس ہے، انہیں ختم نہ کر سکا۔ فکرِ روزی قاتلِ روح ہے، یکسوئی نصیب نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ والد مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے[۲]۔ بنابریں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اسرار خودی اور رموز بیخودی نے بعض ناقدین کی رائے میں ان کی شاعرانہ حیثیت سے اقبال کے کلام میں جو خشکی اور یابسیت پیدا کر دی تھی۔ "پیام مشرق" نے اس کی تلافی کر دی۔ عبدالواحد ہی اپنے تجزیہ میں لکھتے ہیں:

> "اسرار اور رموز میں واعظانہ رنگ غالب ہے، فلسفہ زیادہ چھانٹا گیا ہے اور شعریت کم۔ پیام مشرق کی اشاعت سے فلسفیت کم اور شعریت بڑھنے لگتی ہے اور نومشقی کا دور ختم ہو جاتا ہے، اسرار اور رموز کی شراب سانچے میں ڈھل جاتی ہے[۳]۔"

---

[۱] اقبال نامہ ص ۱۰۷ — [۲] ایضاً ص ۲۳۴

[۳] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۸۸

"پیام مشرق" ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور اس کے دیباچہ میں خود حضرت علامہ نے لکھا: "پیام مشرق" کی تصنیف کا محرک جرمن حکیم حیات گوئٹے کا "مغربی دیوان" ہے جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے" یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے، جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے .... اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے" گوئٹے کا یہ مجموعۂ اشعار جو اس کی بہترین تصانیف سے ہے اور جس کو اس نے خود "دیوان" کے نام سے موسوم کیا ہے، کن اثرات کا نتیجہ تھا۔ اور کن حالات میں لکھا گیا، اس سوال کا جواب دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختصر طور پر اس تحریک کا ذکر کیا جائے، جس کو اطالوی ادبیات کی تاریخ میں "تحریکِ مشرقی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے بعد اقبال نے لکھا ہے: ابتدائے شباب ہی سے گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت مشرقی تخیلات کی طرف مائل تھی، سٹراس برگ میں جہاں وہ قانون کے مطالعہ میں مصروف تھا، اس کی ملاقات جرمن لٹریچر کی مشہور اور قابلِ احترام شخصیت ہرڈر سے ہوئی، جس کی صحبت کے اثرات کو گوئٹے نے خود اپنے سوانح میں تسلیم کیا ہے۔ ہرڈر فارسی نہ جانتا تھا، لیکن چونکہ اخلاقی رنگ اس کی طبیعت پر غالب تھا، اس لئے سعدی کی تصانیف سے اسے نہایت گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ "گلستان" کے بعض حصوں کا اس نے جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ خواجہ حافظ کے رنگ سے اسے چنداں لگاؤ نہ تھا۔ اپنے معاصرین کو سعدی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتا ہے۔ "حافظ کے رنگ میں ہم بہت کچھ نغمہ سرائی کر چکے اس وقت سعدی کے تلمذ کی ضرورت ہے۔" لیکن باوجود اس دلچسپی کے جو ہرڈر کو مشرقی لٹریچر سے تھی، اس کے اپنے اشعار اور دیگر تصانیف پر مشرقی لٹریچر کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا۔

گوئٹے کا مشہور سوانح نگار "بیل شوشکی" تھا۔ اقبال نے "پیام مشرق" میں اسی کے حوالے سے لکھا ہے: بلبلِ شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش و

حرارت، وہی وسعت مشرب، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی! غرضیکہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار ہے، اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہانِ معنیٰ آباد ہے، اسی طرح گوئٹے کے بیساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شکست سے متاثر کیا یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی سکون و اطمینان کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔

اس کے بعد علامہ اقبال نے لکھا ہے: خواجہ حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیلات میں شیخ عطار، سعدی، فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے۔ ایک آدھ جگہ ردیف و قافیہ کی قید سے غزل بھی لکھی ہے۔ اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی مثلاً گوہر اشعار، تیر مژگان، زلف گرہ گیر" بے تکلف استعمال کرتا ہے، بلکہ فارسیت کے جوش میں امرد پرستی کی طرف اشارات کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتا، دیوان کے مختلف حصوں کے نام بھی فارسی ہیں، مثلاً مغنی نامہ، ساقی نامہ، عشق نامہ، تیمور نامہ، حکمت نامہ وغیرہ باوجود ان سب باتوں کے گوئٹے کسی فارسی شاعر کا مقلد نہیں اور اس کی شاعرانہ فطرت قطعاً آزاد ہے۔ مشرق کے لالہ زاروں میں اس کی نوا پیرائی محض عارضی ہے، وہ اپنی مغربیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا اور اس کی نگاہ صرف انہیں مشرقی حقائق پر پڑتی ہے، جن کو اس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے ..... غرضیکہ مغربی دیوان کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعد کے شعرا پلاٹن، روکرٹ اور بوڈن شاٹ نے اس مشرقی تحریک کو جس کا آغاز گوئٹے کے دیوان سے ہوا، تکمیل تک پہنچایا۔

اپنے اس جامع دیباچہ کو حضرت علامہ اقبال نے ان الفاظ میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے:

پیام مشرق کے متعلق جو مغربی دیوان سے سو سال بعد لکھا گیا ہے، مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کریں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی مذہبی اور ملی حقائق کو

پیش نظر لانا ہے، جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے۔ ۔ ۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے، مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِاَنْفُسِہِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

گوئٹے نے اپنے دیوان میں مغرب میں روحانیت کے فقدان کا ماتم کیا ہے اور وہ مشرق سے بھی اس پیغام کا متوقع تھا۔ سو اقبال کی زبان سے سو سال بعد یہ پیغام مغربی ممالک کے نام ادا ہوا۔ چنانچہ "پیام مشرق" میں اخلاق، مذہب اور معاشرت کے وہ اسباق ملتے ہیں، جو افراد و ملت کی زندگی کے ذمہ دار بن سکتے ہیں، یورپ کی تصویر ان تخیلات کے ماتحت پیش کی گئی ہے، جو مشرق نے مغرب کی بابت قائم کئے ہیں[1]۔ یوں مغربی عقائد و نظریات کے نقائص ظاہر کر کے اقبال نے بتایا ہے کہ یورپ کے لئے صحیح شاہراہ کون سی ہے اس پیغام میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ مغرب کی مادیت، جوش اور زندگی سے معرا ہے اور احساس، جوش، حرکت، عمل اور عشق کے جذبات پیدا کرنے پر زور دیا ہے اور یورپ کو یہ بات باور کرا دی ہے کہ روحانیت کا درس حاصل کئے بغیر زندگی کے اعلیٰ مدارج کا حصول ممکن نہیں۔

"پیام مشرق" پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں، تو یہ چار حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّہ میں جس کا عنوان "لالہ طور" ہے، قطعہ نما رباعیات ہیں، جن میں لطفِ زبان کے

---

[1] سیرت اقبال، ص ۲۰۲

ساتھ ساتھ خودی کے وجد آفریں رموز بھی ملتے ہیں، دوسرے حصّے میں "افکار" کے عنوان کے تحت گل نخستین، دعا، تسخیر فطرت، ہلال عید، بوئے گل، نوائے وقت، فصل بہار، افکار انجم، علم و عشق، سرود انجم، قطرۂ آب، شاہین و ماہی، شبنم، حکمت فرنگ، جوئے آب، نادعالمگیر، بہشت اور کشمیر کے علاوہ اور کئی چھوٹی چھوٹی نظمیں نظم کی گئی ہیں، ان میں سے اکثر نظموں میں اقبال کا رنگین تخیل فارسی، تغزل کے رنگوں کے پھول برساتا ہے۔ جب کہ "پیام مشرق" کے تیسرے حصّے میں خواجہ حافظ کے مشہور مصرعہ ؏ بدہ ساقی مئی باقی سے "مئی باقی" کے عنوان کے تحت علامہ اقبال حافظ کے رنگ میں نہایت پرجوش اور مستانہ انداز میں غزلیں کہی ہیں۔ چوتھے اور آخری حصّے کا عنوان "نقش فرنگ" ہے اور اس میں مغرب کے بعض حکما اور مشاہیر مثلاً نطشے، برگساں، ہیگل، ٹالسٹائی، ہائنا اور بائرن وغیرہ پر شاعرانہ طرز میں پُرلطف تبصرے منظوم ہیں۔

بانگ درا

اگرچہ علامہ اقبال کی شہرت اردو کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی، تاہم اب تک ان کی جو تین کتابیں شائع ہوئیں، وہ سب کی سب فارسی میں تھیں اور ہر طرف سے تقاضا ہو رہا تھا کہ حضرت علامہ اردو کلام کا مجموعہ بھی جلد از جلد شائع کرائیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، مثنوی اسرار خودی اور رموز بیخودی سے پہلے اقبال نے جو نظمیں لکھیں، وہ تقریباً تمام اردو میں تھیں۔ پیام مشرق کی تصنیف کے دوران بھی وہ اردو شاعری سے غافل نہ رہے اور برابر نظمیں کہتے رہے۔ اسی دور میں شکوہ جواب شکوہ، شمع و شاعر، طلوع اسلام اور خضر راہ ایسی ہنگامہ خیز نظمیں مشہور ہوئیں۔ احباب کا تقاضا ۱۹۰۲ء سے تھا کہ اقبال اپنی اردو نظموں کا کوئی مجموعہ ترتیب دیں۔ خود حضرت علامہ بھی اس تقاضے کو پورا کرنے کے بارے میں بڑے متفکر تھے، لیکن چونکہ کلام کی مقدار تھوڑی تھی، اس لئے وہ اس کو مرتب نہ کر سکے۔ اس کے بعد ان کی چند اور پُرجوش اور ولولہ انگیز نظمیں شائع ہوئیں، تو یہ تقاضا اور بڑھا۔ تقاضا کرنے والوں میں مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے، جن کے نام حضرت علامہ نے اپنے ایک مکتوب

محررہ ۳-اپریل ۱۹۱۹ء میں لکھا: مجموعہ اب تک مرتب نہ ہو سکنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اب ان تمام لفظوں پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہوں، جس کے لئے فرصت نہیں ملتی، انشاءاللہ بعد از نظر ثانی شائع کروں گا۔[1] چنانچہ پیام مشرق کی اشاعت کے بعد اور زبور عجم کی اشاعت سے پہلے حضرت علامہ اقبال نے ۱۹۲۴ء میں "بانگ درا" کے نام سے اپنی اردو نظموں اور غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا اور اس کے دیباچہ کے لئے سر عبدالقادر کو زحمت دی۔ انہوں نے لکھا:-

"کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اُردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادب اردو کے فروغ کا باعث ہوں گے۔ مگر زبان اُردو کی خوش اقبالی دیکھئے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا، جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو داں دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔ غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا، تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اُس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔

اس کے بعد سر عبدالقادر نے علامہ اقبال کے بچپن اور تعلیمی زندگی کو بیان کیا ہے اور پھر ۱۹۰۱ کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، جب انہوں نے پہلی بار اقبال کو ایک مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ آخر میں انہوں نے لکھا ہے: اقبال کا اردو کلام جو وقتاً فوقتاً ۱۹۰۱ء سے لے کر آج تک رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوا۔ اور انجمنوں میں پڑھا گیا۔ اُس کے مجموعہ کی اشاعت کے بہت لوگ خواہاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے احباب بارہا تقاضا کرتے تھے۔ کہ اردو کلام کا مجموعہ شائع کیا جائے، مگر کئی وجوہات سے آج تک مجموعہ اردو شائع نہ ہو سکا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر اب شائقین کلام اردو کی یہ دیرینہ آرزو بر آئی اور اقبال کی اردو نظموں کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ جو تین سو چھتیس صفحوں پر مشتمل ہے اور

تین حصوں پر منقسم ہے۔[1] اس کے پہلے حصے میں ۱۹۰۵ تک کی وہ نظمیں ہیں، جو ہمالہ، گل رنگین، عہد طفلی، مرزا غالب، ابر کوہسار، بچے کی دعا، ہمدردی، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، شمع و پروانہ، صدائے درد، شمع گو شاعر، دل، تصویر درد، نالہ فراق، چاند، بلالؓ، سرگزشت آدم، ترانہ ہندی، جگنو، صبح کا ستارہ، نیا شوالہ، بچہ اور شمع اور ایک آرزو، سے مسافر ایسی مشہور نظمیں قابل ذکر ہیں۔ حصہ دوم میں محبت، حقیقت حسن، پیام، حسن و عشق، کلی، چاند اور تارے، عاشق ہرجائی، کوشش ناتمام، نوائے غم، عشرت امروز، انسان، جلوہ حسن، ایک شام، تنہائی، پیام عشق، فراق، عبدالقادر کے نام، صقلیہ سمیت ۲۴ نظمیں شامل ہیں یہ دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی شاعری کا ہے۔ ان ہر دو حصوں میں غزلیات کی تعداد ان منظومات کے علاوہ ہے۔ "بانگ درا" کے حصہ سوم میں ۱۹۰۸ء کے بعد کے زمانہ کا اردو کلام شامل ہے۔ اور اس میں تقریباً ستر نظمیں ہیں۔ ان میں بلاد اسلامیہ، ستارہ، گورستان شاہی، نمود صبح، فلسفہ غم، پھول کا تحفہ عطا ہونے پر، ترانہ ملی، وطنیت، ایک حاجی مدینے کے راستے میں، شکوہ، چاند، رات اور شاعر، سیر فلک، خطاب بہ جوانان اسلام، غرہ شوال یا ہلال عید، شمع اور شاعر، مسلم، حضور رسالت مآبؐ میں، جواب شکوہ، قرب سلطان، دعا فاطمہ بنت عبداللہ، شبنم اور ستارے، میں اور تو، شبلی و حالی، صدیقؓ، والدہ مرحوم کی یاد میں، بلالؓ، شب معراج، پھول، دریوزہ خلافت، خضر راہ اور طلوع اسلام قابل ذکر ہیں۔ آخر میں ظریفانہ کلام بھی ہے، جو خواجہ حسن نظامی صاحب کی زبان میں اکبری اقبال کا کلام کہا جائے تو زیبا ہے،

"بانگ درا" میں علامہ اقبال کی بعض ایسی طویل نظمیں شامل نہیں ہیں، جو انجمن حمایت اسلام میں پڑھی جا چکی تھیں اور بعض کے اکثر حصے قلمزد کر دیئے گئے، بہرکیف "بانگ درا" اقبال کی خوبصورت تصنیف ہے، جس میں شامل نظمیں اور غزلیں، اپنے دور میں ہی نہیں، بلکہ آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں اور ان سے اقبال کی رفتار فکر اور ان کے شاعری کے ارتقاء کا اندازہ بوجہ احسن لگایا جا سکتا ہے۔ مختصراً "اس مجموعہ میں مشاہدات، تاثرات و کیفیات ہیں، جو شاعر اعظم پر مطالعہ فطرت اور مشاہدہ قدرت سے مرتب ہوئے، حسن و عشق کی تفسیر آرٹ کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے اور صوفیانہ روحانیات کی غمازی کرتی ہے۔ ہم اقبال کو اس مجموعہ میں وطنی شاعر کی

---

[1] دیباچہ بانگ درا ص س

حیثیت سے بھی دیکھ سکتے ہیں اور اسلامی شاعر کے اعتبار سے بھی یہ کتاب آثارِ حیات سے لبریز ہے، حسن و عشق، تصوف، فطرت نگاری، طعن وطنز، تعلیم اخلاق اور تبلیغ مقصدِ زندگی سبھی کچھ اس میں موجود ہے۔[1] الغرض "بانگ درا" اقبال کی ایک لافانی تصنیف ہے۔

زبورِ عجم

"پیام مشرق" اور "بانگ درا" کی اشاعت کے بعد زبورِ عجم شائع ہوئی، علامہ اقبال کی فارسی نظموں اور غزلوں کا یہ مجموعہ ۱۹۲۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ۶۶ نغمے ہیں جن میں بظاہر رنگ تغزل بھی جھلکتا ہے، لیکن وہ در حقیقت اقبال کے وجد آفریں اور پرجوش ترانے ہیں اور حضرت علامہ نے اس بارے میں خود ہی فرمایا ہے ؎

غزل سرائے و نوا ہائے رفتہ باز آور
بایں فسردہ دلاں حرفِ دلنواز آور

ان ترانوں کے ذریعے گویا انہوں نے افسردہ دلان ہند کے قلب میں زندگی کی حرارت پیدا کرنی چاہی ہے۔ دوسرے حصے میں ۷۵ نغمے یا غزلیں ہیں اور پہلے حصے کی طرح جوش و مستی سے لبریز ہیں۔ اگر فارسی لٹریچر میں خواجہ حافظ کے جوش و مستی کا کوئی جواب ہو سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر صاحب کے یہی چند غزل نما ترانے ہیں۔ تیسرے حصے کا عنوان گلشن راز جدید ہے، جس کی تمہید میں اقبال نے خود کہا ہے ؎

بطرزِ دیگر از مقصود گفتم
جوابِ نامۂ محمود گفتم

"گلشن راز جدید" دراصل سید محمود شبستری کی مشہور مثنوی گلشن راز کا جدید طرز میں جواب ہے۔ جس میں اقبال نے نو سوالات قائم کر کے ان کا جواب دیا ہے اور ماورائیات کے بعض اہم مسائل کو علوم جدیدہ کی روشنی میں حل کر کے عملی دنیا پر اس کا اثر ظاہر کیا ہے۔ علامہ اقبال کی طرف سے نو سوالوں کے جوابات فلسفیانہ موشگافیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے

---

[1] سیرت اقبال ص ۲۷۰-۲۷۱

ساتھ ہی ایک مثنوی "بندگی نامہ" ہے جو "زبورِ عجم" کا چوتھا حصہ ہے یہ مثنوی نہایت مختصر ہے اور اس میں شاعرِ مشرق نے غلاموں کے فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوری اور مذہب پر منظوم بحث کی ہے اور یہ تجزیہ کیا ہے کہ غلاموں کے فنونِ لطیفہ میں زندگی کی روح نہیں پائی جاتی۔ بندگی نامہ، ایک لحاظ سے غلامی اور محکومیت کے خلاف ایک مؤثر آواز ہے اور غلامی پر عمومی اشارات کے اظہار کے بعد غلاموں اور محکوموں کے فنونِ لطیفہ پر تبصرہ اور پھر مردانِ آزاد کے فنِ تعمیر سے روشناس کرایا گیا ہے۔

"زبورِ عجم" میں اقبال کی فارسی غزل عین الکمال کو پہنچی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بلند سے بلند خیالات اور مؤثر سے مؤثر تلقینات کے لئے بھی غزل سے زیادہ زوردار اور زندہ صنفِ سخن موجود نہیں ہے[۵]۔ "زبورِ عجم" کی افادیت کے پیشِ نظر اس کے نغموں اور غزلوں کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ وہ کہ جس میں اقبال خدا سے مخاطب ہے اور دوسرا حصہ وہ جس میں تمام عالم کو اور بالخصوص مشرق کو مخاطب کر کے انہوں نے عام بیداری کا انقلابی پیغام پہنچا دیا ہے، تاکہ اہلِ مشرق عہدِ رفتہ کی شان و شوکت اور تجمل و حشمت کو دوبارہ حاصل کر سکیں اور مشرق ایک بار پھر مادی اور روحانی اعتبار سے ساری دنیا پر چھا جائے۔ یہی "زبورِ عجم" کا ماحصل ہے۔ اس کے مطالب اور بلاغتِ بیان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ علامہ خود فرماتے ہیں ؎

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

اہلِ ذوق کے لئے زبورِ عجم، فی الواقعی خلوت میں بیٹھ کر پڑھنے کی چیز ہے کہ جس کے مطالعہ سے نہ صرف دلوں میں ذوقِ یقین پیدا ہوتا ہے اور غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں، بلکہ ایمان بھی تازہ ہو جاتا ہے اور ایقان کو بھی استحکام ملتا ہے۔[۶]

جاوید نامہ

"پیامِ مشرق" میں گوئٹے کے "مغربی دیوان" اور زبورِ عجم میں شیخ سعد الدین محمود شبستری کی مثنوی

---

۵ اقبال کامل۔ ص ۱۰۰ — ۶ ذکرِ اقبال ص ۲۵۶

"گلشن راز" کا کامیاب جواب لکھنے کے بعد حضرت علامہ اقبال نے اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کا جواب لکھنا شروع کیا جس نے اسلام کے عقیدہ معراج اور نظریہ جنت و دوزخ کا مطالعہ کر کے ایک طویل نظم "ڈیوائن کامیڈی" کے نام سے لکھی تھی۔ علامہ نے ۱۹۲۹ء میں اس کا جواب لکھنا شروع کیا۔ جو تین سال کی مدت کے بعد ۱۹۳۲ء میں "جاوید نامہ" کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا عبدالسلام ندوی رقمطراز ہیں کہ اسرار و حقائق معراج محمدیہ پر ایک کتاب لکھنے کا خیال ڈاکٹر صاحب کو ایک مدت سے تھا اور وہ "گلشن راز جدید" کی طرح علوم حاضرہ کی روشنی میں معراج کی شرح لکھ کر ایک قسم کا "معراج نامہ جدید" لکھنا چاہتے تھے لیکن اس اثنا میں اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کی کتاب "ڈیوائن کامیڈی" پر بعض نئی اور اہم تنقیدات یورپ میں شائع ہو چکی تھیں، جن میں اس حقیقت کو پایہ ثبوت تک پہنچایا گیا تھا کہ "ڈیوائن کامیڈی" کے آسمانی ڈرامہ کا پلاٹ بلکہ اس کے بیشتر تفصیلی مناظر ان واقعات پر مبنی ہیں، جو اسلام میں معراج محمدیہ کے متعلق بعض احادیث و روایات میں مذکور ہوئے یا بعد میں بعض مشہور مصنفین و ادباء کی کتابوں میں درج ہوئے

اس کے علاوہ بعض مصنفین مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" میں اور بعض ادباء مثلاً ابوالعلاء معری نے "رسالۃ الغفران" میں خود اپنی سیاحت علوی اور مشاہدہ تجلیات کا ذکر کیا ہے اور ابن عربی نے اس سیاحت علوی میں دو افراد کو جن میں ایک فلسفی اور دوسرا عالم دین ہے اپنا رفیق و رہنما بنایا ہے اور ان کی زبان سے دنیا بھر کے علوم و فنون اور مسائل و مباحث کے متعلق اس انداز میں اظہار خیال کیا ہے کہ گویا یہ تمام خیالات وہ انکشافات والہامات ہیں، جو خود ان کے قلب پر اس معراج میں القاء کئے گئے۔

ابوالعلاء معری نے "رسالۃ الغفران" اپنے ایک شاعر اور ادیب دوست کے جواب میں لکھا، جس میں اس نے طنز کے پیرائے میں ان شعراء و ادباء کو مورد عتاب الٰہی قرار دیا تھا جنہوں نے گنہگاری کی زندگی بسر کی تھی۔ لیکن ابوالعلاء نے "رسالۃ الغفران" میں ادبی رنگ میں اپنی بہشت و دوزخ کی سیر دکھائی اور وسعت رحمت الٰہی کے واضح کرنے کے لئے بڑے بڑے گناہگاروں اور زمانہ جاہلیت کے شاعروں کو جنہوں نے بالآخر مرنے سے پہلے توبہ کرلی تھی مغفرت و رحمت کا سزاوار ہونے اور جنت میں داخل ہوتے ہوئے دکھایا۔"

حیات مابعد الموت کی حقیقتوں کے تجسس میں ابن عربی اور دانتے دونوں نے سات ستاروں (بعض صورتوں میں نو) کی سیر سے گزر کر بہشت و دوزخ اور اعراف کی فضاؤں

کے نقشے کھینچے ہیں۔[۱۸] یہ تمام باتیں پیشِ نظر ہوں اور "جاوید نامہ" کا مطالعہ کیا جائے، تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت علامہ اقبال نے "ڈیوائن کامیڈی" فتوحات مکیہ اور رسالۃ الغفران کو سامنے رکھ کر "جاوید نامہ" کا خاکہ قائم کیا۔ بعض اشارات سے بھی اس کی تائید ملتی ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے چند نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا تو انہیں مشورہ دیا گیا کہ اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ "جاوید نامہ" کا تمام و کمال ترجمہ کیا جائے، یہ نظم ایک قسم کی "ڈیوائن کامیڈی" ہے[۱۹]۔ ابوالعلا معری کے "رسالہ الغفران" کا اشارہ اس شعر میں ملتا ہے۔

یہ خوانِ تر و تازہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات

مگر "جاوید نامہ" دو اعتبار سے "ڈیوائن کامیڈی" اور "فتوحات مکیہ" سے مختلف ہے۔ ایک یہ کہ اس میں وہ تمثیلی مظاہرات و اشارات نہیں پائے جاتے۔ جو "ڈیوائن کامیڈی" اور "فتوحات" میں ہر جگہ ملتے ہیں اور جن کی وجہ سے ان کے بعض مباحث عقدہ لاینحل ہو کر رہ گئے ہیں، دوسرے یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی سیاحت کو زیادہ تر چھ ستاروں تک محدود رکھا ہے اور دوزخ و اعراف کی سیر نہیں کی ہے، بلکہ جن لوگوں کو جہنم میں مبتلائے عذاب دکھانے کی ضرورت تھی، ان کو فلک زحل کے ایک قلزمِ خونیں میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے اور وہ لوگ صرف مذہبی یا اخلاقی حیثیت ہی سے مجرم نہیں ہیں، بلکہ وہ ایسی ارواحِ خبیثہ ہیں جنہوں نے ملک و ملت سے غداری کی اور جن کو دوزخ نے بھی اپنے اندر لینا قبول نہیں کیا۔ ایک اور بڑا فرق یہ ہے۔ کہ "ڈیوائن کامیڈی" اور "فتوحات" میں زیادہ تر حیات بعد الممات کے حقائق و کیفیات بیان کئے گئے ہیں، مگر ڈاکٹر صاحب نے "جاوید نامہ" میں زیادہ تر توجہ حیاتِ حاضرہ یا حیاتِ مطلق یا بالفاظِ دیگر بقائے حیاتِ انسانی کے مسئلہ پر صرف کی ہے[۲۰]۔ اکثر ناقدین کی رائے میں "جاوید نامہ" اقبال کی ایک اہم اور بے مثال تصنیف ہے۔ خود حضرت علامہ نے اس کتاب کو اپنی دوسری کتابوں پر ترجیح دی، لیکن اگر شاعری کے محدود نقطۂ نظر سے اس کتاب پر نظر ڈالی جائے تو پیامِ مشرق اور زبورِ عجم اس سے بہتر تصانیف ہیں کیونکہ اقبال کی شاعری کے حقیقی جوہر ان کی نظموں اور غزلوں میں مثنویوں سے کہیں زیادہ کھلے

ہیں اور ان کے زورِ بیان میں زیادہ مضبوطی اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ تاہم فکر کے اعتبار سے جاوید نامہ، پیامِ مشرق اور زبورِ عجم سے بڑھ کر نہیں۔ مولانا روم کی رہنمائی میں یہ افلاک کے مختلف منازل و طواسین طے کرتے ہوئے جمال الدین افغانی، سعید حلیم پاشا، مہدی سوڈانی منصور حلاج، مرزا غالب، قرۃ العین، نطشے، سید علی ہمدانی، غنی کاشمیری، بھرتری ہری، نادر شاہ ٹیپو سلطان وغیرہم سے علامہ نے جو ملاقاتیں اور گفتگوئیں کی ہیں وہ فکر انگیز ہیں اور اپنی مثال آپ ہیں اور آخر میں "خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے نژادِ نو کو درسِ عمل دیا ہے۔ اس پہلو سے جاوید نامہ، حسنِ تخیل، حسنِ ترتیب اور حسنِ بیان میں علامہ اقبال کی بلند ترین تصنیف قرار دی جا سکتی ہے۔

جاوید نامہ کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے یہ ترجمہ پروفیسر آرتھر آربری نے جولائی ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ وہ ایک عرصہ تک کیمبرج میں عربی کے پروفیسر رہے ہیں اور یورپ کے ایک ممتاز اسلامی سکالر گردانے جاتے ہیں۔ اقبال کے فارسی کلام پر وہ سند کی حیثیت رکھتے ہیں اور قبل ازیں انہوں نے زبورِ عجم کا ترجمہ ۱۹۴۹ء میں "پرشین سامز" اور رموزِ بیخودی کا ترجمہ ۱۹۵۸ء میں مسٹریز آف سیلفلیس نیس کے نام سے کیا۔ جاوید نامہ کے ترجمے کا کام یونیسکو کے شعبۂ پاکستان کی سفارش پر انہوں نے دو سال میں مکمل کیا۔ یہ کام ایک منصوبے کے تحت ہوا جس کا مقصد ممبر ممالک کے بہترین ادب کو ترجمہ کے ذریعہ بین الاقوامی سطح پر روشناس کرانا ہے۔

بالِ جبریل

"جاوید نامہ" کے بعد علامہ اقبال کی شاعری کے چار اور مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں سے دو مجموعے اردو میں اور دو مجموعے فارسی میں تھے۔ اس عرصہ میں "بالِ جبریل" اردو کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو جنوری ۱۹۳۵ء میں طبع ہوا اور اس میں بعض غزلیں زبورِ عجم کی طرز پر اور کچھ رباعیات اور قطعات "پیامِ مشرق" کے انداز میں ہیں۔ بالفاظِ دیگر "بالِ جبریل" کو زبورِ عجم اور پیامِ مشرق ایسی فارسی تصنیفات کا حسین اردو امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہ کے پہلے حصے میں غزلیات پھر رباعیات و قطعات اور آخر میں مختلف عنوانات کے تحت نظمیں شامل ہیں۔ نظموں میں چند تو

اندلس کی مشہور عمارات و مقامات پر ہیں اور یہ نظمیں ان تاثرات کا نتیجہ ہیں، جب علامہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد اسپین کی سیر کی اور ان عمارات و مقامات کو بچشم خود دیکھا۔ گو ان نظموں میں شکوہ اور جواب شکوہ کا سا جوش، جذبہ، بلند خیالی اور رنگینی نہیں ہے، تاہم تسلسل و روانی اور عقیدت و محبت کے جذبات سے یہ نظمیں لبریز ہیں اور ان کے لفظ لفظ سے دردمندی کا اظہار ہوتا ہے۔

"ذوق و شوق" کے عنوان سے بال جبریل میں ایک طویل نظم بھی ہے، جس کے اکثر اشعار فلسطین میں قیام کے دوران علامہ نے کہے۔ ان اشعار کے علاوہ مختلف عنوانات پر اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ لیکن بال جبریل کی سب سے مشہور و مقبول نظم "ساقی نامہ" ہے جو حضرت علامہ نے مثنوی سحرالبیان کی طرز میں لکھی۔ اس نظم کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ یہ اسی کی بحر میں لکھی گئی اور اس میں وہی جوش، سرمستی اور رنگینی موجود ہے جو سحرالبیان کا طرہ امتیاز ہے علاوہ بریں "بال جبریل" کی وہ نظم بھی روح رواں ہے، جس کو اقبال نے ۱۹۳۲ء میں حکیم سنائی غزنوی کے مزار کی زیارت کے بعد ان ہی کے ایک مشہور قصیدہ کے تتبع میں لکھا تھا۔

"بانگ درا" کی اشاعت کے ایک عرصہ بعد "بال جبریل" منظر عام پر آئی۔ اس لئے اہل ادب حضرات نے والہانہ جذبہ کے ساتھ علامہ کے اس مجموعۂ کلام کا خیر مقدم کیا۔ ورنہ عام طور پر یہی سمجھا گیا تھا کہ آپ نے اردو کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ بانگ درا میں اور اس شاہکار میں بہت فرق ہے۔ ارتقائے تخیل کے ابتدائی دو مدارج سے بانگ درا کا زیادہ حصہ بھرا ہوا ہے۔ اس لئے تیسرے درجے کو عام ناظرین اس غائر نظر سے نہیں دیکھتے، جس کا وہ مستحق ہے اس کے برعکس بال جبریل، ارتقائے خیال کی چوتھی منزل کو جو بلند ترین مرتبہ ہے، پیش کرتی ہے، بعض کم علم اور کور ذوق حضرات کی ظاہر بین نگاہیں اس کے دقائق و حقائق تک نہ پہنچیں تو انہوں نے اس کو بانگ درا سے پست تر تصنیف قرار دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ادب اردو میں اس تصنیف نے ان جواہر پاروں کا اضافہ کیا ہے، جس سے دامن اردو اب تک تہی تھا۔ تخیل و فکر کا شاہکار ہونے کے اعتبار سے اردو کی کوئی تصنیف اس کے پاسنگ بھی نظر نہیں آتی۔ ان الہامات شعری کو اردو میں وہی مرتبہ حاصل ہے، جو فارسی میں

مثنوی شریف یا گلستان کو نصیب ہے[1]۔"

اس میں کلام نہیں کہ "بال جبریل" نقادان سخن کے نزدیک علامہ اقبال کی اردو شاعری کی معراج ہے اور "اس کی تصنیف سے علامہ نے غزل کے دلفریب پیرائے میں وہ تمام حقائق و معارف اور تعلیمات و تلقینات بیان فرمادیں، جو اس سے قبل متعدد فارسی تصانیف میں آچکی تھیں[2]۔" اور "بال جبریل" میں کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ مطلع ہے، جو سرورق کی زینت ہے ؎

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختہ، شام و سحر تازہ کریں

"بال جبریل" درحقیقت تعلیمات کا مرقع زریں ہے۔ اس تصنیف کے ذریعے اقبال نے رہنماؤں کی کج روی خلوص و ایقان کے فقدان اور طلسم مغرب کے فریب میں گرفتاری پر سخت سرزنش کی ہے اور ملت میں مروت و مودت، خلوص و یقین پیدا کرنے طلسم مغرب سے اجتناب کرنے اور مرد مومن بننے کی مؤثر نصیحتیں کی ہیں اور عرفان خودی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو دعوت فکر دی ہے کہ مرکز وحدت پر پھر سے جمع ہوں اور اپنے میں حریت، عزم، ہمت اور عمل کی قوت پیدا کریں۔

ضربِ کلیم

یہ کتاب دراصل "بال جبریل" کی تعلیمات کا ضمیمہ ہے۔ جولائی ۱۹۳۶ء[3] میں شائع ہوئی۔ اقبال پہلے اس کا نام "صور اسرافیل" رکھنا چاہتے تھے[4]۔ لیکن بعد میں انہوں نے اس مجموعے کا نام ضرب کلیم پسند کیا۔ شاید اس نام کی بنیاد "بال جبریل" کا یہ شعر تھا ؎

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

---

[1] سیرت اقبال ص ۲۷۸
[2] ذکر اقبال ص ۲۹۵
[3] اقبال نامہ ص ۲۷۸
[4] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴۰

"ضرب کلیم" کو علامہ اقبال نے اعلیٰ حضرت نواب سر حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال کی خدمت میں پیش کیا اور یہ مختلف عنوانات میں منقسم ہے ———— اور اس میں چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ اب پہلے حصے سمیت "ضرب کلیم" کو اقبال شناسوں نے چھ عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) اسلام اور مسلمان (۲) تعلیم و تربیت (۳) عورت (۴) ادبیات، فنون لطیفہ (۵) سیاسیات مشرق و مغرب (۶) محراب گل افغان کے افکار۔ ان عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی، مذہبی، ملی اور معاشرتی مسائل سے متعلق علامہ اقبال کے جواہر افکار قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذکورہ عنوانات کے تحت لکھی گئی نظموں میں پیچیدہ مباحث پر جس خوش اسلوبی کے ساتھ اقبال نے فتوے صادر کئے ہیں وہ انداز بیان ان ہی کے لئے خاص ہے۔ "محراب گل افغان" گو کہ ایک فرضی نام ہے مگر اقبال کے نزدیک محراب گل افغان کے افکار میں قوم افغان کے لئے جو درس و پیغام پوشیدہ ہے، وہ ان کی نجات کا واحد راستہ ہے، بلکہ تمام اقوام و ملل پر ایک ہی طرح سے حاوی و منطبق ہوتا ہے۔

"ضرب کلیم" میں فکر رنگین اور شعر تر کی خوبیاں کم اور حقائق و معارف کی جولانیاں زیادہ ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرب کلیم کی تصنیف کے وقت اقبال ایسا شاعر اور فلسفی اپنے فکر کی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا اور اب وہ قلیل الفاظ میں کثیر المعانی حقائق بیان کرنے پر قادر تھے۔ "ضرب کلیم" کے سالک مرحوم کے بقول: مختلف حصے ہیں۔۔۔ محراب گل افغان کے افکار، نہایت پیچیدہ مباحث پر اس قدر سلاست، سلجھاؤ اور سہولت سے اظہار خیال کرنا بے حد دشوار تھا، لیکن علامہ اس سے خوب عہدہ برا ہوئے ہیں اور "ضرب کلیم" کے حقائق صرف ملت اسلامیہ ہی کے لئے نہیں، بلکہ تمام اقوام و ملل کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتے ہیں[۱]۔ ضرب کلیم کی اہمیت کے بارے میں خود علامہ لکھتے ہیں۔ باقی رہی کتاب سو یہ ایک Topical چیز ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ ایک اعلان جنگ ہے، زمانہ حاضر کے نام اور ناظرین سے میں نے خود کہا ہے کہ میدان جنگ میں

---

[۱] ذکر اقبال ص ۲۹۶

نہ طلب کر نوائے چنگ"۔ نوائے چنگ یہاں موزوں نہیں ہے۔ اس کتاب کا Realistic ہونا ضروری ہے اور نوائے چنگ کی تلافی Epigliammaticstyle سے کی گئی ہے[1]۔ اور ضربِ کلیم میں شاعرِ مشرق کی اپروچ واقعی حقیقت سے قریب تر ہے۔

پس چہ باید کرد

"بالِ جبریل" کی اشاعت سے قبل حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے فارسی زبان میں ایک چھوٹی سی مثنوی "مسافر" کے نام سے لکھی تھی۔ جس میں انہوں نے سیاحت افغانستان کے متعلق اپنے تاثرات نظم کئے تھے[2]۔ اور "ضربِ کلیم" کی اشاعت کے بعد اقبال کی دوسری فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" کے نام سے ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس مثنوی کی شانِ نزول کچھ یوں ہے کہ علامہ اقبال ایک رات خواب میں سرسید احمد خاں مرحوم سے ملے۔ جو ان سے کہہ رہے تھے کہ تم اپنی بیماری کا ذکر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیوں نہیں کرتے ؟ آنکھ کھلی تو یہ شعر زبان پر تھا

> با پرستارانِ شب دارم ستیز
> باز روغن در چراغِ من بریز

پھر چند اشعار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض احوال میں ہوئے، رفتہ رفتہ ہند اور بیرونِ ہند کے سیاسی اور اجتماعی حوادث نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ ان اشعار نے ایک مستقل مثنوی کی شکل اختیار کر لی[3]۔ اسی واقعہ کی تصدیق ایک خط سے بھی ہوتی ہے، جو پروفیسر الیاس برنی کو لکھا گیا۔ علامہ لکھتے ہیں ۳۔ اپریل کی رات تین بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا) میں نے سرسید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا، پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو، میں نے عرض کیا، دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا: حضور رسالت مآب صلعم کی خدمت میں عرض کرو، میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرضداشت کے چند شعر، جو اب طویل ہوگئی ہے، میری زبان پر جاری ہوگئے۔ انشاءاللہ ایک مثنوی فارسی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہوگی۔ ۴۔ اپریل کی صبح سے میری آواز

---

[1] مکتوب بنام سر راس مسعود بحوالہ مکاتیب اقبال [2] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۳۰

[3] ایضاً ص ۱۰۴۶

میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رنگ عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے[1]

اس مثنوی میں سب سے پہلے اقبال، پیر رومیؒ کی زبان سے یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ ؏

خاور از خواب گراں بیدار شد

پھر پیر رومیؒ اقبال کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم اہل مشرق کو دین و سیاست کے معانی و مقاصد سمجھاؤ۔ چنانچہ "اول حکمت کلیمی اور حکمت فرعونی کے خصائص بتا کر ان کا موازنہ کرتے ہیں، پھر توحید کا درس دیتے اور نفی و اثبات کو ساز و برگ امتاں ثابت کرتے ہیں، پھر فقر اور مرد حر کی ایمان افروز اور روح پرور تفسیر و تفصیل بیان کرتے ہیں، اس کے بعد شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے بحث کی ہے، پھر افتراق ہندیاں پر ماتم کر کے اتحاد کا سبق پڑھایا ہے، سیاسیات حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے بعد امت عربیہ سے خطاب کر کے اُن کو ان کا عہد ماضی یاد دلایا ہے، پھر تمام اقوام مشرق کو خطاب کر کے دریافت کرتے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہیئے[2]۔ اقبال نے خود ہی اس کے جواب میں سیاست افرنگ کا طلسم توڑ کر اقوام ایشیا کو عوامی بیداری کا پیغام دیا ہے اور مآل کار سید علیہ الرحمۃ کی ہدایت کے مطابق بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں فریاد کی ہے۔

اس کے بعد دوسری مثنوی "مسافر" شروع ہوتی ہے۔ اس کی تمہید میں اقبال نے نادر شاہ شہید کی حمایت دین کی توصیف کی ہے اور بعدازاں اقوام سرحد کو مخاطب کر کے ان کو رمز دین مصطفےٰ سے آشنا ہونے اور تعمیر خودی کی تلقین کی ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کی خاطر شاعر مشرق اپنا سفر اعلیٰ حضرت نادر شاہ شہید کے مزار پر حاضری سے شروع کرتے ہیں، پھر بابر خلد آشیانی حکیم سنائی، اور سلطان محمود غزنوی کے مزارات کی زیارات سے مشرف ہوتے ہیں قندھار میں خرقہ مبارک کی زیارت کرتے ہیں۔ اور احمد شاہ بابا کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ ان تمام مقامات سے انہیں جو پیغامات ملتے ہیں۔ اقبال انہیں دنیائے اسلام میں پھیلانے

---

[1] اقبال نامہ ص ۱۴۳ ۔

[2] سیرت اقبال ص ۲۷۹

ہیں۔ آخر میں ظاہر شاہ کو رموزِ مملکت و اسرارِ دین سکھاتے ہیں، اور مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ مثنوی پہلے چھوٹے سائز اور اعلیٰ طباعت و کتابت کے ساتھ الگ شائع ہوئی تھی، مگر بعد میں اس کو مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق میں شامل کر دیا گیا۔

ارمغانِ حجاز

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کی یہ آخری تصنیف ہے، جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھی، مگر ان کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی، اس تصنیف کا محرک وہ پاکیزہ جذبہ تھا، جو حضرت علامہ کے دل میں دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے ابھرا اور انہوں نے ۱۹۳۷ء ہی میں سفرِ حجاز کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بیماری اور نقاہت کے باعث اقبال پہلے سال تو حج پر نہ جا سکے، لیکن اب کے ان کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ ہر حال میں آئندہ برس فریضہ حج ادا کریں گے اور سرزمین حجاز کے ذرّے ذرّے کو ماہتاب سمجھ کر اپنی آنکھوں سے اس کو بوسہ دیں گے۔ اسی وفورِ شوق نے ان کے دل کے درد بھرے ساز کو چھیڑا اور ان کی زبان جوش و مستی میں ترنم ریز ہونے لگی اور طبیعت میں آمد کا ایسا زور پیدا ہوا کہ رباعیوں پر رباعیاں ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ تمنائے بیتاب کی ان بیقرار گھڑیوں میں چند ہی دنوں بعد "ارمغان حجاز" مکمل ہو گئی۔

"ارمغان حجاز" کے دو حصّے ہیں۔ ایک حصّہ فارسی میں ہے اور دوسرا اردو میں۔ حضورِ حق حضورِ رسالت، حضورِ ملّت اور حضورِ عالمِ انسانی، بہ یارانِ طریق اس کتاب کے مختلف حصّے ہیں۔ اس کے اکثر قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے عالمِ تصور میں حجاز کا سفر کر رہا ہے۔ فکر کی گہرائی اور عشق کی شدت ان قطعات کی خصوصیت ہے۔ اردو کی نظموں میں بھی زمانہ حال کے انقلابات اور تحریکات فکری پر فیصلہ کن تنقید کی گئی ہے۔ اردو نظمیں عنوانات کے اعتبار سے تو صرف ۱۳ ہیں مگر ان نظموں میں حکیم الامت نے معانی و مباحث کے جو گنج ہائے گرانمایہ سمیٹ دیئے ہیں، ان کے پیشِ نظر ان نظموں کی تعداد کی کمی کا بھی شکوہ نہیں رہتا، یہ نظمیں تھوڑی ہونے کے باوصف فکری استعداد میں زیادہ ہیں اور ان سے جہاں سیاست و معاشرت کے

رازہائے سربستہ افشا ہوتے ہیں۔ اور ان کا حل ملتا ہے، وہاں مذہب و ملت کے مسائل کی بابت بھی اٹل فیصلے انفرادی و اجتماعی سطح پر رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

درسی کتب

یہ انکشاف کہ علامہ اقبال نے شعر و ادب اور سیاست کے میدان میں خاطر خواہ خدمات انجام دینے کے علاوہ درسی کتب کی تدوین و ترتیب میں بھی نمایاں کردار ادا کیا، اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال کی مرتب کی ہوئی درسی کتابوں میں ایک کتاب "تاریخ ہند" ہے، جس کے سرورق پر یہ عبارت مذکور ہے۔

تاریخ ہند

از

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لاء

اور

لالہ رام پرشاد صاحب ایم اے پروفیسر ہسٹری گورنمنٹ کالج لاہور

لاہور

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز

ایجوکیشنل پبلشرز

۱۹۱۳ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں

تعداد ۱۰۰۰۰ دفعہ ۱ قیمت فی جلد ۸ر

اس کتاب کے سرورق سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "تاریخ ہند" علامہ اقبال نے لالہ رام پرشاد پروفیسر تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور کے اشتراک سے مرتب کی اور اسے ۱۹۱۳ء میں پہلی بار

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز لاہور نے شائع کیا۔ اس کتاب میں تاریخ ہند کا لارڈ منٹو کے عہد تک احاطہ کیا گیا جیسا کہ اس کے آخری باب میں لارڈ منٹو کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ یہ وائسرائے ۱۷۔ نومبر ۱۹۰۵ء کو بمبئی پہنچا۔ اس کے بعد کتاب کو مندرجہ ذیل ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

- ہندوستان کی گزشتہ اور موجودہ حالت۔
- قدیم اور حال کی ملکی تقسیم اور مشہور تاریخی مقامات۔
- ہند کی حالت ۱۹۰۶ء میں۔
- سنسکرت کا علم و ادب۔
- مسلمانوں کا علم و ادب

کتاب کا دیباچہ یوں ہے :۔ یہ مختصر تاریخ ان ہی اصولوں پر لکھی گئی ہے، جن پر ہندوستان کی بڑی بڑی تاریخیں مبنی ہیں اور طلباء کو اعلیٰ جماعتوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ واقعات تاریخی کی صحت میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ واقعات کے اسباب بیان کئے ہیں اور سوچنے اور نتائج صحیح پر پہنچنے کے لئے طالب علموں کے واسطے سامان مہیا کیا گیا ہے۔ انگریزی راج کے خاص خاص انتظامات کی کامیابی یا ناکامی پر بھی نظر ڈالی ہے۔ ہاں جن امور میں اختلاف رائے ہے، ان پر مخواہ مخواہ رائے زنی نہیں کی گئی۔ اصلی کتاب میں ہر ایک باب کے خاتمے پر مستند تاریخوں کے نام دئے ہوئے ہیں، جن میں سے مضمون لیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ کتب اکثر انگریزی ہیں، اردو میں ان کے نام لکھنے لاحاصل تھے، انگریزی کتاب میں فرنگستانی تاریخ کے حوالے اور فرنگستانی نام بھی اکثر آجاتے ہیں۔ وہ اردو خواں طلبہ کی آسانی کے لحاظ سے چھوڑ دئیے گئے ہیں، بعض بعض جگہ مطالب کی تشریح کردی ہے۔ غرض کوشش یہ کی ہے کہ تاریخ ہندوستان کی کہانی عام فہم عبارت میں دلچسپ طور پر طالب علموں کے سامنے پیش کی جائے جس میں نہ غیر معروف واقعات کی بھر مار ہو، نہ لمبی چوڑی تفصیلات ہوں، بلکہ کہانی کے طور پر طلباء لطف لے لے کر پڑھا کریں اور صحیح واقعات تاریخی سے واقف ہو جائیں، سرکاری پالیسی کی نسبت بھی غلط خیال دور کرنے میں یہ کتاب بہت کچھ مدد دے گی۔[۱]"

۱۔ انوار اقبال، مرتبہ ممتاز حسن، ص ۲۴۔ ۲۵

درسی کتابوں ہی کے سلسلے میں علامہ اقبال نے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے جدید اردو نصاب تیار کئے، جو سلسلہ ادبیہ کے نام سے موسوم ہیں۔ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے باقاعدہ اس نصاب کی منظوری دی اور یہ کتابیں انارکلی لاہور کے پبلشرز گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز نے شائع کیں۔ ان ہر سہ کتب کا دیباچہ ایک ہی مضمون کا ہے۔ اس کا متن حسب ذیل ہے :۔

"اردو کی مروجہ درسی کتابوں میں یہ کمی عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ وہ نفس مضمون انداز تحریر اور طریقہ انتخاب کے اعتبار سے زمانہ حال کے مطالبات کو پورا نہیں کرتیں۔ یہ کتابیں ایک ایسے زمانے میں مرتب ہوئیں، جب انتخاب کے مواقع کم تھے اور زبان اردو نے وہ رنگ اختیار نہیں کیا تھا، جو مغربی ادب کے تاثر کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان کتابوں کے نقائص بیان کرنے کے بجائے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی امتیازی خصوصیات ہی بیان کر دی جائیں۔

سلسلہ ادبیہ کی ترتیب میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ پرانے اساتذہ فن کے نتائج فکر کے ساتھ ساتھ زمانہ حال کے ان انشا پردازوں اور شاعروں کے مضامین نظم و نثر بھی طالب علم کی نظر سے گزریں، جنہوں نے اردو کو ایک ایسی زبان بنانے کے لئے انتھک اور کامیاب کوششیں کی ہیں، جو موجودہ ضروریات کے مطابق اور ادائے مطالب پر قادر ہو۔ مضامین کے انتخاب کے تنوع کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر مضمون ادبی خوبیاں رکھنے کے باوجود نئی معلومات کا حامل ہو۔

درسی کتابوں پہ بالعموم متانت کا رنگ اس قدر غالب ہوتا ہے کہ طالب علم ان میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اس نقص کو دور کرنے کے لئے اس سلسلے میں ظریفانہ مضامین نظم و نثر کی چاشنی بھی شامل کر دی گئی ہے، کیونکہ نو عمر بچوں کے دل و دماغ تک دلچسپ پیرایۂ اظہار کی وساطت ہی سے رسائی ممکن ہے۔ مضامین زیادہ تر ایسے ہی منتخب کئے گئے ہیں جن میں زندگی کا روشن پہلو جھلکتا ہو، تاکہ طالب علم اس کے مطالعے کے بعد کشاکش حیات میں زیادہ استقلال، زیادہ خودداری اور زیادہ

اعتماد سے حصّہ لے سکیں۔ حقیقت میں ادبیات کی تعلیم کا یہی مقصد ہونا چاہیئے کہ ادبی ذوق کی تربیت کے ساتھ ساتھ طلبہ کی وسیع النظری اور ان کے دل و دماغ کی جامعیت بھی نشو و نما پائے، ہمیں امید ہے کہ اس سلسلے کی کتابوں کے مطالعے سے طلباء زبان اردو کے ادبی محاسن سے بھی واقف ہو جائیں گے اور ان کو اس زبان کی روز افزوں ترقی، وسعت اور قدرت اظہار کا علم بھی ہو جائے گا اس مجموعے میں ایسے مضامین بھی ہیں، جن میں مناظر، فطرت، ذہنی کیفیات اور طبعی جذبات کی تصویریں الفاظ میں کھینچی گئی ہیں اور ایسے بھی ہیں، جن میں علم طبیعیات کے انکشافات، صنعت و حرفت کی اختراعات اور عام علمی تحقیقات کو زبان اردو میں بیان کیا گیا ہے۔ اخلاقی مضامین کے انتخاب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ان کا اسلوب بیان ایسا ہو، جو طالب علم کو کمزور اور بزدل بنانے کی بجائے نیک اور بہادر بنائے اور اس امر کا لحاظ تو بالخصوص رکھا گیا ہے کہ منتخبہ نظم و نثر پر وطنیت کا رنگ غالب ہو تاکہ طلبہ کے دلوں میں اخلاق حسنہ اور علم و ادب کی تحصیل کے ساتھ ساتھ اپنے وطن کا پاک جذبہ موجزن ہو اور وہ ہندوستان کو جس کی عظمت کے نشان، اس مجموعہ میں جگہ جگہ پر موجود ہیں، زیادہ پر عظمت بنانے میں حصّہ لیں۔

سلسلہ ادبیہ کو زبان اردو کے طلبہ کی ادبی رہنمائی کے لئے ہر طرح ممکن بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خدا کرے کہ یہ طلبہ کے مذاق ادب کو لطیف اور معیار لیاقت کو بلند کرنے میں کامیاب ثابت ہو اس ضمن میں شیخ عبدالحمید صاحب ایم اے آئی ای ایس پروفیسر طریقۂ تعلیم ٹریننگ کالج لاہور کی عنایت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جنہوں نے اس سلسلے کی موجودہ تین کتابوں کے مسودات کو بغور مطالعہ کیا اور جن کے قیمتی مشورے اس سلسلے کی ترتیب و تدوین میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ (مؤلفین)[1]

---

[1] انوار اقبال ص ۲۱-۲۲-۲۳

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے جدید اردو نصاب تیار کرنے والے مولفین میں علامہ اقبال کے معاون حکیم احمد شجاع تھے۔ اردو کورس برائے ساتویں جماعت ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا اور اس کے سرورق کی عبارت یہ تھی۔

سلسلہ ادبیہ

اردو کورس

ساتویں جماعت کے لئے

مؤلفہ

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی، بیرسٹر ایٹ لاء

(و)

حکیم احمد شجاع بی اے علیگ اسسٹنٹ سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو کونسل

بہ

سنہ ۱۹۲۴ء

گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز و پبلشرز

انارکلی لاہور

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپا)

آٹھویں جماعت کے سلسلہ ادبیہ کے اردو کورس کی سرورق کی عبارت بھی قریب قریب یہی ہے یہ کتاب ۱۹۳۰ء تک چار بار شائع ہوئی۔ اس کے سرورق پر "سررشتہ تعلیم پنجاب صوبہ جات متحدہ کی طرف سے منظور شدہ ٹیکسٹ بک" سب سے اوپر اور سب سے آخر میں لکھا ہوا ہے "اپنے مطبع پنجاب آرٹ پریس لاہور نے بابو پیارے لال کے اہتمام سے چھاپا۔

درسی کتابوں کے سلسلے کی ایک اور کتاب "آئینہ عجم" ہے۔ یہ کتاب کسی کی معاونت کے بغیر علامہ اقبال نے دسویں جماعت کے فارسی کے طلبہ کے لئے مرتب کی اور اس کا سرورق یہ تھا۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

آئینۂ عجم

یعنی

انتخابات نثر و نظم فارسی برائے طلبائے میٹریکولیشن

مرتبہ و مؤلفہ

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لاء

سنہ ۱۹۲۷ء

پبلشرز

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز انارکلی۔ لاہور

قیمت فی جلد ۱۰؍

اس سرورق کے مطابق "آئینۂ عجم" ۱۹۲۷ء میں میسرز عطر چند کپور انارکلی لاہور نے شائع کی۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصۂ نثر تمام تر جدید فارسی پر مشتمل ہے اور حصہ نظم میں سعدی، نظامی، انوری، عبید زاکانی، ناصر خسرو، ابن یمین وغیرہ کا کلام شامل کیا گیا ہے۔ آئینۂ عجم کے مرتب و مؤلف علامہ اقبال نے اپنی تین نظمیں فصل بہار، نغمہ ساربان اور کرمک شب تاب بھی شامل کتاب کی ہیں:۔

خصائصِ اقبال

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ ایک درویش صفت انسان اور قلندرانہ خوبیوں کے مالک تھے۔ اگرچہ زندگی کا زیادہ تر حصہ انہوں نے انگریزی ماحول اور مغربی وضع قطع میں گزارا، تاہم ان کے طرزِ معاشرت میں درویشانہ، قلندرانہ اور حکیمانہ سادگی غالب رہی۔ وہ علوم مغربیہ کے فاضل اجل، انگریزی زبان کے بہترین انشاپرداز اور یورپ کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے کے باوجود، مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات سے حیرت انگیز طور پر محفوظ رہے۔ اس کی اغلباً وجہ یہ ہے کہ اقبال کی ابتدائی تربیت ہی خالصتاً اسلامی ماحول میں ہوئی تھی اور ان کی زندگی سادگی کا ایک حسین پیکر تھی۔ وہ کاملاً مشرقی ذہن رکھتے تھے اور ان کی فکر حقیقتاً مکارمِ اخلاق اور اسلامی عبادات سے متصف تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں تھے، جو "ولایت پلٹ کا اعزاز" پاکر اپنے اسلاف کو فراموش کر دیتے ہیں اور نہ صرف مغربی اسلوب زندگی کو اختیار کر لیتے ہیں، بلکہ اپنے ہم وطنوں سے بات کرنا بھی توہین سمجھتے ہیں۔ لیکن اقبال میں یہ اثر بالکل نہ تھا۔ مغربی تعلیم اور جدید فلسفے کے سمندر کے شناور ہونے کے علی الرغم ان کی مشرقی سادگی اور طرزِ معاشرت وہی رہی، جو اکابرین مشرق کے افکار اور بزرگان دین کی نگاہوں نے ان میں پیدا کر دی تھی۔

"اقبال کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شائع ہوئے، ورنہ عام خیال یہی تھا کہ جیسے اور "سر" صاحبان ہوتے ہیں، ویسے ہی وہ بھی ہوں گے اور اسی بنا پر بہت سے لوگوں[1] نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ ڈالا تھا کہ ان کی بارگاہ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے، لیکن

---

[1] مولانا حسین احمد مدنی کی طرف اشارہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا، جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے، باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی، کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے، اس کی اصلی شخصیت کیا ہے؟ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا، جو سیاسی اغراض کے لیے سادگی و فقر کا اشتہار دیتے ہیں اور سوشلسٹ بن کر غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں، مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر ان کی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہوتی ہے۔"[1]

علامہ اقبال، صوفیانہ مزاج کے آدمی تھے۔ فضل و کمال اور شہرت و ناموری حاصل کرنے کے باوجود، ان کی طبیعت میں تکبر و نخوت کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی شاعری اور فلاسفی اور زندگی کا سب سے دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ جہاں ان کی شاعری اور ان کی فلاسفی سراسر مجاہدانہ اور غیر صوفیانہ ہے، وہاں ان کی زندگی سراپا صوفیانہ تھی۔ قوم کو خودی کی تعلیم دیتے رہے، لیکن خود بیخود طرح کے انسان تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں: ان کی بے نیازی کا یہ حال تھا کہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی، خانہ اور اہل خانہ دونوں کی طرف سے بے نیاز معلوم ہوتے تھے، ان کا زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا تھا، ان کے کلام میں قلندری کا جو ذکر ہے، وہ شاعرانہ نہیں، بلکہ حقیقت ہے، جو لوگ ان کے پاس رہے ہوں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کھانا ۲۴ گھنٹوں میں ایک دفعہ کھاتے تھے، بہت کم سوتے تھے، سحر خیز تھے[2] خود فرماتے ہیں ؎

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

اقبال پر مذہب کا رنگ کچھ نہ کچھ شروع سے موجود تھا، جو آخر میں غالب ہوگیا۔ ان کی مذہبیت منفرد اور ایک خاص رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ وہ ملّا نہیں تھے اور ملائیت سے انہوں نے

---

[1] جوہر اقبال ص ۳۹-۴۰

[2] سب رس، اقبال نمبر ص ۱۲۲

ہمیشہ گریز کیا۔ وہ رند بھی تھے، فلسفی بھی، صوفی تھے اور قلندر بھی، مگر مسلمہ مفہوم کے لحاظ سے ان میں کسی صفت کا اطلاق ان پر پوری طرح نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں انہوں نے خود کہا ہے ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

علامہ اقبال کی ابتدائی زندگی کا یہی اثر تھا کہ انہوں نے اسلام کے بعض پاکیزہ اصولوں ایسے ماحول میں عمل کیا، جہاں ان پر عمل کرنا موجودہ تہذیب و شائستگی کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے اور عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اقبال ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ وہ بے عمل ہرگز نہ تھے۔

نماز اور قرآن

قرآن مجید کی تلاوت سے علامہ اقبال کو خاص شغف تھا۔ نماز بھی بڑے خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے، مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ نرا گفتار کا غازی ہوں[1] علامہ کے شرکاءِ محفل کا کہنا ہے کہ اقبال صبح کی نماز کے تو بہت سختی سے پابند تھے۔ انہوں نے اپنی نماز کبھی ظاہر کیوں نہ کی، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اقبال ظاہر بین نمازیوں میں سے ہرگز نہیں تھے اور نہ دکھاوے کی عبادت کو پسند کرتے تھے ان کی ایک درویشانہ صفت بے ریائی بھی تھی، جس کی وجہ سے نہ وہ خود مغالطہ میں رہنا پسند کرتے تھے اور نہ دوسروں کو مغالطہ میں ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں: مجھے ریاکاری کا فن بالکل نہیں آتا اور اگر میں نے کبھی کوشش بھی کی تو کامیابی نہ ہو سکی، اس لئے میں نے ریا کو بالکل چھوڑ دیا ہے[2]۔ اقبال کا یہ عمل تھا کہ انہوں نے جھوٹ موٹ کے ظاہری تقویٰ کا رنگ

---

[1] جوہرِ اقبال، مودودی ص ۳۹

[2] سب رس، اقبال نمبر ص ۱۳۹

اختیار کرنے سے اجتناب کیا اور نماز، روزہ، حج اور قرآن کے معاملے میں بھی ہمیشہ بے تکلفانہ اور رندانہ گفتگو کی۔ دوسری وجہ ان کا عالم شباب تھا۔ چنانچہ ایام شباب میں ان کا جو انداز تھا، اس کا حقیقی نقشہ انہوں نے نہایت بے ریائی کے ساتھ ایک مولوی صاحب کی زبانی جو ان کے پڑوس میں رہتے تھے، اس طرح کھینچا ہے:

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا — گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمدانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل — مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے — عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت — اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے — بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی
مجموعۂ اضداد ہے، اقبال نہیں ہے — دل دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف — پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

اور اس وعظ کو سن کر علامہ اقبال نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اعتراف کیا:

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے — کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

مذہب کے متعلق علامہ اقبال نے جو خیالات ظاہر کئے، وہ اگرچہ فلسفیانہ ہیں، لیکن عملی حیثیت سے وہ مسلمانوں کے لیے صرف عقیدۂ توحید و رسالت اور نماز، روزہ اور حج زکوٰۃ کو کافی سمجھتے تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مسلمان کو مسلمان بننے کے فلسفہ کی ضرورت نہیں، بلکہ عمل کی ضرورت ہے اور یہ عمل علامہ اقبال کے معمولات میں شامل تھا۔ نماز کے علاوہ ان کی مذہبی زندگی کے اعمال و اشتغال میں ایک نہایت موثر چیز تلاوت قرآن تھی۔ بچپن ہی سے صبح کے وقت روزانہ قرآن مجید کی تلاوت نہایت پابندی سے کرتے تھے اور ان کے اسی

ذوق و شوق کو دیکھ کر ان کے والد نے ان کو یہ نصیحت کی تھی کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے اور علامہ کی زندگی کے اوراق شاہد ہیں کہ انہوں نے اس نصیحت پر شدت سے عمل کیا۔ تلاوت کے وقت کلام الٰہی سے اکثر اشکبار ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ :

"شاعر اعظم قرآن مجید کی تلاوت کے وقت وجد میں آ جاتا تھا۔ اقبال اپنی نظموں کو ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ خدا کے کلام کو سنوار کر نہ پڑھتے۔ قرآن مجید کی تلاوت باآواز بلند کرتے تھے، جس سے ان کے قلبی جوش کا اظہار ہوتا تھا یہ وہ وقت ہوتا تھا کہ قال حال بن جاتا تھا اور شاعر پر ایک خاص عالم طاری ہو جاتا تھا۔ اقبال راتوں میں جاگتے تھے اور سحر خیزی ان کی چہیتی چیز تھی، پھر قرآن کو تو ان اوقات میں خاص لگاؤ ہے، لہٰذا شغف قرآن، قرآن کے نورانی صفحات ان کے سامنے کر دیتا تھا اور یہ بلبل ہزار داستان بڑی خوش الحانی کے ساتھ تلاوت قرآن میں مصروف نظر آتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال جیم شحیم تھے، مگر رقیق القلب ایسے تھے کہ دوران تلاوت میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں"[1]

تلاوت قرآن کے متعلق ایک نہایت موثر واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کی کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دے دی گئیں، ان ہی کتابوں میں ان کی تلاوت کا خاص قرآن از روئے وصیت ان کے لخت جگر جاوید کو ملا اور اس مصحف کے متعلق علامہ کے خاص خاص احباب کا بیان ہے کہ وہ بلاناغہ صبح کے وقت اس کی تلاوت ایسے ذوق و شوق، ایسے درد محبت اور ایسے سوز و گداز کے ساتھ کیا کرتے تھے کہ آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا، روتے جاتے اور پڑھتے جاتے، تھے، یہاں تک کہ کتاب عزیز کے ورق بھیگ جاتے، جب تلاوت ختم ہو جاتی تو اسے اٹھا کر دھوپ میں رکھ دیتے، تاکہ صفحے خشک ہو جائیں۔

---

[1] اقبال اور قرآن، مولانا ابو محمد مصلح ص ۲۵-۲۶

مدت العمر تک ان کا یہی دستور رہا، حتیٰ کہ زندگی کے آخری دنوں میں جب بیماری کا تسلط بڑھ گیا اور گلا خراب ہو جانے کی وجہ سے آواز میں پچ لگ گئی، تو ڈاکٹروں کے روکنے پر آپ کا یہ طریق تلاوت بھی چھوٹ گیا۔ اور اس پابندی کا انہیں دم آخر تک رنج رہا، پھر بھی احباب سے چھپ کر اور گھر والوں سے نظریں بچا کر تلاوت کلام مجید کرتے ہی رہتے۔

عشقِ رسالتمآبؐ

اقبال غیرتِ اسلامی کے پیکر تھے۔ اسلام، شارع اسلام، اکابر تاریخ اسلام کی ذرا سی بے حرمتی پر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ عشق رسولؐ ان کے رگ و ریشہ میں رچا ہوا تھا۔ جب کبھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اسم مبارک یا ذکر مبارک کسی کی زبان پر آجاتا تو علامہ کی آنکھیں بے اختیار، اشکبار ہو جاتیں۔ اور پھر جب تک خود بخود طبیعت ہلکی نہ ہو جاتی تھی، ان کی گریہ وزاری کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ آپ کی زندگی کے آخری ایام کا ذکر ہے کہ 'یوم اقبال' کے موقع پر مولانا اسلم جیراجپوری نیاز حاصل کرنے کے لیے گئے اور دیر تک حضرت علامہ کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے۔ بقول مولانا صاحب موصوف اس سال حج کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے اِرادتاً سفرِ حج میں ہوں، بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں، جو سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا تھا، مکہ سے مدینہ کی طرف روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے، جس میں خدا کو مخاطب کر کے کہا ہے ؎

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

---

[1] البیان، دسمبر ۱۹۳۹ء ص ۷۵

یہ شعر سنانے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہو گیا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے[1]۔ اسی طرح پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے علامہ اقبال سر فضل حسین اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے یہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا رات کو جس وقت علامہ اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے، تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک صلعم کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے حاصل ہوئے ہیں، اس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسو کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب دل کو قرار آیا، تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے، غسل خانے ہی میں سوتے رہے[2]۔ یہ رحلت سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔

علامہ اقبال کو حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر والہانہ عقیدت و محبت تھی، اس کا اظہار اُن کے اشعار میں بھی ملتا ہے۔ 'ارمغان حجاز' میں انہوں نے 'حضور رسالتؐ' کے عنوان سے خاص باب بھی قائم کیا ہے اور اس میں جو قطعات لکھے ہیں، وہ ان کی حضورؐ سے عقیدت و محبت کو جاننے کے لیے کافی ہیں — " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے، مگر یہ شاید کسی کو نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی کے قدموں میں ایک متاع حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا اور ایسی کوئی حدیث

---

[1] آثار اقبال ص ۹۰

[2] جوہر اقبال ص ۳۹

سن کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا، ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا، جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہ کے ساتھ اُحد پر تشریف رکھتے تھے، اتنے میں احد لرزنے لگا اور حضورؐ نے فرمایا کہ ٹھہر جا، تیرے اوپر ایک نبیؐ، ایک صدیقؓ اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس پہ پہاڑ ساکن ہو گیا۔ اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے۔ میں اس کو استعارہ، مجاز نہیں، بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبیؐ کے نیچے مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں، مجازی طور پر نہیں، واقعی لرز اٹھتے ہیں[1] اسی واقعہ کی تصدیق سید نذیر نیازی نے یوں کی ہے: ایک دن مجھ سے حدیث رسول صلعم پر گفتگو فرما رہے تھے۔ جب حضرت ابو سعید خدری کی اس روایت کا ذکر آیا کہ حضور رسالت مآبؐ اپنے اصحاب کے ساتھ احد پر تشریف لے گئے اور احد کانپ اٹھا تو حضرت علامہ کہنے لگے "یہ محض استعارہ نہیں" اور پھر درد کی تکلیف کے باوجود سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے رہے "یاد رکھو، یہ محض استعارہ نہیں"[2] اقبال چونکہ ایک فلسفی اور حکیم تھے، اس لئے شاید حدیثوں کے متعلق بھی ان کے دل میں کچھ شکوک و شبہات رہے ہوں۔ لیکن نبوت پر ان کو اذعان و اعتقاد تھا، اس کی وجہ سے وہ ان حدیثوں کو بلا تامل قبول کر لیتے تھے، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی معجزہ کا ذکر ہوتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حضور سرکار دو عالم کے ارشادات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

اقبال اسمائے الٰہی اور کلام الٰہی، ارشادات رسالت مآبؐ اور دوسرے بابرکت

---

[1] جوہر اقبال ص ۳۸

[2] رسالہ اُردو اقبال نمبر ص ۱۰۷۳

کلمات کی تاثیرات کے بھی قائل تھے۔ ایک دفعہ سالک مرحوم سے ذکر کیا کہ کل میری بیوی کے سر میں درد ہوا، جو کسی تدبیر سے نہ گیا۔ آخر میں نے قصیدہ بردہ کا فلاں شعر کاٹ کر اس کی پیشانی پر چسپاں کر دیا۔ چند منٹ میں درد کافور ہو گیا — والدۂ جاوید کا دل بہت کمزور تھا۔ بہت جلد ڈر جاتی تھیں۔ ایک دن خفیف سا زلزلہ آیا تو بیہوش ہو گئیں۔ اعزہ نے علامہ کو باہر سے بلوایا۔ وہ آ کر پاس بیٹھ گئے۔ والدہ جاوید کو ہوش آیا، تو ان کا دل بہلانے کے لیے کہانیاں سناتے رہے، پھر فرمایا کہانیاں تو سن لیں، اب اللہ کا ذکر کرو۔ قرآن میں آیا ہے کہ اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ پھر خود بلند آواز سے یا حی یا قیوم پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ کمرہ گونج اٹھا۔ والدہ جاوید پھر ڈر گئیں۔ علامہ پھر انہی اسماء کا ورد کرتے کرتے باہر تشریف لے گئے[1] علامہ اقبال بعض جسمانی اور روحانی عوارض کے علاج کے سلسلے میں کلام الہٰی کے ساتھ ساتھ احادیث نبویؐ کے بھی قائل تھے اور یہ باتیں ان کی قرآن اور رسالتمآب سے والہانہ عشق کا ثبوت ہیں۔

آرزوئے حج

علامہ اقبال کے دل میں یہ شوق ایک مدت سے انگڑائی لے رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کریں، مگر ان کی گوناگوں مصروفیات کے باعث یہ آرزو تشنۂ تکمیل رہی۔ ۱۹۳۲ء میں انگلستان سے واپس آتے ہوئے جب مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لیے بیت المقدس تشریف لے گئے، تو اس وقت سفر حجاز کا سامان قریب قریب مکمل ہو چکا تھا اور وہ ویسے بھی اللہ کے گھر کے بڑے نزدیک تھے، لیکن ان کے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ضمناً حاضری دی جائے، اس لئے کہ وہ چاہتے تھے کہ حج بیت اللہ کی سعادت اور روضہ رسول اللہ صلعم کی زیارت کا خصوصی سامان کریں۔ چنانچہ علامہ واپس تشریف لے آئے۔ اس کے بعد ان کی علالت کا سلسلہ شروع

---

[1] روایت محمد نذیر صوفی بحوالہ ذکر اقبال ۲۳۷ - ۲۳۸

ہوگیا، تاہم اقبال کا خیال تھا کہ وہ مرض کے مدوجزر کی صورت میں ۱۹۳۷ء میں فریضۂ حج ادا کرسکیں گے۔ اس امر کا اظہار انہوں نے مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ کے نام ایک خط محررہ ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء میں اس طرح کیا ہے:

"حج بیت اللہ کی آرزو تو گزشتہ دو تین سال سے میرے دل میں بھی ہے۔ خدا تعالیٰ ہر پہلو سے استطاعت فرمائے، تو یہ آرزو پوری ہو اور اگر آپ رفیق راہ ہوں تو مزید برکت کا باعث ہو۔ عراق کی راہ جائیں تو بہت سے مقدس مقامات کی زیارت ہوجاتی ہے۔ لیکن بغداد سے مدینہ تک چھ سو میل کا طویل سفر ہے، جو لاری پر کرنا پڑتا ہے، صحرائی سفر بہت دشوار گزار ہے وہاں کی گورنمنٹ کی طرف سے اطلاع اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ جن لوگوں کی صحت اچھی نہیں، وہ یہ راستہ اختیار نہ کریں۔ مولوی محبوب عالم مرحوم ایڈیٹر پیسہ اخبار کی صاحبزادی فاطمہ بیگم ایڈیٹر خاتون جو حال ہی میں واپس آئی ہیں، وہ بھی اس راستہ کی دشواری کی تصدیق کرتی ہیں۔ آپ ایسے باہمت جوان کے لیے تو یہ سفر قطعاً مشکل نہیں۔ ہمت تو میری بھی بلند ہے، لیکن بدن عاجز و ناتواں ہے۔ کیا عجب کہ خداوند تعالیٰ توفیق عطا فرمائے اور آپ کی معیت اس سفر میں نصیب کرے"[1]۔

اسی خط میں علامہ اقبال مزید لکھتے ہیں: "چند روز ہوئے، سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدرآباد کا خط مجھ کو ولایت سے آیا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ حج بیت اللہ اگر تمہاری معیت میں نصیب ہو تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن درویشوں کے قافلہ میں جو لذت و راحت ہے، وہ امیروں کی معیت میں کیونکر نصیب ہوسکتی ہے۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں بھی علامہ اقبال سید غلام میراں شاہ کی رفاقت میں فریضہ حج ادا نہ کرسکے۔ اس پر انہوں نے دسمبر ۱۹۳۷ء میں ایک اور خط موصوف کو لکھا، جس میں بیت اللہ کی زیارت سے محرومی پر اظہار افسوس کیا۔ بعد ازاں ۱۹۳۸ء میں اقبال نے اس مقدس سفر کی باقاعدہ تیاریاں شروع کیں۔ اپنی علالت کے پیش نظر دسفر

---

[1] اقبال نامہ ص ۲۲۵

کی زحمت سے بچنا چاہتے تھے اور قسم کی سہولت چاہتے تھے۔ اسی غرض سے انہوں نے اطالوی کونسل جنرل کی وساطت سے انگو اطالوی کمپنی سے خط و کتابت کی، جس نے انہیں لائیڈ ٹریسٹینو کے کسی جہاز میں سفر کرنے کی اجازت دے دی۔ افسوس کہ علامہ اقبال ان تیاریوں کی تکمیل کے باوجود اس سال بھی حج پر نہ جا سکے۔" انہیں حج کی اس قدر لو لگی تھی کہ غالباً انتقال کے وقت انہیں اسی ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کا رنج رہا۔[1] علامہ اقبال اگرچہ عملی طور پر سفر حج کی برکات حاصل نہ کر سکے، تاہم انہوں نے عالم خیال میں اس سفر کی تمام منزلیں طے کر لیں اور اس عالم میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ان میں قدم رکھا:

باایں پیری رہ یثرب گرفتم نوا خواں از سرور عاشقانہ

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چندانکہ گوئی بپایش ریگ ایں صحرا حریر است

مہارا اے ساربان او را نشاید کہ جان او چو جان ما بصیر است
من از موج خرامش می شناسم چو من اندر طلسم دل اسیر است

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است شبش کوتاہ و روز او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ چو ما ہر ذرہ او دردمند است

غم پنہاں کہ بے گفتن عیاں است چو آید بر زباں یک داستان است
رہے پیمود و راہی خستہ و زار چراغش مردہ و شب درمیان است

---

[1] آثار اقبال ص ۴۹

بیا اے ہمنفس باہم بنالیم — من و تو کشتہ شانِ جمالیم
دو حرفے برمرادِ دل بگوئیم — بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

ارمغان حجاز میں 'حضور رسالت' کے عنوان سے انہوں نے جو قطعات لکھے ہیں، ان میں اکثر یہی جذبہ کارفرما ہے[1]۔ مذہب کے معاملے میں اقبال مسلمانوں کے لیے صرف عقیدہ توحید و رسالت اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو کافی سمجھتے تھے اور وہ بھی عملی حیثیت سے 'جس کے معنی ان کے نزدیک یہ تھے کہ ایک مسلمان کو صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے لیے فلسفہ کی نہیں، عمل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک ملاقات میں حکیم محسن علی صاحب عرشی نے ان سے کہا: آپ کے مدراس والے لیکچر بے حد مشکل ہیں، اگر اسلام یا قرآن کا منشا وہی ہے، جو آپ نے ان لیکچروں میں بیان فرمایا ہے اور جس کو اس ترقی یافتہ زمانہ کے بڑے بڑے اہل علم سمجھنے سے قاصر ہیں، تو قرن اول کے عرب صحرانشینوں نے اسے کیا سمجھا ہوگا؟ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: بنی الاسلام علی الخمس 'کسی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لیے اسلام کے پانچ ارکان مشہورہ کا اجزا و انضباط کافی ہے۔ چنانچہ اس کی محسوس عملی صورت عہد سعادت سے بہتر کہیں نظر نہیں آسکتی اور تاریخ کا حافظ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا[2]

غذا اور لباس

اقبال خوش رو ہی نہیں، خوش خوراک بھی تھے۔ ان کی غذا بہت سادہ تھی۔ بقول سالک مرحوم، نوجوانی کے زمانے میں بھی چٹور پن سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہ جب میں پہلے پہل لاہور آیا تو علی بخش میرے ساتھ تھا، لیکن تھا بالکل جانگلو۔ اتفاق سے اس نے کسی سے آلو گوشت پکانا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ صرف آلو گوشت ہی پکا کر میرے آگے رکھ دیتا تھا۔ صبح آلو گوشت شام آلو گوشت، یہاں تک کہ چار پانچ

---

[1] اقبال کامل، مولانا عبدالسلام ندوی ص ۴۷

[2] البیان اکبر ۱۹۳۹ء ص ۱۴

مہینے گزر گئے۔ اس دوران میں احباب کی دعوتوں کے سوا میں نے مسلسل آلو گوشت ہی پر گزران کی اور علی بخش نے بھی کوئی اور سالن پکانا نہ سیکھا۔ بعد میں علی بخش کھانے اچھی طرح پکانے لگا، لیکن اقبال اس کے آلو گوشت کو عمر بھر نہ بھول سکے۔ زندگی کے آخری برسوں میں علالت طبع کی وجہ سے اقبال کی خوراک بہت برائے نام رہ گئی تھی لیکن اس سے قبل بھی صبح کلچہ یا باقرخانی حلوے کے ساتھ کھا کر کشمیری چائے پی لیا کرتے تھے اور گرمی کے موسم میں چائے کی جگہ دہی کی لسی نوش فرماتے تھے، دوپہر کو سبزی گوشت اور ایک دو چپاتیاں، تیسرے پہر کچھ نہیں، رات کو پھر وہی سالن اور چپاتیاں، پلاؤ اور کباب بہت پسند تھے، لیکن کبھی کبھی کھاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ (Pan-Islamic Dishes) ہے۔ چین سے مراکش تک کہیں چلے جاؤ، پلاؤ اور کباب ہر جگہ ملیں گے دہی بھی بہت پسند تھا۔ دلیا دودھ ڈال کر اکثر کھا لیتے تھے کبھی کبھی تیسرے پہر ایک چھوٹا سا چوزہ مسلم پکوا لیتے اور ایک چپاتی کے ساتھ دو تین گوشت کے ٹکڑے کھا کر دسترخوان بڑھوا دیتے[1]

اقبال ایک درویش، قلندر اور حکیم تھے، راہب نہ تھے۔ اس لیے ان کے کھانے پینے میں گو تکلف یا اہتمام کو کوئی دخل نہ تھا، مگر ان کی رائے تھی کہ جو چیز بھی کھائی جائے، خوش مذاقی سے کھائی جائے، اس کا ذائقہ عمدہ ہو، رنگ اور بو خوشگوار ہو، ترشی اور سرخ مرچ انہیں بہت پسند تھی۔ سید نذیر لکھتے ہیں: ان کا برسوں سے معمول تھا کہ رات کو صرف دودھ دہی پر اکتفا کرتے اور جی چاہتا تو کشمیری چائے بھی استعمال کرتے، ان کا کھانا نہایت سادہ ہوتا تھا، یعنی گوشت میں پکی ہوئی سبزی۔ ناشتا صرف لسی یا ایک آدھ بسکٹ اور چائے کا ہوتا اور وہ بھی روزمرہ نہیں، خوراک کی مقدار بھی کم تھی اور اس کا اہتمام اس سے بھی کم، آخری دنوں میں جب بچوں کی جرمن اتالیق آ گئی تو ان کی تربیت کے خیال سے میز کرسی کا انتظام کیا گیا، یہ چیزیں موجود تو تھیں، مگر اتفاقی ضروریات کے لیے

---

[1] ذکر اقبال ص ۲۲۷ - ۲۲۸

اور حضرت علامہ بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے لگے، مگر بیچ دو ہی تین دن میں اپنی عادت سے مجبور ہو جاتے۔ فرماتے "علی بخش میرا کھانا الگ لے آؤ"۔ علی بخش پانی اور چلمچی لئے کمرے میں داخل ہوا، حضرت علامہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور وہیں پلنگ پر نشست جما لی، تولیہ یا رومال زانوں پر ڈال لیا، علی بخش نے کھانے کی کشتی سامنے رکھ دی۔ احباب میں سے اگر کوئی صاحب بیٹھے ہیں تو انہوں نے "آپ بھی آیئے" کہہ کر کھانا کھانا شروع کر دیا، بارہا اگر کھانے کے بعد پھل آ گئے تو وہ باصرار ہر شخص کو ان میں شریک کر لیتے۔[1] پھلوں میں آم کے تو وہ گویا عاشق تھے اور اس عاشقی میں تو وہ غالب سے بھی بڑھ کر تھے۔ موسم آنے پر بازار سے سب سے پہلے آم منگواتے۔ دوست احباب آموں کو اقبال کی کمزوری پر محمول کرتے تھے۔ اور ان کے لیے بالعموم یہی تحفہ لے کر آتے یا بھیجتے تھے۔ ایک بار اکبر الہ آبادی کا پارسل موصول ہوا تو علامہ اقبال نے اس پر یہ شعر لکھ بھیجا ؎

تر ے فیض مسیحائی کا ہے یہ سب اثر اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

سال میں ایک آدھ بار آم کے موسم میں سلطان الاثمار کی دعوت کا اہتمام میاں نظام الدین مرحوم کے باغ میں لازمی ہوتا اور اس کے مہمان خصوصی حضرت علامہ اقبال ہوتے۔ اس دعوت کے دوران وہ وہ خوش گپیاں اور معنی آفرینیاں ہوتیں کہ محفل کشت زعفران اور قہقہہ زار میں تبدیل ہو جاتی۔ زندگی کے آخری ایام میں، علامہ دہلی کے حکیم صاحب نابینا کے زیر علاج تھے، جنہوں نے آموں سے پرہیز کا سختی سے حکم دیا۔ اقبال یہ سن کر اداس ہو گئے۔ اس پر حکیم صاحب نے بہ امر مجبوری صرف ایک آم روزانہ کھا لینے کی اجازت دے دی۔ ایک دن علامہ کے کچھ دوست ان کی خدمت میں بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت علامہ بدستور تکیہ لگائے چارپائی پر لیٹے ہیں اور پاس ہی ایک تپائی پر کوئی سیر بھر کا بمبئی آم پلیٹ میں رکھا ہے۔ احباب نے اشارتاً استفسار کیا تو علامہ

---

[1] رسالہ اردو، اقبال نمبر ص ۱۰۲۷

نے تبسم فرماتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب نے فقط ایک آم کھانے کی اجازت دی ہے۔ پلیٹ میں ایک آم تو ہے۔

جن دنوں جاوید اور منیرہ کے لیے ایک جرمن گورنس مقرر ہوئی۔ تو اقبال نے سارے گھر کا انتظام و انصرام اسی کے سپرد کر دیا۔ وہ بچوں کو خوش رکھنے کے لیے کبھی کبھار کوئی پڈنگ پکا لیتی اور علامہ بھی بچوں کے ساتھ اس پڈنگ کا شوق فرما لیتے۔ جرمن گورنس آئس کریم بھی بڑی عمدہ بناتی تھی اور اصرار سے علامہ صاحب کو بھی کھلاتی تھی۔ حضرت علامہ نے کئی بار اپنے دوستوں کو بھی "میم صاحب کی آئس کریم" کھانے کی دعوت دی۔

علالت کے ایام میں علامہ اقبال کو ڈاکٹری دواؤں کی تلخی اور ناگواری سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ ان کڑوی کسیلی دواؤں سے بیزاری کا اظہار کرتے اور جب خمیرۂ مروارید بورق نقرہ پیچیدہ ایک چھوٹی سی پرچ میں پیش کیا جاتا تو بہت خوش ہوتے اور کہتے کہ ہاں یہ ہے "نادوا" جس کو دیکھتے ہی مرض آدھا رہ جائے۔ مریض تو پہلے ہی تلخ کام ہوتا ہے، اس کو مزید تلخ کام کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ مرض الموت میں غذا کے متعلق حسِ ذائقہ میں زیادہ لطافت پیدا ہو گئی تھی۔ حکیم محمد حسن قرشی سے ایک گفتگو کا خاکہ ملاحظہ ہو: اگر پلاؤ کی اجازت نہیں تو کھچڑی میں کیا حرج ہے، یہ تو سادہ غذا ہے؟ "آپ ایک دو روز کھچڑی کھا لیجیے" "ہاں تو کھچڑی بھنی ہونی چاہیئے، جس میں گھی کافی ہو؟"

"نہیں گھی کم ہونا چاہیئے، کیونکہ جگر بڑھا ہوا ہے"۔ "تو پھر کھچڑی میں کیا لذت ہو گی، اچھا کم از کم اس میں دہی تو ملا لیا جائے؟" مگر آپ کو کھانسی اور تولید بلغم کی شکایت ہے، جس میں دہی مضر ہے" "تو پھر ایسی کھچڑی کھانے سے نہ کھانا اچھا ہے"[1]

علامہ اقبال نے انگریزی لباس بھی پہنا اور اپنا قومی لباس بھی۔ ابتدا میں وہ شلوار اور کرتہ پہنتے تھے، سر پر سفید پگڑی ہوتی تھی یا لنگی، ولایت میں قیام کے دوران انہیں انگریزی لباس مجبوراً زیب تن کرنا پڑا۔ لیکن وطن واپس آنے کے فوراً بعد پھر سے شلوار قمیص اور فراک سوٹ

---

[1] ذکر اقبال ص ۲۳۰

کے ساتھ ترکی ٹوپی پہننا شروع کر دی۔ کبھی کبھی کوٹ پتلون پہن لیتے تھے اور اس کے ساتھ ہیٹ کی جگہ ترکی ٹوپی ہی استعمال کرتے تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے ان کے لباس کا تذکرہ یوں کیا ہے:

علامہ اپنی بیرسٹری کے سلسلے میں جب عدالتوں میں جاتے تو انگریزی سوٹ پہن لیتے۔ ہیٹ شاید کبھی طالب علمی کے زمانے میں اور وہ بھی انگلستان میں پہنی ہوگی۔ یہاں ہم نے انہیں ہیٹ لگائے ہوئے نہیں دیکھا۔ انگریزی سوٹ کے ساتھ نکٹائی کی جگہ عام طور پر کالی بو کلپ لگا لیتے۔ لیکن جتنی دیر سوٹ پہنے رہتے، کچھ گھبرائے ہوئے نظر آتے اور گھر واپس آتے ہی علی بخش کو آواز دیتے کہ سب سے پہلے یہ چار جامہ اتروا ؤ اور انسانوں کے سے کپڑے پہناؤ۔ پرائیویٹ لباس یہ تھا: سر پر ترکی یا کلپاک ٹوپی، سردیوں میں پشاوری پٹکا، قمیص، شلوار، چھوٹا کوٹ، پاؤں میں دیسی جوتا۔ چند بار شیروانی بھی پہنی، اسی لباس میں تقریبات میں جاتے اور دوستوں کی مجلسوں میں شریک ہوتے، گھر پر گرمیوں کے موسم میں صرف بنیان اور تہمد۔ سردیوں میں ان دونوں کپڑوں پر صرف ایک قمیص کا اضافہ ہو جاتا، البتہ پشمینے کا ایک دُھسہ اوڑھے رہتے۔ سرکشن پرشاد نے دورانِ قیام حیدر آباد، ایک تھان اعلیٰ درجے کی جامے وار کا پیش کیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اس کی شیروانی سلوائی اور دو چار دفعہ شوق سے پہنی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کے جسم پر بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی[1] احباب کے خیال میں اقبال کی باتوں سے اکثر معلوم ہوتا تھا کہ انہیں انگریزی لباس پسند نہیں۔ یہاں تک کہ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ایک دن اپنے صاحبزادے جاوید اقبال سے لباس کے متعلق گفتگو کی اور فرمایا کہ مجھے شلوار، پتلون سے زیادہ پسند ہے[2] گویا اقبال مغربی لباس کو بامرِ مجبوری پہنتے رہے اور مشرقی لباس کو تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے زیبِ تن کرتے تھے۔

اقبالؒ درونِ خانہ

حضرت علامہ کا معمول تھا کہ عدالت سے واپس آنے کے فوراً بعد لباس تبدیل کرتے

---

[1] ذکرِ اقبال ص ۲۳۰

[2] حیاتِ اقبال ص ۱۲۶

اور تن آسانی کے لیے گھریلو لباس زیب تن کر لیتے اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتے۔ ساتھ ہی حقہ لگا ہوتا تھا۔ حقہ پیتے، کتابیں پڑھتے، مقدمات تیار کرتے، ملاقاتیوں سے باتیں چیتیں کرتے۔ ان کی حکیمانہ اور درویشانہ طرز معاشرت کا اندازہ اس نقشے سے لگایا جا سکتا ہے: "انہیں کسی بات کی سدھ بدھ نہیں، کوٹھی کا احاطہ ویران سا ہو رہا ہے، کلر اور خاک دھول کی کثرت سے جگہ اجڑی اجڑی لگتی ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بیریوں کی ایک قطار کسی خانقاہ کے مجاور کے حجرے کی راہ دکھاتی ہے جفائیوں کا کس کو دھیان ہے؟ کون یہاں بیٹھا گھاس پھول اگایا کرے؟ باہر کے حال کی کسی کو خبر بھی ہو؟"[1]

اقبال نے علالت کے باعث وکالت کا پیشہ ترک کر دیا تو ان کا زیادہ تر وقت بستر پر گزرنے لگا۔ اس میں بھی علامہ کی عجیب شان دکھائی دیتی تھی۔ تکیہ لگا ہے، معمولی سی توشک پڑی ہوئی اور چادر بچھی ہے اور اس پر یہ پیکر علم و عرفان جلوہ گر ہے۔ علی بخش حقے کے معاملے میں بڑا پابند تھا۔ علامہ کے لیے حقے کا تمباکو علی العموم میاں نظام الدین مرحوم کے کھیتوں سے آتا تھا، علی بخش بڑے چاؤ اور اہتمام سے اس کو تیار کرتا اور دن بھر چلمیں بھرتا رہتا۔ کیا مجال کہ آگ کبھی بجھنے بھی دے۔ سچی بات ہے، اس کے سوا اس کام کو اور کوئی نہ نبھا سکتا تھا۔" ۱۹۲۱ء تک تو علامہ انارکلی بازار کے ایک بالا خانے میں رہتے تھے۔ بازار کی جانب کمرے میں کتب خانہ۔ قانونی، درمیانی کمرہ خالی، عقبی کمرے میں علامہ کی کرسی اور بستر اللہ اللہ خیر سلا، زنانہ حصہ دوسری منزل پر۔ جب میکلوڈ روڈ کی کوٹھی میں پہنچے، جب بھی کمروں کی ترتیب انگریزی نہ تھی۔ ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں وہی بستر اور کرسی، بڑے کمرے میں ایک بڑا قالین اور صرف ایک صوفہ، ایک کرسی خود علامہ کے لیے، چند کرسیاں آنے جانے والوں کے لیے، اللہ بس باقی ہوس۔ لیکن زیادہ تر برآمدے میں بیٹھتے تھے۔ ڈرائنگ روم، بیڈ روم، ڈائننگ روم وغیرہ کے بکھیڑوں سے

---

[1] آثار اقبال ص ۴۶

نفرت تھی۔ اول تو دعوت اور مہمان داری کا اتفاق شاذ ہی ہوتا تھا، لیکن جب کبھی پانچ چھ دوستوں کو کھانے کی دعوت دیتے، بڑے کمرے میں قالین پر دستر خوان بچھ جاتا اور وہیں بیٹھ کر کھانا کھا لیتے۔[1] علامہ کے ہاں مہمان تو شاذ و نادر ہی نظر آتے، البتہ جب کبھی مولانا گرامی تشریف لاتے تو مہینہ مہینہ، دو دو مہینے قیام فرماتے اور ان کی مہمان داری کا اہتمام بطور خاص کیا جاتا۔ اور یہ اہتمام بھی کوئی خاص نہ ہوتا، کیونکہ گرامی مرحوم و مغفور بھی علامہ کی طرح سیدھے سادے بزرگ تھے۔ دن میں ایک وقت کھانا کھاتے اور باقی اوقات میں چائے چلتی رہتی۔

حضرت علامہ اقبال کی ایک عجیب عادت تھی کہ آپ شدید گرمی میں بھی بجلی کا پنکھا استعمال نہ کرتے تھے۔ ان کے سرہانے ہر وقت ایک دستی پنکھیا پڑی رہتی، کبھی ضرورت محسوس کرتے، تو ہوا لے لیتے اور جب گرمی کی شدت سے گھبرا کر احباب بلبلا اٹھتے، تو علی بخش سے کہتے "اندر سے ٹیبل فین اٹھا لاؤ۔" علی بخش حکم کی تعمیل میں سرگرمی دکھاتا۔ لیکن علامہ ٹیبل فین کا رخ اپنی طرف نہ ہونے دیتے۔ پسینہ اُن کے چوٹی سے ایڑی تک بہتا رہتا، لیکن اقبال صبر و استقامت کی تصویر بنے، بیٹھے رہتے اور گرمی کی حدت میں بھی ٹس سے مس نہ ہوتے۔ دلچسپ بات تو یہ تھی کہ گرمی کے مقابلے میں سردی کو زیادہ محسوس کرتے تھے۔ جونہی موسم سرما کا آغاز ہوتا، علامہ اپنی کرسی سے اتر کر مع دھسے کے قالین پر آ بیٹھتے اور علی بخش سے کہتے کہ ایک بڑی انگیٹھی آگ تاپنے کے لیے فوراً لا کر سامنے رکھو۔

اقبال، درون خانہ بہت معاملہ فہم تھے اور گھر کے ماحول کو پُر سکون اور اطمینان بخش رکھنے کے لیے مساوات کے قائل تھے۔ روپے پیسے کے معاملہ میں ان کی دیانتداری مسلمہ تھی۔ میکلوڈ روڈ کی جو کوٹھی انہوں نے کرایہ پر لے رکھی تھی، وہ بہت حد تک بدنما اور بوسیدہ تھی، اس کے باوجود اس کا پونے دو سو روپے ماہوار کرایہ ادا کرتے تھے اور مالک مکان سے کبھی نہ کہتے تھے کہ اس کی مرمت کرا دے۔ دوستوں نے متعدد بار کہا کہ آپ اتنا

---

[1] ذکر اقبال ص ۲۳۱

زیادہ کرایہ کیوں ادا کرتے ہیں، حالانکہ اتنے کرائے میں تو شاندار کوٹھی مل سکتی ہے، مگر حضرت علامہ کا ہر بار یہی جواب ہوتا کہ یہ کوٹھی ایک غریب بیوہ کی ہے، جس کی گزراوقات اسی کے کرائے پر ہے اور مجھے کرایہ کم کرتے یا مرمت کا کہتے ہوئے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ ہر ماہ کی سات تاریخ کو نہایت پابندی کے ساتھ کرایہ اس بیوہ کو بھیج دیا کرتے۔

علامہ دیانتدار ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر معاملہ فہم تھے کہ لدھیانہ والی بیگم دونوں بیک وقت ان کے ہاں رہیں، کیا مجال کہ ان کے درمیان سوکناپے کا کوئی معاملہ آیا ہو، بالکل بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ ان دونوں کو علامہ سے اور علامہ کو ان سے ایک لمحے کے لیے بھی کبھی کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔ علامہ حقوق زوجین کے مسئلے میں عدل و انصاف کو مدنظر رکھتے۔ ایک دفعہ دونوں بیگمات کے لیے دو زیور ایک ہی نمونے کے بنوائے جب سنار نے انہیں دوبارہ تولا ایک زیور تقریباً دو ماشے کم نکلا۔ علامہ نے دو ماشے سونے کی قیمت اس زیور کے ساتھ اپنی بیگم کو ادا کر دی، تاکہ اسے بے انصافی کی شکایت کا موقع نہ مل سکے۔

شاعری، حقہ اور علی بخش، تینوں سے زندگی بھر علامہ اقبال کا ساتھ رہا۔ علی بخش خدمت گار تھا۔ اور حضرت علامہ کا منظور نظر بھی۔ حضرت علامہ کو اس کے کام کے سوا اور کسی ملازم کے کام سے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ علی بخش چھٹی لے کر گیا اور اپنی جگہ رحمے کو ملازم رکھوا گیا۔ جب واپس آیا تو رحمے نے ملازمت کا اضطراب ظاہر کیا کہ اب میرا کیا بنے گا؟ حضرت علامہ اقبال نے فرمایا "چلو تم بھی رہو"۔ اتفاق سے پھر رحمے کو گاؤں جانا پڑ گیا، تو وہ اپنی جگہ رمضان کو رکھوا گیا۔ اس کی واپسی پر رمضان نے پریشانی ظاہر کی۔ تو علامہ نے اسی کو بھی رکھ لیا۔ دوستوں اور گھر والوں نے اس پر اعتراض کیا کہ آپ کا کام تو خاص ہوتا نہیں، علی بخش حقہ بھر دیتا ہے، پھر ان تین تین نوکروں کی ضرورت کیا ہے؟ علامہ یہ سن کر ہمیشہ خاموش رہے اور ان کی زندگی میں علی بخش، رحما اور رمضان تینوں کام کرتے تھے۔ علی بخش کو ان پر فوقیت حاصل تھی۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ علامہ نے دوستوں کے اصرار پر ایک موٹر کار

خریدی ۔ فیروز نامی ایک شخص غم روزگار کے باعث پریشان تھا، کسی دوست کی معرفت علامہ کے ہاں نوکری کے لیے آیا، تو علامہ نے اسے ڈرائیور رکھ لیا۔ گھر سے باہر تو کبھی کبھار جاتے تھے اور فیروز ہفتہ ہفتہ فارغ پھرتا رہتا۔ آخر اُس نے تنگ آکر کوٹھی کے دروازے کے پاس ہی خوانچہ لگا لیا۔ ڈرائیوری کی تنخواہ حضرت علامہ سے وصول کرتا اور خوانچے سے بھی کچھ نہ کچھ کما لیتا۔ علامہ نے اسے کبھی نوکری سے جواب نہ دیا۔

علالت کے دوران علامہ اقبال کی حالت دگرگوں تھی ۔ شدید درد کو برداشت کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ جب بھی درد ہوتا ۔ شور مچانے لگتے اور اپریشن وغیرہ کا خیال آتے ہی انہیں جھرجھری محسوس ہونے لگتی تھی ۔ مگر زیادہ سے زیادہ تکلیف میں بھی اپنے ہوش وحواس قائم رکھتے تھے، بلکہ زیادہ حاضر دماغ ہو جاتے تھے۔ علی بخش کا بیان ہے ۔ جب ۱۹۰۵ء میں کانگڑہ کا مشہور زلزلہ آیا۔ میں علامہ کے پاس اندرون بھاٹی دروازہ' بالا خانے میں رہتا تھا۔ یہ زلزلہ نہ تھا، خدا کا قہر تھا۔ کڑا ٹھ کھڑ کھڑا رہے تھے۔ چھتیں چیخ رہی تھیں، دیواریں یوں ڈول رہی تھیں گویا ابھی تمام مکانات پیوند خاک ہو جائیں گے اور حقیقت میں بہت سے مکانات گر بھی پڑے تھے ۔ میری حالت دوران زلزلہ میں یہ تھی کہ کبھی کوٹھے پر چڑھ جاتا، کبھی پھر نیچے اتر آتا۔ لیکن علامہ صاحب شروع سے آخر تک اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے کتاب پڑھتے رہے اور ان میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ہوئی ۔ صرف ایک دفعہ مجھے گھبرایا دیکھ کر کتاب سے نظریں اٹھائیں اور کہا: "علی بخش، یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو، سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ"۔ یہ کہہ کر پھر مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔[1]

انداز گفتگو

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت علامہ اقبال کے علم وفضل کا شہرہ ان کی شاعری اور ان کی تصانیف سے نہیں ہوا، بلکہ اس کا باعث ان کا انداز گفتگو

---

[1] حیات اقبال ص ۳۵

ہے وہ دورِ حاضر کے بہت بڑے متکلم (Conversationalist) تھے
صبح سویرے سے رات گئے تک ان کے ہاں سیاسی اکابرین، علمائے کرام، وکلا حضرات،
پروفیسر صاحبان، مدیرانِ جرائد، شعراء و ادباء اور طالب علموں کا جمِ غفیر رہتا۔ ان پڑھ
عقیدت مندوں سے لے کر فقیروں اور درویشوں تک، ہر طبقے کے لوگ ان کی
خدمت میں حاضر ہوتے۔ معمولی معمولی جھگڑوں سے لے کر قانون، فلسفہ، سیاست،
دین اور سائنس کے بلند ترین مسائل زیرِ بحث آتے اور اقبال، مردِ قلندر، اپنے سادہ
کپڑوں میں ملبوس، سیدھی سادی چارپائی پر یا آرام کرسی پر بیٹھے ان سب موضوعات
پر اپنی وسیع معلومات کا اظہار کرتے رہتے۔ ہر شخص ان کے علم و فضل کا معترف
تھا اور ان کے اندازِ گفتگو سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ علامہ بڑی بڑی ذہنی اور فکری
الجھنوں کو آسانی سے سلجھا دیتے۔ ان کی مجلس میں چھوٹے اور بڑے، امیر اور غریب،
پڑھے لکھے اور ان پڑھ کا امتیاز نہ تھا۔ علم و فکر کے اس دربار میں جو عظیم لوگ حاضری
دینے اور مستفیض ہونے کے لئے آتے، ان میں قائداعظم محمد علی جناح، پنڈت جواہر لال
نہرو، سر سکندر حیات، سر فضل حسین، لارڈ لوتھیان اور ڈاکٹر سکارپا قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ
کو بعض اکابرین سیاست سے معمولی یا شدید اختلافات بھی تھے، لیکن چونکہ علامہ پرخلوص
طبیعت کے مالک تھے اس لئے ایسے لوگوں کی آمد پر بھی وہ ناگواری کا اظہار نہ کرتے۔

اقبال کی گفتگو میں بڑی مٹھاس اور چاشنی ہوتی تھی۔ وہ پنجابی، اردو اور انگریزی تینوں
زبانوں میں بات چیت کرتے تھے۔ گھر میں ان کی دوست احباب کے ساتھ گفتگو بالعموم
پنجابی میں اور بسا اوقات سلیس اردو میں ہوتی تھی۔ مسائل اور موضوع کے اعتبار سے
یہ گفتگو بعض مواقع پر انگریزی میں ہوتی، لیکن زبان سے قطع نظر علامہ کا اسلوبِ بیان ہمیشہ
سلجھا ہوا ہوتا تھا۔ اکثر اہلِ زبان حضرات کو ان کی ملاقات سے یک گونہ مسرت کا احساس نہ
ہوتا تھا۔ کیونکہ اقبال موقع بے موقع شعر کی داد نہ دیتے تھے اور نہ ہی بار بار آداب بجا لاتے
تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت ملاقاتوں اور مذاکروں میں گزرتا تھا۔

علامہ اقبال خلوت نشین نہیں، محفل نشین تھے۔ جب ان کا قیام میکلوڈ روڈ والی کوٹھی

بیں تھا اور صحت اچھی تھی تو تقریباً روزانہ شام کو ان کے دولت کدہ پر محفل جمتی تھی، جس میں ہر مذاق کے لوگ شریک ہوتے تھے۔" زمانہ علالت میں بھی جب کہ وہ جاوید منزل میں اُٹھ آئے تھے، یہی حال تھا۔ صبح سے دوپہر تک لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور شام کا وقت بھی اسی طرح گزر جاتا تھا۔ البتہ دوپہر سے چار بجے تک کا وقت تنہائی کا ہوتا تھا اور اس بیں علامہ صاحب سخت تکلیف محسوس کرتے تھے، پڑھنا بند ہو چکا تھا، موسیقی سے بے شبہ طبیعت بہل سکتی تھی، لیکن ہندوستانی موسیقی بہت الم انگیز اور پژمردہ ہے۔ اس لئے اقبال کی زندہ دلی کے لیے موزوں نہ تھی۔[1] ان صحبتوں اور ملاقاتوں کا حال بہت سوں نے لکھا ہے:

سید نذیر نیازی کے بقول: حضرت علامہ کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا اور ان کی سادگی پسندی اور بے ریا طبیعت نے امیر، غریب، اپنے، بیگانے، سب کو ایک نظر سے دیکھا، ان کے در دولت پر کبھی فرق مراتب یا امتیازات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا، معلوم نہیں لوگ کہاں کہاں سے آتے اور کیا کیا خیالات اپنے دل میں لے کر آتے، ان میں عامی بھی ہوتے اور جاہل بھی اور ان کے ساتھ پڑھے لکھوں کو بھی شریک محفل ہونا پڑتا، لیکن حضرت علامہ جس کسی سے ملتے، بغیر کسی تکلف اور احساس عظمت کے ملتے، بسا اوقات وہ اپنے ملنے والوں کی گفتگوؤں سے ایک طرح کا ذاتی تعلق پیدا کر لیتے، لہٰذا علامہ کی صحبت سے جو شخص اٹھتا، ان کے انکسار و وضعداری اور وسعت و کشادہ دلی کا ایک گہرا نقش لے کر اٹھتا۔ علالت کے آخری زمانے میں بھی جب ان کو زیست سے مایوسی ہو چکی تھی، ان کے اخلاق عالیہ اور کمال وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ان کے معمولی اور روزمرہ زندگی میں انتہائی تکلیف کے باوجود کوئی فرق نہ آیا، وہ اپنے ملنے والوں سے اسی خندہ پیشانی اور تپاک سے ملتے، جس طرح تندرستی میں ان کا شیوہ تھا، بلکہ اب انہوں نے اس بات کا اور بھی زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا تھا کہ ان کی تواضع اور خاطر داری میں کوئی فروگذاشت تو نہیں ہوئی"[1]

"اقبال کا انداز گفتگو نہایت دلآویز تھا، وہ ہر شخص کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے تھے اور ہر موضوع پر کرتے تھے، ان کی گفتگو رکیک و مبتذل الفاظ،

---

[1] رسالہ اردو، اقبال نمبر ص ۱۰۵۱

طنز و تشنیع اور ذاتیات کے حملے سے خالی ہوتی تھی اور اس میں کسی قدر ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی، لیکن اس میں تصنع کو دخل نہ تھا، بلکہ وہ ایک فطری چیز تھی، جو آخری دم تک قائم رہی"[1]

علامہ اقبال کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا اور اس غرض سے انہوں نے فارسی، عربی اور یورپین زبانوں کی بکثرت کتابیں جمع کی تھیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد پانچ سو سے زائد تھی۔ رحلت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق یہ کتابیں جون ۱۹۳۹ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دے دی گئیں۔ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ یورپ سے شائع ہونے والی جدید ترین سیاسی و فلسفیانہ نظریات کے متعلق انگریزی اور جرمن زبانوں کی کتب باقاعدہ پڑھتے تھے۔ ملک بھر کے اخبارات و جرائد ان کے نام آتے تھے، لیکن وہ ایک کے سوا باقی کو کھولتے بھی نہ تھے۔ مہینے دو مہینے بعد علی بخش ان تمام اخبارات کی ردی بیچ دیتا تھا۔

یارانِ محفل

علامہ کی لطفِ صحبت کا اندازہ ان کے یارانِ محفل ہی لگا سکتے ہیں۔ ان کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کرنے والوں کی فہرست تو بہت طویل ہے تاہم ان میں مرزا جلال الدین، مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، فقیر سید نجم الدین، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، سر محمد شفیع، سر فضل حسین، سر جگندر سنگھ، سردار امراؤ سنگھ، نواب ذوالفقار علی خاں اور راجہ نرندر ناتھ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام لوگ پہلے دور سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسرے دور میں مولانا ظفر علی خاں، خلیفہ شجاع الدین، خلیفہ عبدالحکیم، شیخ اکبر علی ارسطو، خان غلام رسول خاں، عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر شامل تھے، جن کے ساتھ علامہ کی گھنٹوں صحبتیں رہتیں۔ چوہدری محمد حسین تو برس ہا برس سے علامہ کے مخلص دوستوں میں شامل تھے، جب کہ مرتضیٰ احمد خاں میکش، حکیم محمد حسن قرشی، راجہ حسن اختر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حفیظ ہوشیارپوری،

---

1. Iqbal, His Art and Thought, P. 23.

منشی محمد دین فوق، سید نذیر نیازی، میاں محمد شفیع اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بھی اکثر و بیشتر علامہ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ سید امتیاز علی تاج، سید عابد علی عابد، میاں بشیر احمد اور پروفیسر حمید احمد خاں کو بھی کئی بار علامہ کی محفلوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔

اقبال کی رحلت کے بعد حکیم الامت کی صحبت میں بیٹھنے والوں نے اپنے ممدوح کے بارے میں جن جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا، وہ سنہری حروف میں لکھا گیا ہے۔ ان مداحوں کے تاثرات بھی حضرت علامہ کی باغ و بہار شخصیت کو سمجھنے میں کافی مدد دیتے ہیں۔ سالک مرحوم کا بیان ہے کہ ملک لال دین قیصر ایک زمانے میں دن رات علامہ ہی کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ چونکہ وہ قوم کے مجاہد خادم تھے، اس لئے اکثر قید ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دن ان کی والدہ ضعیفہ یہ سن کر کہ قیصر علامہ اقبال کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا، عین دوپہر کے وقت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یہ بیٹا میرے لیے وبال جان ہو رہا ہے اور ہمیشہ کسی نہ کسی قصے میں قید ہو جاتا ہے، آپ اس کو منع کیجئے۔ علامہ نے حسن تدبیر سے قیصر کو بعض خطرناک جلسوں اور تحریکوں سے باز رکھا۔ جب قیصر کی شادی ہوئی اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا، تو والدہ قیصر اس بچے کو لے کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ آپ اس کے لئے دعا کیجئے۔ علامہ نے اس کو درازئ عمر، ترقی درجات اور سلامتی ایمان کی دعا دی اور والدہ سے پوچھا کہ اس بچے کا نام کیا رکھا ہے؟ ضعیفہ محترمہ نے کہا کہ میں اس کا نام اقبال رکھوں گی۔[۱]

فرمائش پر کلام سنانا، اقبال کی عادت نہ تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی اپنے اثر و رسوخ سے انہیں مجبور نہ کر سکتا تھا کہ علامہ اپنا کلام سنائیں۔ مرزا جلال الدین کا بیان ہے کہ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام کے سلسلے میں یوپی کے رئیس راجہ نوشاد علی خاں لاہور تشریف لائے۔ وہ سر محمد شفیع کے ہاں ٹھہرے۔ ایک دن چائے پیتے ہوئے کہا کہ سر سید نے تو پنجابیوں کی زندہ دلی کی تعریف کی لیکن مجھے کوئی زندہ دلی نظر نہیں آئی۔ اس پر نواب ذوالفقار علی خاں کے ہاں "زر فشاں" میں ایک رنگا رنگ محفل منعقد ہوئی۔ اس محفل میں نوشاد علی خاں نے حضرت علامہ سے اصرار کیا کہ وہ اپنا

لہ ذکر اقبال ص ۲۳۴

کلام سنائیں۔ علامہ نے کہہ دیا کہ مجھے کوئی شعر یاد نہیں۔ نوشاد علی خاں کے بعد محفل میں شریک قریب قریب ہر شخص نے علامہ سے کلام سنانے کی پُر زور فرمائش کی، مگر علامہ نے ایسی نا پکڑی کہ ساری محفل منغض ہوگئی۔ راجہ نوشاد علی خاں محفل کے اختتام پر چلے گئے تو علامہ کے خاص دوستوں نے شکوہ کیا کہ آپ نے کلام نہ سُنا کر اچھا نہیں کیا۔ علامہ نے جواب دیا، یہ شخص وجاہت کی بنا پر مجھ سے شعر سننا چاہتا تھا اور میں وجاہت کی بنا پر کسی کو شعر نہیں سنایا کرتا۔

اسی طرح کے دو اور واقعات ہیں۔ علامہ اقبال حیدر آباد دکن گئے تو ایک روز جوش ملیح آبادی نے ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا، جس میں بطور خاص حضرت علامہ کو بھی مدعو کیا۔ علامہ نے دعوت کا تذکرہ خلیفہ عبدالحکیم سے کیا، تو معلوم ہوا کہ انہیں تو مدعو ہی نہیں کیا گیا۔ پہلے تو ان کے دل میں آیا کہ وہ نہ جائیں، لیکن پھر خیال آیا کہ دعوت قبول کرنے کے بعد نہ جانا زیادتی ہوگی۔ چنانچہ چلے گئے۔ جوش کا مقصد یہی تھا کہ اپنا کلام سنائیں گے اور کچھ علامہ اقبال سے بھی سنیں گے۔ محفل منعقد ہوئی۔ جوش نے فرمائش کی۔ پھر اصرار کیا مگر علامہ نے کلام سنانا تھا نہ سنایا۔ اس صورت حال کے بعد جوش بھلا اپنا کلام کیونکر سنا سکتے تھے، انہیں مجبوراً یہ محفل "مشاعرے" کے بغیر ہی ختم کرنا پڑی۔

دوسرا واقعہ خلیفہ عبدالحکیم کی زبانی یوں ہے: حضرت علامہ اور مہاراجہ سر کشن پرشاد کے تعلقات مدت سے دوستانہ چلے آرہے تھے۔ مہاراجہ صاحب نے علامہ کے اعزاز میں ایک نہایت شاندار دعوت طعام کا اہتمام کیا۔ علامہ کو اطلاع ہوئی۔ تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ دعوت ایک شرط پر قبول کروں گا کہ مجھ سے شعر سنانے کی فرمائش ہرگز نہ کی جائے۔ مہاراجہ کو ازبس پریشانی ہوئی، کیونکہ ان کا مقصد تو یہی تھا کہ اکابر حیدر آباد کو علامہ کا کلام سنوائیں۔ علامہ شریک محفل ہوئے۔ وہاں بعض شعراء و امراء نے اپنا کلام سنایا اور ایک دوسرے کو خوب داد دی۔ علامہ خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میں ان سے کلام سنانے کی استدعا کی گئی، تو علامہ خاموش رہے۔ بڑے بڑے امراء و حکام نے مہاراجہ صاحب سے گزارش کی کہ وہ حضرت علامہ کو آمادہ کریں، لیکن وہ پابندی عہد سے

مجبور تھے - آخر بہت ہی ناچار ہو کر انہوں نے گزارش کی کہ حضرت یہ سب لوگ آپ سے عقیدت کی وجہ سے کلام کے طالب ہیں - ان کو محروم رکھنا قرینِ مروت نہیں معلوم ہوتا۔ بہت سی حیص بیص کے بعد علامہ نے مجبوراً فارسی کے صرف یہ دو شعر سنائے ؎

بگزر از خاور و افسونیِ افرنگ مشو
کہ نیرزد بہ جوئے ایں ہمہ دیرینہ و نو
آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختۂ
ہم بہ جبریلِ امینے نتواں کرد گرو

اقبالؔ دوسری گول میز کانفرنس کے لیے انگلستان جا رہے تھے تو حسن اتفاق سے ڈاکٹر قاضی عبدالحمید کا ساتھ بھی ہو گیا - ان سے ہر موضوع پر گفتگو ہوئی - ان کا کہنا ہے: اس عرصے میں غالباً دنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے، جس پر علامہ مرحوم سے تبادلہ خیالات نہ ہوا ہو، معمولی سے معمولی اکل و شرب کے مسائل سے لے کر مشکل سے مشکل مابعدالطبعیاتی مسائل تک زیر بحث آ گئے - اور ہر چیز پر علامہ مرحوم کی وسیع معلومات اور ایک خاص زاویہ نگاہ دیکھ کر میں متحیر ہو جاتا تھا، ایک مرتبہ کھانوں کا ذکر آیا تو اس سلسلے میں انہوں نے بارھویں صدی ہجری میں مرکزی ایشیا میں جو کھانے رائج تھے اور وہاں جو مختلف قسم کے پھل ہوتے تھے - اس کا تذکرہ کیا اور بے انتہا کھانوں کے نام گنوا دیئے، میں ان کا غیر معمولی حافظہ دیکھ کر متحیر ہو گیا، وہ حد درجہ سادگی سے گفتگو فرما رہے تھے، وہ اپنے ساتھی کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ ایک بہت ہی بڑے عالم و فاضل کی معیت میں ہے، مخاطب کو مانوس اور اپنی خاکساری کے ظاہر کرنے کے لیے وہ ان سے اس قسم کے سوالات کرتے تھے کہ وہ گویا اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔[1] حضرت علامہ جب کبھی کسی موضوع پر یاران محفل سے گفتگو کرتے، دھیمے دھیمے انداز میں- ان کا انداز تکلم شیریں ہوتا تھا -

اقبال کے لطائف

علامہ کی طبیعت میں مزاح و تفنن بھی تھا - انہوں نے قوم کے سامنے شعر و حکمت کے

---

[1] رسالہ اُردو، اقبال نمبر ص ۹۳۵ - ۹۳۶

موتی ہی نہیں بکھیرے لطائف و ظرافت کے پھول بھی کھلائے۔" بانگ درا' میں ظریفانہ کلام دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جس طرح ان کا شعر ذوق، فلسفہ و حکمت کی جلا سے آبدار ہے، اسی طرح وہ لطائف اور بذلہ سنجی میں بھی دوسروں سے مختلف تھے۔ ظرافت دراصل انسان کے ذوق لطیف اور طبیعت کی شگفتگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اکثر آدمیوں کو دیکھا ہے کہ وہ شعر و ادب میں بڑے ستھرے اور بلند پایہ خیالات کے حامل ہوتے ہیں، ان کی فکر و تخیل کے رنگ و نکہت سے آراستہ ہوتے ہیں، لیکن ظرافت کے میدان میں بلند معیار قائم نہیں رکھ سکتے۔ روایتی نوک جھونک اور سطحی انداز تحریر انہیں ظرافت و لطافت سے ہزلیات کے خارزاروں میں کھینچ لاتے ہیں حتیٰ کہ سعدی ایسے قادر الکلام شاعر بھی جب ہزل کی طرف آتے ہیں، تو ان کا رنگ برقرار نہیں رہتا۔ لیکن علامہ اقبال مرحوم نے اس صنف میں بھی اپنی حکیمانہ انفرادیت قائم رکھی، ان کے ظریفانہ اشعار میں بھی استعارہ و تلمیح کے وہی جوہر موجود ہیں، جو ان کے حکیمانہ کلام کی روح تھے۔ مثلاً گائے کے نوکدار سینگ سے وہ ہندو کی پر پیچ سیاست کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور
اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

وہ مغربی طرز تعلیم پر طنز کرتے ہیں، لیکن مقصود و نظر یہاں بھی قوم کی اصلاح ہے ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے سیکھ لی فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

نئی تہذیب پر جو اسلامی معاشرہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے، اس سے بہتر تبصرہ کیا ہوگا ؎

سیاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

جب حکومت پنجاب نے لاہور میں اسمبلی ہال بنوایا تو علامہ نے کس بے ساختگی سے فرمایا ع

کوئی تکیہ نہ تھا، اس شہر میں سرمایہ داروں کا

علامہ اقبال کا ظریفانہ کلام بھی اصلاح و حکمت سے خالی نہیں[1] لیکن ان کے کچھ لطائف ایسے بھی ہیں جو بہت شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ظرافت تو ان کی طبیعت کا جزو لاینفک تھی، ظرافت بھی ایسی کہ اس میں بھدا پن اور چھچھورا پن نہیں پایا جاتا تھا، بلکہ ایک خاص ندرت، ذہانت اور لطافت پائی جاتی تھی اور وہ اس کے ذریعہ سے بہت سے مسائل کو بھی حل کر دیتے تھے: ایک بار کشمیری خاندان کے ایک شخص کاٹھیاواڑ کے کسی خاندان میں شادی کرنا چاہتے تھے، لیکن علامہ نے ان کو منع کر دیا اور کہا کہ پنجاب کی کشمیری برادری سے باہر شادی نہ کریں، اس پر ایک نوجوان طالب علم نے اعتراض کیا کہ آپ تو ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ذات پات کی تمیز مٹا دینی چاہیئے، کیونکہ ہماری ذات صرف اسلام ہے۔ اقبال نے ہنس کر جواب دیا 'یہ تو بالکل صحیح ہے لیکن خواجہ... اگر وہاں شادی کر لیں تو ان کی اولاد بھی کالی کلوٹی ہوگی اور اس طرح اس خاندان سے وہ صباحت رخصت ہو جائے گی، جو کئی پشتوں سے اس کی خصوصیت چلی آرہی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے بچے نہایت خوشرو اور سرخ و سپید ہوں، تاکہ ہم لوگ صحیح معنوں میں ملت بیضا بن جائیں" اس لطیفہ پر بے اختیار قہقہہ بلند ہوا اور دیر تک محفل میں خوش طبعی کی رو جاری رہی۔ اقبال، خود بھی اس لطیفے پر مسکراتے رہے۔

اقبال لطیفے کی قدر کرتے تھے۔ خود بھی محظوظ ہوتے اور لطائف و ظرائف سے ہم نشینوں کو ہنسایا کرتے تھے۔ دن میں سینکڑوں آدمی ان سے ملنے آتے اور طرح طرح کی باتیں ہوتیں۔ اس سلسلے میں ہر حلقے کی خبریں حضرت علامہ تک پہنچتی رہتی تھیں اور وہ یہ خبریں دوسرے دوستوں کے گوش گزار تے رہتے۔ ایک مرتبہ سالک مرحوم نے علامہ صاحب

---

[1] روزنامہ امروز، اقبال نمبر ۱۹۶۶ء

کو ایک اہم سیاسی خبر سنائی اور کہہ دیا کہ فی الحال آپ کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا۔ دوسرے دن شام کو سالک حاضر ہوئے تو حضرت علامہ نے وہی خبر ذرا رازداری سے انہیں سنادی کہ کوئی صاحب انہیں یہ سنا گئے ہیں۔ ساتھ ہی تاکید کرنے لگے کہ فی الحال یہ خبر راز میں رہنی چاہیئے۔ سالک بے اختیار ہنس پڑے اور بولے "حضرت یہ خبر تو میں نے ہی کل آپ کو سنائی تھی"۔ علامہ ہنس دیئے اور کہنے لگے: میرے ذہن میں خبر ہی رہ گئی اور خبر دینے والا نہ رہا۔

ایک روز علامہ اقبال ہندوستانی مذاہب پر گفتگو کر رہے تھے۔ بدھ مت کا ذکر آگیا، تو فرمانے لگے: انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ گاڑی جب سٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا: آل چینج یعنی سب بدل جاؤ۔ ایک روز حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے ارد گرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے، ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا: یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں، ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیئے۔ چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا۔ میں نے کہا کہ ابھی جواب دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر چپ رہا، چند منٹوں کے بعد انہوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا، میں نے پھر کہا، ابھی جواب دیتا ہوں۔ وہ کہنے لگے "شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں"۔ میں نے کہا "ہاں" اس دوران میں سٹیشن آگیا اور گارڈ پکارا "آل چینج" "سب بدل جاؤ" میں نے کہا "بس یہی بدھ مذہب ہے" یعنی مسئلہ تناسخ، جو بدھ مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے"۔

کیمبرج کے زمانہ میں چند ہمعصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی، ایک صاحب پوچھنے لگے "مسٹر اقبال، یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا میں آئے، وہ بلا استثناء ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ اقبال نے جواب دیا "بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پنجرا جمالیا۔ اللہ میاں نے

ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اس لئے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں، ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ وہ صاحب بول اٹھے "تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟" انہوں نے جواب دیا "یہ تمہارے میکاولی اور مشہور اہل سیاست اس کے رسول ہیں"۔ اس پر بہت قہقہہ پڑا[۱]

یورپ اور انگلستان میں ایسے افراد کی کمی نہیں، جو برصغیر پاک وہند کو بڑے بڑے دریاؤں، پہاڑوں، بیابانوں، شیروں، ہاتھیوں، سانپوں، بچھوؤں، سپیروں اور جنگلی آدمیوں کی سرزمین سمجھتے تھے۔ یہ خیال شروع شروع میں دراصل عیسائی مشنریوں، سرکاری ملازموں اور سیاحوں کی افسانہ طرازیوں کی پیداوار تھا تاکہ ان لوگوں کو اپنی بہادری اور دلیری کا سکہ جمانے کا موقع مل سکے۔ وہ عجیب وغریب افسانے بیان کرکے یورپ کی محفلوں کو گرماتے تھے۔ جب اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے، تو انہیں بھی اس قسم کی حکایات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مجلس میں ایک محترمہ پوچھنے لگیں: کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح سویرے کوئی سانپ ہوتا ہے؟ علامہ نے نہایت سنجیدگی سے برجستہ جواب دیا: نہیں بی جان، ہر روز نہیں، ہر تیسرے دن۔

چودھری شہاب الدین ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا شمار پنجاب کے جلیل القدر ارباب سیاست میں ہوتا تھا۔ وہ بڑے قابل وکیل اور نہایت کامیاب صدر مجلس قانون ساز تھے۔ علامہ اقبال سے پرانی یاد اللہ تھی۔ رنگ کالا تھا۔ گراں ڈیل اور بلند وبالا آدمی تھے اور کھانے پینے کے معاملے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ علامہ قریب قریب ہر ملاقات میں ان سے مذاق کرتے اور اگر کبھی چودھری سر شہاب الدین برا ماننے پہ آتے، تو کہتے کہ چودھری صاحب آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں، آپ کو دیکھتے ہی مجھ پر لطیفوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے، اس لئے مجھ سے خفا نہ ہوا کرو۔

ایک دفعہ شاہدرہ میں پارٹی ہوئی۔ بہار کا موسم تھا۔ چودھری صاحب اور علامہ

---

[۱] آثار اقبال ص ۵۹ - ۶۰

دونوں موجود تھے۔ چودھری صاحب نے از سرتا پا سفید لباس پہن رکھا تھا۔ علامہ نے بے اختیار پنجابی میں کہا: او دیکھو، کپاہ وچ کٹا وڑ گیا۔ یعنی دیکھنا، کپاس کے کھیت میں بھینس کٹڑا گھس گیا۔

ایک دن چودھری صاحب کی کوٹھی میں افطار پارٹی تھی۔ چودھری صاحب نے پانی مانگا۔ علامہ نے آدمی کو پکار کر کہا: دیکھو بھئی چودھری صاحب کے لیے بالٹی میں پانی لانا۔

چودھری صاحب نے اپنی عالیشان کوٹھی بنوائی، جو اپنی وسعت و عظمت اور بلندی میں نظیر نہ رکھتی تھی۔ علامہ سے کہا کہ اس کوٹھی کا نام سوچنا۔ علامہ نے کہا۔ سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیو محل رکھ دو۔

ایک اور لطیفہ ہے کہ چودھری شہاب الدین اپنی قانونی و انتظامی قابلیت اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بلدیۂ لاہور کے صدر منتخب ہو گئے۔ اسی زمانے کا ذکر ہے، سرشجاع الملک مہتر چترال لاہور تشریف لائے۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں کے ہاں پُرتکلف دعوت دی گئی اور نواب صاحب نے علامہ اقبال سے کہا کہ آپ ہز ہائینس سے مقامی معززین کا تعارف کرا دیجیے۔ علامہ اقبال تعارف کرانے لگے۔ جب چودھری صاحب کی باری آئی تو کہا: اعلیٰ حضرت ایں خاں بہادر چودھری شہاب الدین صدر بلدیہ لاہور، ہستند، گویا کہ مہتر لاہور می باشند۔ مجلس میں ایک قہقہہ لگا۔ چودھری صاحب جل کر کوئلہ ہو گئے[۱] مہتر صاحب کچھ نہ سمجھے اور علامہ کا لطیفہ کامیاب رہا۔

سر شہاب الدین سے حضرت علامہ کی جو نوک جھونک رہتی تھی، اسی سلسلے کا ایک اور لطیفہ ہے کہ ایک دن چودھری صاحب سیاہ سوٹ پہن کر بار کونسل میں تشریف لے آئے۔ حضرت علامہ نے دیکھتے ہی فرمایا، چودھری صاحب! آج تو آپ ننگے ہی چلے آئے۔

اسی طرح ایک روز چودھری صاحب غسل فرما رہے تھے۔ غسل خانے کی نالی باہر کی طرف بہتی تھی۔ علامہ کی جیب میں اس وقت اتفاق سے کالی روشنائی تھی یا وہ شاید قصداً

---

۱ اقبال ۲۶۹ - ۲۷۰

لے کر آئے تھے ۔ ادھر چودھری صاحب نہانے سے فارغ ہونے کے بعد کپڑے پہن رہے تھے ، ادھر حضرت علامہ نے فوراً روشنائی کی پڑیا کھولی اور نالی میں انڈیل دی جس سے صابن کا جھاگ اور پانی سیاہی میں تبدیل ہو گیا ۔ جونہی چودھری صاحب غسلخانے سے نکلے ۔ علامہ نے نالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : چودھری صاحب آج آپ نے صابن تو بہت استعمال کیا ۔

بعض اوقات علامہ اقبال بچوں کے ساتھ شعر میں بھی دل لگی کیا کرتے تھے ۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں ان کے نہایت عزیز دوست تھے اور وہ اکثر نواب صاحب کے ہاں جایا کرتے تھے ۔ نوابزادہ خورشید علی خاں ان دنوں چھوٹے سے تھے ۔ کوٹھی "زرافشاں" (کوینز روڈ موجودہ شارع فاطمہ جناح لاہور) کے سبزہ زار میں یوکلپٹس کے درخت تھے ، جن سے گوند نکلا کرتی تھی ۔ نواب زادہ جن کی عمر اس وقت کوئی نو دس سال کی ہوگی ، دن بھر ان درختوں سے گوند کھرچ کھرچ کر ڈبوں میں بھرا کرتے ۔ نوابزادہ صاحب کا بیان ہے کہ علامہ ہماری موٹر کار میں آتے اور اترتے ہی مجھے بلاتے : چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو ؟ میں کہتا : گوند نکال رہا ہوں ۔ تو فرماتے ع

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے

میں کہتا : بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرعے پر ختم ہو گئی ۔ فرماتے : ہاں بھئی ، ابھی تو ایک ہی مصرع ہوا ہے ۔ میں روز یہی شکایت کرتا کہ آپ کیسے شاعر ہیں ؟ دوسرا مصرع ہی نہیں کہہ سکتے ۔ آخر ایک دن تشریف لائے ، تو فرمایا : چھوٹے میاں ، آج ہم نے دوسرا مصرعہ بھی کہہ لیا : ؎

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہوگی ان کی شادی کسی نیک بخت سے

ایک دن حضرت علامہ اقبال دروازے سے باہر تشریف فرما رہے تھے کہ ایک فقیر ہاتھ میں ڈنڈا لئے تہمد باندھے آ گیا ۔ علامہ کرسی پر بیٹھے رہے اور اس نے آ کر ان کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیں ۔ آخر علامہ نے پوچھا کہ کس طرح آئے ہو ؟ فقیر نے کہا : میں فلاں پیر صاحب

کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ، انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے علاقے کا قلندر تو ڈاکٹر اقبال ہے ، تم ان کے پاس جاؤ۔ اقبال نے کہا کہ مجھے تو اس قلندری کے بارے میں اب تک کوئی اطلاع نہیں پہنچی - علامہ کی اس بات کو بھی وہ فقیر قلندری کے کوچے کی کوئی رمز سمجھا اور چپ چاپ ٹانگیں دباتا رہا۔ اتنے میں چودھری محمد حسین آگئے اور آتے ہی سر سکندر کے متعلق کوئی بات شروع کرنے کو تھے کہ علامہ نے ٹوک دیا اور کہا ، چودھری صاحب اس سکندری کو رہنے دیجئے آج یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں۔[1]

جرنیل نادر خاں نے جب علامہ اقبال سے پہلی ملاقات کی تو بڑے تعجب کا اظہار کیا اور کہا: آپ اقبال صاحب ہیں میں تو سمجھتا تھا کہ کوئی لمبی ریش والے بزرگ ہوں گے - علامہ نے برجستہ جواب دیا : میں آپ سے بھی زیادہ حیران اور مایوس ہوں - جرنیل کے لقب سے تو میں سمجھتا تھا کہ آپ بڑے قوی ہیکل ، دیو قامت آدمی ہوں گے - لیکن اتنا دبلا پتلا جسم تو جرنیل کے شایان شان معلوم نہیں ہوتا۔[2]

لارڈ کچنر جس جہاز میں آخری سفر کر رہے تھے ، وہ غرق ہو گیا تھا اور ان کی نعش بھی نہ ملی تھی اسی زمانے میں ایک افواہ اڑی کہ لارڈ کچنر بچا لئے گئے ہیں - ایک دوست نے علامہ سے ذکر کیا کہ سنا ہے لارڈ کچنر زندہ ہو گیا ہے - آپ نے فرمایا ؛ ہاں کارڈ لیور آئل کی صورت میں واپس آگیا ہو تو تعجب نہیں -

اخبار ' وطن ' کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں علامہ کے ہاں اکثر حاضر ہوتے تھے - ان دنوں علامہ انارکلی بازار میں رہتے تھے اور وہیں طوائفیں بھی آباد تھیں - میونسپل کمیٹی نے ان کے لیے دوسری جگہ تجویز کی ، تو انہیں وہاں سے اٹھا دیا گیا - اس زمانے میں مولوی انشاء اللہ کئی مرتبہ علامہ سے ملنے گئے ، لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ علامہ باہر گئے ہوئے ہیں - اتفاق سے ایک دن علامہ گھر پر مل گئے - مولوی صاحب نے مزاحاً کہا ، ڈاکٹر صاحب ! جب سے

---

[1] روایت ڈاکٹر سعید اللہ ، ملفوظات اقبال ص ۸۶

[2] ایضاً ص ۸۷

طوائفیں انار کلی سے اٹھوا دی گئی ہیں۔ آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔ علامہ نے جواب دیا: مولوی صاحب کیا کیا جائے، وہ بھی تو وطن کی بہنیں ہی ہیں۔ مولوی صاحب کٹ گئے[1]

ایک خاص فرقے کا ایک آدمی جو اپنے آپ کو مصلح موعود کہتا تھا، ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ روزانہ باتیں کرتا ہے علامہ ہنس کر کہنے لگے: خدا کی سب باتیں مان نہ لیا کرو، وہ بعض باتیں یوں بھی کہہ دیا کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن جاؤں گا اور دہلی کو پایۂ تخت بناؤں گا۔ علامہ فرمانے لگے: ہم تو غالباً اس وقت موجود نہ ہونگے، البتہ جاوید کو نہ بھولنا اور کم از کم جہلم کا علاقہ اسے ضرور بخش دینا۔ علامہ کے مرض الموت میں یہ شخص عیادت کے لیے حاضر ہوا اور کہنے لگا آپ نے مجھے پہچانا تو نہ ہوگا۔ علامہ ہنسے اور کہنے لگے: واہ ہم اور آپ کو نہ پہچانیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ولی را ولی می شناسد[2]

علامہ اقبال اپنے استاد مولوی میر حسن کا بے حد احترام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے کبھی شعر سنانے کی جرأت بھی نہ کی۔ فرماتے ہیں: زندگی بھر میں شاہ صاحب کے سامنے صرف ایک مرتبہ میری زبان سے ایک مصرع نکل گیا، وہ بھی اتفاقی طور پر۔ مولوی صاحب کسی کام کے لیے گھر سے نکلے۔ ایک بچہ جو ان کے عزیزوں میں تھا، ان کے ساتھ تھا۔ اس کا نام احسان تھا۔ مولوی صاحب نے فرمایا: اقبال اسے گود میں اٹھا لو۔ میں نے اٹھا لیا، مگر تھوڑی دور جا کر تھک گیا۔ چنانچہ میں نے بچے کو ایک دکان کے تختے پر کھڑا کر دیا اور خود سستانے لگا۔ مولوی صاحب بہت آگے نکل چکے تھے۔ مجھے اپنے ساتھ نہ پایا تو لوٹے اور میرے قریب آکر فرمایا: اقبال اس کی برداشت بھی دشوار ہے؟ میری زبان سے بے اختیار نکلا......

"بترا احسان بہت بھاری ہے"۔

فقیر سید وحید الدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ فقیر صاحب اپنے عزیز کی موٹر میں بیٹھ کر علامہ سے ملنے آئے۔ موٹر میں ان کے کتے بھی تھے۔ یہ لوگ

---

[1] روزگار فقیر ج ۱ ص ۵۹

[2] روایت راجہ حسن اختر بحوالہ ہفت روزہ قندیل اپریل ۱۹۴۸ء

علامہ کی خدمت میں جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد علامہ کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی: ابا جان موٹر کار میں کتے آئے ہیں۔ علامہ نے ان حضرات کی طرف اشارہ کر کے کہا: نہیں بیٹیا یہ تو آدمی ہیں ل‍ے

ایک شام، علامہ اقبال کی خدمت میں گورنمنٹ کالج کے کچھ طلبہ حاضر ہوئے۔ ان میں سے اکثر بے ریش اور خوب بنے ٹھنے ہوئے تھے۔ پہلے مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر پردہ کے متعلق بحث چھڑ گئی۔ ان میں سے ایک کہنے لگا، ڈاکٹر صاحب، اب ہمیں پردہ اٹھا دینا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "آپ عورتوں کا پردہ اٹھا دینا چاہتے ہیں اور میں اس فکر میں ہوں کہ کالجوں کے لڑکوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے۔

گول میز کانفرنس کے سلسلے میں علامہ اقبال ولائت گئے تو مولانا شفیع داوٗدی واپسی پر ان کے ساتھ تھے۔ سکندریہ کے قریب جہاز پہنچا، تو اتفاق سے کانفرنس کی روداد مولانا شفیع داوٗدی کے ہاتھ سے چھوٹ کر سمندر میں جا پڑی۔ آس پاس بہت سے عرب کشتیوں پر آجا رہے تھے۔ مولانا سے کچھ بن نہ پڑا۔ تو حضرت علامہ کو مدد کے لیئے پکارا۔ انہوں نے مولانا شفیع سے کہا کشتی بانوں سے کہو: یا شیخ ذالک الکتاب لاریب فیہ مولانا شفیع داوٗدی عربی نہیں جانتے تھے، لیکن تھے مولانا۔ اقبال کے کہنے میں آگئے اور جونہی انہوں نے یا شیخ ذالک الکتاب لاریب فیہ پکارا، جہاز پہ بیٹھے ہوئے سب لوگ ہنس پڑے۔

ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی نے منادی، میں لکھا کہ میں اقبال اور ٹیگور دونوں میں سے کسی کو ہندوستان کا شاعر اعظم نہیں مانتا۔ اتفاقاً انہی دنوں علامہ اقبال نے خواجہ صاحب سے فاسفورس کا تیل منگوایا اور خط میں لکھا کہ فاسفورس کا تیل جوڑوں کے درد میں بہت مفید ثابت ہوا ہے اس لئے دو شیشیاں اور بھیج دیجئے خواجہ صاحب نے یہ منادی میں چھاپ دیا۔ خط کا عنوان یہ تھا: فاسفورس کے تیل کے

ل‍ے روایت مرزا جلال الدین بحوالہ ملفوظات اقبال

متعلق ہندوستان کے شاعرِ اعظم کی رائے، اس واقعہ پر کسی ظریف نے کہا کہ علامہ اقبال ناسفورس کا تیل استعمال کر کے ہندوستان کے شاعرِ اعظم بن گئے۔ بعض لوگوں نے علامہ موصوف سے خواجہ صاحب کی اس دلچسپ حرکت کا ذکر کیا، تو وہ مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

ایک دن حضرت علامہ خاص خاص دوستوں کی محفل میں بیٹھے تھے کہ علی بخش کی مونچھوں کا ذکر چھڑ گیا کوئی صاحب کہنے لگے کہ علی بخش کی مونچھوں کی رنگت خاکستری ہے۔ دوسرے نے کہا: خاکستری نہیں اگرئی ہے۔ علامہ موصوف بھی سن رہے تھے، کہنے لگے: میرے نزدیک تو ان کی رنگت مُچھئی ہے۔

ایک مرتبہ علامہ موصوف کہنے لگے کہ قرآن سے زیادہ مظلوم دنیا میں کوئی کتاب نہیں لوگوں نے پوچھا: وہ کس طرح؟ کہنے لگے: آج جو شخص اٹھتا ہے قرآن کی تفسیر یا ترجمہ کرنا شروع کر دیتا ہے، جس زمانے میں انہوں نے یہ باتیں کیں ان دنوں بعض ایسے لوگ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر کرنے میں مصروف تھے، جنہوں نے قرآن ناظرہ بھی نہیں پڑھا تھا۔ بقول علامہ صاحب، ایک صاحب کا یہ حال ہے کہ سورہ عصر کا ترجمہ کرنے بیٹھے تو والعصر کا ترجمہ یوں کیا: قسم ہے نمازِ عصر کی اور اگر ایک مشہور عالم دین انہیں نہ روکتے تو وہ لفی خسر کا ترجمہ "سسر" کر دیتے۔

اقبال کے لطائف میں علم و حکمت اور پند و موعظت کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک بار وہ بہت سے شیدائیوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ہندو، آپ کا نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ وہ حضرت علامہ کو پہلے سے نہیں جانتا تھا اور صرف ان کی شہرت اور ان کے نام سے واقف تھا۔ اس نے علامہ کے ایک دو شیدائیوں سے استفسار کیا کہ اقبال کون سے ہیں؟ انہوں نے حضرت علامہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ ہندو حضرت علامہ کے قریب آیا اور پوچھنے لگا: جی آپ ہی اقبال ہیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا: نہیں۔ ہندو پریشان ہو کر دوبارہ شیدائیوں میں آگیا اور ایک دو اور لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے پھر اقبال کی طرف ہی اشارہ کیا۔ وہ پھر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا، مگر علامہ نے کہا کہ میں اقبال نہیں ہوں۔ تیسری مرتبہ جب وہ پھر آیا، تو حضرت علامہ نے اس

سے سوال کیا کہ تمہیں کیسے یقین ہوا ہے کہ اقبال یہی ہیں۔ اُس ہندو نے عرض کی کہ اتنے بہت سے لوگوں سے میں نے آپ کا پوچھا ہے اور وہ آپ ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں حضرت علامہ مسکرائے اور کہنے لگے کہ اسی طرح تو ہزاروں اور لاکھوں لوگ کہتے ہیں کہ ایک خدا ہے اور اس کا ایک رسول بھی ہے، تم ان پر بھی یقین کیوں نہیں کر لیتے۔ ہندو یہ سن کر لاجواب ہو گیا۔ اُس کا دل ایمان کی روشنی سے منور ہو چکا تھا۔ چند لمحوں بعد اُس نے حضرت علامہ اقبال کے قدموں کو چھوتے ہوئے کہا کہ آپ ولی ہیں، مجھے میرا خدا اور رسولؐ مل گیا ہے۔ آج سے میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاتا ہوں۔ علامہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، تو آپ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملانے لگے۔ آپ کی معمولی سی ظرافت ایک کافر کو حلقۂ اسلام میں لے آئی تھی لے۔ حضرت علامہ کے یہ لطائف نہ صرف ان کی بذلہ سنجی کی افتادہ کا پتہ دیتے ہیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی لطافت ظرافت خالی از حکمت نہیں تھی۔

فیاضی و خودداری

یہ دونوں خوبیاں بھی حضرت علامہ اقبال کی زندگی میں شامل تھیں۔ علامہ صاحب کی فیاضی کا حال تو زبان زد خاص و عام ہے، غریبوں کے ہمدرد تھے ابتدائی زندگی میں ایک بھکاری کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہوئے، مگر والد کی ڈانٹ۔ ان کے دل کو غریبوں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھول دیا اب اقبال کے در پر آنے والا کوئی گداگر خالی نہ جاتا تھا۔ جو کچھ ہو سکتا، غریبوں کی خدمت کرتے اور اگر کبھی پاس کچھ نہ ہوتا، تو دعاؤں سے یاد کرتے۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ اقبال نے غریب لوگوں کے بچوں کو ملازمت دلانے کے لئے ارباب بست و کشاد کے نام سفارشی چھٹیاں لکھیں۔ وہ اپنے ہاں آنے والے حاجت مندوں کو کبھی مایوس نہ لوٹاتے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ تمام لوگ امراء و سلاطین سے مال و دولت کی توقع رکھتے

لے بچشم دید واقعہ مجھے میرے والد بزرگوار نے سنایا (ایم۔ ایس ناز)

ہیں، لیکن اقبال خود اپنا ذاتی سرمایہ امراء و سلاطین کی نذر کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ ہے: نادر شاہ لاہور کے راستے افغانستان جا رہے تھے۔ علامہ صاحب کو معلوم ہوا تو اسٹیشن پر ان کی ملاقات کو گئے اور ان کو علیحدہ لے کر کہا کہ آپ جس مہم کو جا رہے ہیں، اس کے لئے آپ کو روپیہ کی تو ضرورت نہیں۔ چونکہ مرحوم نادر شاہ کو معلوم تھا کہ اقبال کوئی دولت مند آدمی نہیں ہیں، اس سوال سے متعجب ہوئے اور جواب دیا کہ آپ خود ایک غریب آدمی ہیں اور میں آپ سے روپیہ لینا نہیں چاہتا۔ اقبال نے کہا: میں بے شبہ غریب ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے پاس آپ سے زیادہ روپیہ ہے۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے پاس کس قدر روپیہ ہے؟ نادر شاہ نے اقرار کیا کہ درحقیقت ان کے پاس بہت تھوڑے روپے ہیں، اس پر اقبال نے کہا کہ میرے پاس پانچ ہزار روپے ہیں، اگر آپ چاہیں تو ان کو لے سکتے ہیں[1]۔

اقبال کو ان کی درویشی، قلندری اور فیاضی نے نہایت مستغنی، بے نیاز اور خود دار بنا دیا تھا۔ اس کی مثال پنجاب کی وہ تحریک ہے، جو اقبال کی امداد کے لیے شروع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ پنجاب میں ایک تحریک شروع ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دو لاکھ کی رقم جمع کر کے اقبال کی خدمت میں پیش کی جائے تاکہ وہ فکر معاش سے آزاد ہو کر کلیتہً شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو سکیں اخباروں میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ لیکن انہوں نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی اور فرمایا اول تو میری خود داری مجھے ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ غریب قوم کی جیب پر ایسی رقم کا بوجھ ڈالوں، دوسرے یہ کہ ہر شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کا فن اس وقت تک زندہ رہتا ہے، جب تک وہ زندگی کی تگ و دو میں شریک ہے، جو لوگ دنیا کے ہنگامے سے کٹ کر گوشہ عافیت اختیار کر لیتے ہیں یا بغیر مشقت کے آرام و راحت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں، وہ اس الہام سے محروم ہو جاتے ہیں، جو صرف زندگی کے اتار چڑھاؤ میں براہ راست شریک ہونے سے حاصل ہو سکتا ہے، ایک آرٹسٹ کا نقطہ نگاہ اور نصب العین عوام کے نقطہ نگاہ اور نصب العین سے مختلف ہوتا ہے، اس ندرت ذوقِ نظر کے باعث فرد

---

1. Iqbal His Art and Thought. P. 25

اور سوسائٹی میں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس تصادم سے ایسی چنگاریاں پھوٹتی ہیں، جن سے آرٹسٹ کا فن حیات تازہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میرے اوقات کا بیشتر حصہ فکر معاش اور دنیوی مکروہات میں ضائع ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ اگر میں زندگی کی کش مکش سے علیحدہ ہو جاؤں، تو میری شاعری بھی اس تڑپ سے محروم ہو جائے گی، جس کا سب سے بڑا منبع خود زندگی ہے"[۱]

خودداری کے امتحان اور آزمائش کا سخت مرحلہ اقبال کی زندگی میں اُس وقت پیش آیا، جب وہ علالت کے باعث بستر پر دراز ہو گئے اور اپنا پیشہ وکالت بھی تج دیا۔ یہ زمانہ حضرت علامہ کے لیے بڑی پریشانی کا تھا۔ وکالت کا سلسلہ بند ہوئے تین چار سال گزر چکے تھے ان کی زندگی میں کسب مال اور حصول منصب کی ہزاروں شکلیں پیدا ہوئیں، لیکن ان کی استغنا پسند اور فقیرانہ طبیعت نے غیرت و خودداری میں آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھا، وہ کسی قسم کے احسان اور منت پذیری یا غرض جوئی کو تصور میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حقیقت میں یہ ملّت کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس نازک موقع پر اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے محض اپنے تعلق خاطر اور خدمت اسلامی کے جذبہ میں خود اپنی جیب سے حضرت علامہ کا ماہوارہ وظیفہ مقرر کر دیا، تاکہ وہ حسب خواہش قرآن مجید کے حقائق و معارف پر قلم اٹھا سکیں۔ اس کے بعد اگرچہ متعدد ذرائع سے کوششیں ہوئیں کہ حضرت علامہ مزید وظائف قبول کریں، مگر انہوں نے ہمیشہ انکار کر دیا اور یہی کہا کہ میں ایک فقیر آدمی ہوں، مجھے جو کچھ، اعلیحضرت دیتے ہیں، میری ضروریات کے لیے کافی ہے"[۲] اور یہ حضرت علامہ کی قناعت اور سادگی پسندی بھی تھی۔ ایک خط میں حضرت علامہ نے سر راس مسعود کو لکھا:

"اعلیحضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئین جوانمردی نہیں ہے"[۳]

---

[۱] ماہنامہ 'ادبی دنیا' اگست ۱۹۴۴ء ص ۱۲

[۲] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۰۴۱

[۳] اقبال نامہ ص ۲۶۸

ایک اور خط میں انہیں لکھتے ہیں: اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لئے کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہو، تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں، بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے، ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے، جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے[1] یہ وہ موقع تھا کہ جب ہز ہائینس سر آغا خاں نے ان کا وظیفہ مقرر کرنا چاہا، تو انہیں تذبذب تامل ہوا۔ اسی علالت کے زمانہ میں حیدر آباد میں "یوم اقبال" منایا گیا اور اس سلسلے میں ان کی خدمت میں ایک چیک بھیجا گیا، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ شاید آپ لوگوں نے مجھے نہیں سمجھا[2]۔ یہ چیک ایک ہزار کا تھا اور توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو سر اکبر حیدری وزیر اعظم کے ماتحت تھا، بطور تواضع بھیجا گیا چونکہ یہ دوستانہ ہدیہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا کہ اس سے کچھ لینا علامہ کی غیرت مندی کو گوارا نہ تھا، اس لئے آپ نے ان اشعار کے ساتھ چیک واپس کر دیا ؎

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر — حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش — کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

(ارمغان حجاز)

اقبالؔ، جائز و ناجائز کے متعلق بے حد محتاط تھے۔ وکلاء کے پاس مؤکل عموماً تحائف و ہدایا لاتے ہیں۔ جو محنتانہ کے علاوہ ہوتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال کو پیشہ وکالت کے دوران ان تحائف و ہدایا کے قبول کرنے میں بھی تامل تھا۔ چنانچہ

---

[1] اقبال نامہ ص ۴۷

[2] سب رس، اقبال نمبر ص ۳۴

انہوں نے سید سلیمان ندوی کو اس صورت سے آگاہ کر کے سوال کیا کہ آیا ایسا مال مسلمان کے لیے حرام ہے یا حلال ؟ یہ سوال، حضرت علامہ کے ایک مکتوب میں مذکور ہے، جو انہوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام لکھا۔

معیارِ زندگی

قناعت کا یہ عالم تھا کہ اقبال نے کبھی روپیہ کمانے کی کوشش نہ کی۔ ان کی وکالت کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی کبھار کوئی مقدمہ لے لیا اور شہرت و ناموری حاصل ہو جانے کے بعد بہت سے لوگ علامہ کی طرف رجوع کرتے تھے، لیکن وہ صرف اتنے مقدمے لیتے تھے، جن کی آمدنی سے ان کے اخراجات پورے ہو جاتے۔ مصارف خانگی میں انتہائی کفایت شعاری مدنظر تھی۔ آمد و خرچ کا حساب نہایت باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ اور آخر دم تک اس شعار پر کاربند رہے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے اقبال نے فقیری میں بھی بادشاہی کی اور تھوڑی بہت رقم پس انداز بھی کرتے رہے، اپنی اس عادت کے بارے میں سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھتے ہیں، میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے، جو کسی طرح بھی مسلمان کے شایان شان نہیں۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے[1] گویا اقبال امیرانہ زندگی گزارنے کی بجائے سادگی اور قناعت پر انحصار کرنے والوں میں سے تھے اور سادگی اور درویشی ہی کو مسلمانانِ عالم کے شایان شان سمجھتے تھے۔

علامہ اقبال کوئی بڑے جاگیردار، سرمایہ دار یا صنعت کار نہ تھے۔ اُن کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا، جن کی سوائے ایک آدھ مکان کے، کوئی جائیداد تھی نہ زمین۔

---

[1] مکاتیب اقبال

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے زیادہ تر مصارف ان کے بڑے بھائی برداشت کرتے رہے۔ پھر جب اقبال یورپ سے واپس آئے اور انہوں نے بیرسٹری اور پروفیسری شروع کی، تو بھی وہ کوئی بڑے دولت مند نہ بن سکے۔ عمر عزیز کا زیادہ تر حصہ کرائے کے مکانوں میں بسر کیا اور اس سفید پوشی، سادگی اور قناعت پسندی کے ساتھ دیانتدارانہ زندگی گزاری کہ اپنے پرائے سب ہی ان کے دلدادہ ہو گئے۔ ان کے دیانتدارانہ کردار کے اس پہلو کی عکاسی ان کی آمدنی کے گوشوارہ سے بھی ہوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی یا اقبال کے شیدائی کو ان کے گوشوارہ آمدنی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ زندگی کی شاہراہ پر چلتے چلتے ہر موڑ پر ایسے سرمایہ دار، جاگیردار یا صنعت کار بہت مل جاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے اصل چہروں کو محض اس لئے چھپا رکھا ہوتا ہے کہ وہ دن رات دولت کی تجوریاں بھرنے کے باوجود اپنی جائز یا ناجائز کمائی میں سے انکم ٹیکس ادا نہیں کرتے اور پھر ایسے لوگ بھی کم نہیں ہیں، جو انکم ٹیکس بچانے کی خاطر کذب بیانی سے کام لیتے ہیں۔ تجربے نے تو بارہا یہ ثابت کیا کہ عام زندگی میں سچ بولنے والے جب انکم ٹیکس کا گوشوارہ بھرتے ہیں، تو انہیں صحیح آمدنی ظاہر کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا اور یوں ان میں سے اکثر دل کے مریض ہو جاتے ہیں۔ لیکن علامہ اقبال کی زندگی ان لوگوں سے قطعی مختلف تھی۔ وہ اپنی صحیح آمدنی ظاہر کرتے تھے اور بروقت انکم ٹیکس ادا کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہے کہ دنیا کے ایک عظیم انسان، جو ایک بیرسٹر اور پروفیسر ہونے سے کہیں زیادہ کامیاب شاعر اور فلسفی تھا، اس کے ذرائع آمدنی، اخراجات اور انکم ٹیکس کا پتہ چلتا ہے، جب کہ بڑے بڑے لوگ بالعموم اپنی آمدنی ظاہر کرتے ہیں نہ ذرائع آمدن بتاتے ہیں۔ انکم ٹیکس کی ادائیگی کی تفصیلات ظاہر کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ انکم ٹیکس ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۶-۱۹۱۵ء تک علامہ اقبال پر انکم ٹیکس لاگو نہیں تھا۔ شاید اس عرصہ میں علامہ اقبال کو وکالت اور درس و تدریس کے میدان میں قدم جمانے میں مشکلات پیش آئیں، جیسا کہ عموماً ہر پیشے اور کاروبار کے ابتدا میں ہوتا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد پہلے نو دس برسوں میں اقبال کی آمدنی

ناقابل ٹیکس تھی۔ صفدر محمود رقمطراز ہیں: سرکاری فائل کے مطابق مالی سال ۱۷-۱۹۱۶ء میں آپ کی آمدنی (INCOME) تین ہزار چھ سو چودہ روپے (۳۶۱۴/-) تشخیص ہوئی، جس پر آپ کو ۹۴ روپے انکم ٹیکس لگا۔ اس زمانے میں ابھی کتابوں کی آمدنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۱۷ء کے بعد اقبال کی آمدنی بتدریج بڑھتی رہی۔ ریکارڈ کے مطابق ۱۸-۱۹۱۷ء میں آپ کی آمدنی چار ہزار دو سو پچیس روپے (۴۲۲۵)، ۱۹-۱۹۱۸ء میں چار ہزار ایک سو تراسی روپے اور ۲۰-۱۹۱۹ء میں گیارہ ہزار چھ سو نواسی روپے (۱۱۶۸۹) تھی۔ ان برسوں میں علامہ اقبال کو علی الترتیب ایک سو دس (۱۱۰)، ایک سو سات (۱۰۷)، اور پانچ سو اڑتالیس روپے ٹیکس ادا کرنا پڑا۔ یہ کل آمدنی نہیں تھی، کیونکہ اس میں وکالت کے اخراجات منفی کر کے آمدنی تشخیص کی گئی تھی۔ البتہ ذاتی اخراجات الگ تھے۔ وکالت کے اخراجات کے طور پر دفتر کا کرایہ، تانگے کا خرچ، منشی کی تنخواہ، سٹیشنری کا خرچ وغیرہ کل آمدنی سے منفی کر کے اصل آمدنی پر ٹیکس لگتا تھا، جو ۲۰-۱۹۱۹ء میں ۱۱۶۸۹ روپے بنتی تھی۔ ظاہر ہے اگر یہ آمدنی آج کل کی آمدنی سے کم از کم آٹھ گنا ہے۔ گویا آج کے روپے کی قیمت سامنے رکھتے ہوئے، اقبال کی اس سال کی آمدنی تقریباً ۸۸ ہزار روپے تھی۔ مالی سال ۲۱-۱۹۲۰ء سے آپ کو مختلف یونیورسٹیوں سے بہ حیثیت ممتحن کافی آمدنی ہونے لگی۔ یہ واحد ذریعہ آمدنی تھا جو بڑی معقول صورت میں رحلت تک جاری رہا۔ اس مد پر نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ آمدنی اچھی خاصی افسرانہ تنخواہ کے برابر تھی اور ظاہر ہے کہ پرچے بنانے اور دیکھنے کا کام اس تواتر سے کوئی سست مزاج آدمی نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ اس دور میں بھی جب آپ انتہائی بیمار تھے یا سیاست میں حد درجہ مصروف تھے یا گول میز کانفرنس کے سلسلے میں انگلستان گئے ہوئے تھے۔ یونیورسٹیوں سے معقول آمدنی ہوئی، جو ایک لحاظ سے آپ کے علمی مزاج کی غمازی کرتی ہے۔

مالی سال ۲۲-۱۹۲۱ء میں اقبال کو شاعری سے یا کتاب سے پہلی بار آمدنی ہوئی، جو تشویشناک حد تک کم ہے۔ اقبال کی پہلی کتاب 'اسرار خودی' تھی، یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اور دلچسپ امر یہ ہے کہ اس پر علامہ اقبال کو سٹینڈرڈ اسلامی حق مہر کے برابر صرف ۳۲ روپے رائلٹی ملی۔ بہر حال ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک علامہ کا گوشوارہ آمدنی، انکم ٹیکس کے ریکارڈ کی روشنی میں حسب ذیل ہے:

مالی سال	تشخیص شدہ آمدنی	وکالت سے آمدنی	یونیورسٹیوں سے آمدنی	ٹیکس
۱۹۱۶-۱۷ء	۳۶۱۴ روپے	×	×	۹۴ روپے
۱۹۱۷-۱۸ء	۴۲۲۵ روپے	×	×	۱۱۰ روپے
۱۹۱۸-۱۹	۴۱۸۳ روپے	×	×	۱۰۷ روپے
۱۹۱۹-۲۰	۱۱۶۸۹ روپے	×	×	۵۴۸ روپے
۱۹۲۰-۲۱	۸۶۸۹ روپے	۸۱۴۶ روپے	۱۴۶۷ روپے	۱۷۲ روپے ۸ آنے
۱۹۲۱-۲۲	۱۰۰۸۴ روپے	۹۸۸۰ روپے	۱۴۸۹ روپے	۵۲۳ روپے
۱۹۲۲-۲۳	۷۱۹۲ روپے	۶۰۶۸ روپے	۲۰۰۹ روپے	۴۲۲ روپے
۱۹۲۳-۲۴	۱۳۶۰۸ روپے	۷۲۶۰ روپے	۲۲۷۶ روپے	۶۳۷ روپے
۱۹۲۴-۲۵	۱۳۷۰۲ روپے	۷۷۹۳ روپے	۱۸۸۰ روپے	۶۴۲ روپے
۱۹۲۵-۲۶	۵۳۳۸ روپے	۴۰۱۶ روپے	۲۳۱۶ روپے	۱۶۶ روپے
۱۹۲۶-۲۷	۱۲۰۶۲ روپے	۳۳۷۷ روپے	۲۱۴۶ روپے	۵۶۵ روپے
۱۹۲۷-۲۸	۹۳۶۲ روپے	۲۲۸۶ روپے	۴۹۷۲ روپے	۲۹۲ روپے
۱۹۲۸-۲۹	۱۵۶۷۹ روپے	۱۱۶۵۱ روپے	۹۶۹ روپے	۴۳۷ روپے
۱۹۲۹-۳۰	۱۵۴۱۰ روپے	۸۰۶۲ روپے	۱۵۶۲ روپے	۶۲۸ روپے
۱۹۳۰-۳۱	۱۶۸۹۴ روپے	۴۹۲۵ روپے	۱۹۴۸ روپے	۱۴۰۷ روپے

ان برسوں میں علامہ اقبال کو اپنی تصانیف کی اشاعت اور رائلٹی سے بھی معقول آمدنی ہوئی۔ یعنی ۱۹۲۳-۲۴ء میں کتابوں کی فروخت پر تین ہزار آٹھ سو، ۱۹۲۴-۲۵ء میں بانگ درا کی فروخت سے ۵ ہزار ۵ سو [۵۵۰۰]، ۱۹۲۶-۲۷ء میں ملی جلی فروخت سے چھ ہزار دو سو بیس روپے [۶۲۲۰] ۱۹۲۷-۲۸ء میں 'زبور عجم' سے چار ہزار چھ سو انہتر روپے، ۱۹۲۸-۲۹ء میں خطبات مدارس سے دو ہزار ایک سو روپے [۲۱۰۰] اور دوسری کتابوں سے ایک ہزار چھ سو تین روپے [۱۶۰۳]، ۱۹۲۹-۳۰ء میں خطبات مدارس سے پانچ سو روپے [۵۰۰] اور 'پیام مشرق' سے تین ہزار چار سو تہتر روپے [۳۴۷۳] اور ۱۹۳۰-۳۱ء میں بانگ درا سے دس ہزار چار سو پچاسی روپے [۱۰۴۸۵] آمدنی ہوئی۔ ان ہی برسوں میں علامہ اقبال کو

۲۴-۱۹۲۳ء میں دو ہزار سات سو روپے ۲۷۰۰، ۲۵-۱۹۲۴ء میں پانچ سو روپے ۵۰۰، ۱۹۲۵-۲۶ء میں سات سو اکہتر روپے ۷۷۱، ۲۷-۱۹۲۶ء میں ایک ہزار آٹھ سو چوراسی روپے ۱۸۸۴، ۲۸-۱۹۲۷ء میں ایک ہزار چار سو نو روپے ۱۴۰۹، ۲۹-۱۹۲۸ء میں ایک ہزار دو سو اڑتیس روپے ۱۲۳۸، ۳۰-۱۹۲۹ء میں ایک ہزار پانچ سو چھیاسی روپے ۱۵۸۶ اور ۳۱-۱۹۳۰ء میں ایک ہزار ایک سو تہتر روپے ۱۱۷۳ رائلٹی ملی۔ انکم ٹیکس کی فائل کے مطابق علامہ اقبال کو ۱۷-۱۹۱۶ء سے لے کر ۳۱-۱۹۳۰ء تک کل ایک لاکھ انچاس ہزار سات سو اکتیس روپے ۱۴۹۷۳۱ آمدنی ہوئی۔ جس پر انہوں نے چھ ہزار نو سو اڑتالیس روپے ۶۹۴۸ ٹیکس ادا کیا۔ گویا اس دور میں ٹیکس ادا کرنے کے بعد ان کی خالص آمدنی ایک لاکھ بیالیس ہزار سات سو تراسی روپے تھی، جس میں سے انہوں نے کار خریدی اور انتالیس ہزار پانچ سو روپے بنک میں جمع کرائے۔ اس حساب سے بنک والی رقم منہا کرنے کے بعد اقبال کی خالص آمدنی ایک لاکھ تین ہزار دو سو تراسی روپے تھی۔ اس آمد و خرچ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ علامہ اقبال کا معیار زندگی اطمینان بخش تھا۔ ۳۲-۱۹۳۱ء اور ۳۳-۱۹۳۲ء میں آپ گول میز کانفرنس میں شرکت کے سبب ملک سے باہر رہے اور پھر آپ کو گلے کی خرابی کا عارضہ ہو گیا۔ اس لئے ان برسوں میں ماسوا ۳۷-۱۹۳۶ء کے آپ کی آمدنی خاصی کم ہو گئی تھی۔ ان برسوں میں وکالت سے آمدنی بہت ہی کم تھی۔ گزارا یونیورسٹیوں کی آمدنی، رائلٹی اور کتابوں کی فروخت پر تھا۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں آپ کی مستقل بیماری کے زمانے میں نواب بھوپال نے وظیفہ مقرر کر دیا۔ جو پانچ صد روپے ماہانہ تھا۔ اس عرصہ میں آپ کے گوشواروں میں بنک کے سود سے بھی برابر آمدنی ہو رہی تھی۔ انکم ٹیکس کی فائل کے مطابق ۳۶-۱۹۳۵ء سے آپ کی وکالت بند ہو چکی تھی اور اس شعبے سے آمدنی صفر تھی۔ یہ صورت حال علامہ کی وفات تک جاری رہی۔

گوشوارہ ملاحظہ ہو۔

مالی سال	تشخیص شدہ آمدنی	وکالت سے آمدنی	یونیورسٹیوں سے آمدنی	سود	رائلٹی	ٹیکس
۱۹۳۱-۳۲ء	۳۷۵۶ روپے	۱۶۰۰ روپے	۲۵۴۱ روپے	۲۸۶ روپے	۱۲۵۲ روپے	۱۴۶ روپے
۱۹۳۲-۳۳ء	۴۶۵۷ "	۴۸۰ "	۲۲۳۰ "	۳۱۱ "	۱۱۳۲	۱۸۱ "
۱۹۳۳-۳۴ء	۴۱۰۶ "	۴۱۵ "	۱۸۰۰ "	۳۰۱ "	۱۳۴۱	۱۶۰ "
۱۹۳۴-۳۵ء	۴۶۰۹ "	۶۰۰ "	۱۸۳۴ "	۱۲۴ "	۹۱۲	۱۶۸ "

مالی سالی	تشخیص شدہ آمدنی	وکالت سے آمدنی	یونیورسٹیوں سے آمدنی	سود	رائلٹی	ٹیکس
۱۹۳۵-۳۶ء	۷۸۶۰ روپے	×	۱۳۷۵	۵۵	۸۲۰	۳۹۹ روپے
۱۹۳۶-۳۷	۱۶۰۶۵ "	×	۶۶۰	۱۷	×	۱۴۵۰ "
۱۹۳۷-۳۸ء	۸۰۶۲ "	×	۹۴۹	×	×	۴۰۹ "

ریکارڈ کے مطابق علامہ اقبال نے ۱۹۱۶-۱۷ سے لے کر رحلت تک ۱,۹۸,۸۴۶ روپے کمائے اور ۹۸۶۱ روپے ٹیکس ادا کیا۔ اس آمدنی کا تجزیہ درج ذیل ہے۔

وکالت سے آمدنی	کتابوں سے آمدنی	یونیورسٹیوں سے آمدنی
۱,۰۰,۷۲۴ روپے	۶۲۹۶۷ روپے	۳۴۷۳۱ روپے

آمدنی کے ان گوشواروں سے کچھ اور دلچسپ باتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ علامہ نے اپنی رقم پر بنکوں سے سود لیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس دور میں جو لوگ اپنی رقوم پر بنکوں سے سود وصول نہیں کرتے تھے، وہ حکومت مشنری اداروں اور عیسائیت کا پرچار کرنے والی انجمنوں کو دے دیتی تھی۔ علامہ اقبال بھی شاید دوسرے مسلمان بزرگوں کی طرح اس صورت حال سے بچنے کے لئے اپنی رقوم پر سود وصول کرتے رہے۔ معتبر روایات کے مطابق علامہ سود کی رقم غریبوں میں تقسیم کر دیتے یا رفاہی اداروں کو دے دیتے۔ گوشواروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی جو کتاب سب سے زیادہ فروخت ہوتی رہی، وہ بانگ درا ہے اور یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ اقبال نے ایک کامیاب بیرسٹر ہونے کے باوجود پیشہ وکالت سے اچھی خاصی رقم کمائی۔*

اقبال کے اسلوب زندگی کی ان مختلف تصویروں میں اخلاص کے متعدد شوخ رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں سادہ مزاج، درویش صفت، متوکل اور عاشق رسولؐ تھے علم وفضل اور شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی ان کی منکسر المزاجی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

انہوں نے اپنی بعض نظموں میں بھی اپنے بعض محاسن اخلاق کی طرف اشارے کئے ہیں،

---

* صحیفہ اقبال نمبر ۱۹۷۳ء سے ماخوذ۔

جن سے ان کے کردار کا پرتو ملتا ہے ؎

پُرسوز نظر بازونکو بین دکم آزاد

آزاد دگرفتار تہی کیسہ وخورسند

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم

کیا چھینے گا غنچہ سے کوئی ذوق شکر خند

کہاں سے تونے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی

کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

اقبال
عوامی عدالت میں

حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کی عظمت کا اعتراف اپنے اور پرائے سبھی کرتے ہیں۔ وہ ایک معمار کی حیثیت سے تشریف لائے اور ان کا جذبۂ تعمیر صرف خواص ہی کے لیے نہیں، عوام کے لیے بھی تھا۔ انہوں نے ملت کو بیدار کرنے کے لیے حسبِ موقع خطابت کی، بیانات دیے اور سیاست میں حصہ لے کر قوم کی رہنمائی کی۔ تبصرے کیے اور تنقید کا حق بھی ادا کیا۔ ان کی شخصیت کا روشن پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اشعار اور فلسفیانہ افکار سے مسلمانانِ عالم کو بالعموم اور اسلامیانِ ہند کے دلوں کو بالخصوص گرمایا۔ ان کی آواز کانوں سے دلوں تک پہنچی اور خون کے اندر جذب ہو کر خیالات و افکار اور مقاصد و عزائم کی دنیاؤں میں نئی بہاروں کا سامان بنی۔ ان کی پکار جس شخص نے بھی سنی، وہ بے تاب و مضطرب ہوا اور اس کے دل میں یہ تڑپ ضرور پیدا ہوئی کہ یہ پکار اس تک پہنچے اور یہ صدا پھر اس کے کانوں سے ٹکرائے۔ اس دور میں کون ایسا ہے، جس کو محبوبیت کا یہ بلند مقام نصیب ہوا ہو۔ مگر اقبال کی آفاقی شہرت کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو حکیم الامت کی ذات سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں پر تعصب، تنگ نظری اور ذاتی عناد کی عینک لگا کر اقبال کی شخصیت میں ہر وقت کیڑے نکالنے کی فکر اور جستجو میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ گو کہ اس نقار خانہ میں ان "طوطیوں" کی آواز کوئی سننے والا نہیں، تاہم ان کی طرف سے اقبال کی مقدس اور باعظمت شخصیت پر لگائے گئے الزامات کا جواب دینا از بس ضروری ہے۔ حکیم الامت نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا ۔

کسی ادب کی جو قسمت بگڑنی ہے اقبال

تو پہلے ہوتے ہیں نادان نکتہ چیں پیدا

یہ نکتہ چیں وہ ہیں، جن سے بات بنے نہیں بنتی اور وہ حکیم الامت علامہ اقبال کی ذات بابرکات کو محض طعن و تشنیع کی زد میں لا کر اپنی ہی صورت کو بگاڑ لیتے ہیں۔ ایسے نکتہ چیں مخالفت برائے مخالفت کے نظریہ پر قائم ہوتے ہیں اور ادب کو صرف ادب ہی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب نہ تو مقصدیت سے ہمکنار ہوتا ہے اور نہ ہی ادب سے قوم کی تقدیر بنتی اور سنورتی ہے۔ حیران کن اور دلچسپ امر تو یہ ہے کہ اقبال کی ذات کو ہدف تنقید بنانے والے تقریباً سبھی نکتہ چیں، اقبال کے کلام کی معرفت اور عظمت کو نہیں سمجھتے اور وہ علامہ کی شاعری تو درکنار، ان کی اس سیاسی زندگی کو بھی ایک لحظہ بھول جاتے ہیں۔ جس کی بدولت آج پاکستان قائم و دائم ہے۔ سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ برصغیر کے جن لوگوں کو اقبال نے ایک واضح نصب العین دیا، اسی قوم میں سے ان کے عاقبت نا اندیش نکتہ چیں پیدا ہو گئے، جنہوں نے اقبال باکمال کی ذات پر لغو قسم کے الزامات لگانے شروع کر دیئے۔ یہ ایک باقاعدہ سیاست، بلکہ منظم سازش تھی، جس کے پس پردہ ایک خاص قسم کا گمراہ مذہبی گروہ تھا۔ وہ مذہبی گروہ، جس کے متعلق برصغیر میں سب سے پہلے حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے یہ آواز بلند کی تھی کہ اسے غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ ادھر اقبالؒ نے یہ نعرہ مستانہ بلند کیا، ادھر ان مذہبی گماشتوں نے اقبال کی ذات شریف پر طرح طرح کی الزام تراشیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے الزام لگایا کہ :۔

ا۔ اقبال شراب پیتے ہیں ؟

ب۔ اقبال کی زندگی رنگ رلیوں میں گزری ؟

ج۔ اقبال نے ایک طوائف کو قتل کیا۔ ؟

د۔ اقبال قادیانی تھے ؟

یہ الزامات، سوالات کی شکل میں اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی قسم کے الزامات کئی بار علامہ کی زندگی میں بھی تراشے گئے، لیکن اقبال نے انہیں کبھی درخور اعتنا نہ جانا اور یہ الزامات اقبال کے نادان نکتہ چیں سمیت اپنی موت آپ مر گئے۔ آج ان الزامات کی محض صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے اور فقط ایک ایسا گمراہ طبقہ موجود ہے، جو کبھی کبھار ان الزامات

کو بھی محفلوں میں ہوا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ ان لوگوں کی کمی نہیں، جو شاعرِ مشرق کی شرافت اور نیک طبیعت کی قسم کھاتے ہیں اور ان کی حیات افروز زندگی کی قدر کرتے ہیں۔

اقبال نے ایک انتہائی شریف، دین دار اور باشرع گھرانے میں جنم لیا، جس کی فضائیں نیکی، پارسائیؒ، عصمت اور پاکیزگی سے معمور تھیں۔ اقبال کے والد گرامی صوفی منش اور بڑے متقی و پرہیزگار بزرگ اور ان کی والدہ ماجدہ پابند صوم و صلوٰۃ اور بڑی صالح خاتون تھیں۔ پاکباز و پرہیزگار والدین کے علاوہ اقبال کو سب سے پہلے شمس العلماء سید میر حسن شاہ صاحب ایسے اعلیٰ صفات وارفع عادات بزرگ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ان تمام بزرگوں نے علامہ اقبال کو نیکی اور بدی کا فرق اور اچھے بڑے کی تمیز سب سے پہلے اور اچھی طرح ذہن نشین کرائی، اقبال ان ہی کے فیض سے اسلام کے بنیادی اصولوں سے روشناس ہوگئے۔ ان کی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے ہی شعائرِ اسلام سے ان کی بے پناہ محبت اور خدا اور رسول مقبولؐ سے والہانہ عشق کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے، لیکن اگر ذرا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے، تو ان کی تمام زندگی پر یہ محبت اور عشق مساوی نظر آتے ہیں۔ کیا یہ اس ابتدائی تعلیم کا اثر نہیں تھا؟[1]

اس فطری اصول سے انکار ممکن نہیں کہ جو بات بچپن میں روح و ذہن پر مرتسم ہو جائے یا جو عادت کم سنی ہی میں پختہ ہو جائے، وہ کبھی فراموش نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جب اقبال انتہائی پاکیزہ ماحول اور نیکی سے بھرپور فضاؤں میں پروان چڑھے ہوں اور صوفی منش اور متقی اصحاب نے انہیں زیور علم سے آراستہ کیا ہو، تو یہ ناقابلِ فہم ہے کہ اقبال شراب نوش ہو جائیں اور رنگ رلیوں جیسی لغزشوں سے اپنے پاکیزہ دامن کو آلودہ بھی کر لیں۔ یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔

مے نوشی:۔

اقبال کے چند عاقبت نااندیش نکتہ چیں ان پر ایک الزام یہ بھی لگاتے ہیں کہ حضرت

---

[1] ۔ اقبالؒ درون خانہ ص ۱۲۳

علامہ مے نوش تھے اور اس ضمن میں انتہائی لغو اور بے بنیاد دلائل دیتے ہیں۔ ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ 'شراب' کا لفظ حضرت علامہ نے اپنے کلام میں بھی استعمال کیا ہے۔ اس الزام میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی اور نہ ہی کوئی ایسا ٹھوس ثبوت ملتا ہے کہ جس سے اقبال پر محض مے نوشی کا شبہ بھی کیا جا سکے۔" ایک دفعہ درد گردہ کی شدید تکلیف ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے نہ معلوم کس بنا پر کھانے کے بعد برانڈی کا ایک 'پیگ' بطور دوا تجویز کیا، لیکن حضرت علامہ نے اس سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا: تمام یورپ کے دوران بھی جس چیز کو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا، اب اس معمولی سی تکلیف کے لیے کیسے استعمال کر سکتا ہوں اور میں تو موت سے بچنے کے لیے بھی کسی حرام چیز کا سہارا لینے کا روادار نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک درد گردہ کی شدید تکلیف برداشت کرتے رہے، لیکن کبھی برانڈی کے 'پیگ' کا نسخہ استعمال کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ آخر حکیم نابینا کے علاج سے گردوں کی پتھری پیشاب کے ساتھ تھوڑی تھوڑی کر کے خارج ہو گئی[1] سوال یہ ہے کہ اگر علامہ پر مے نوشی کا الزام صحیح ہوتا، تو وہ بطور علاج کے برانڈی کا ایک پیگ استعمال کرنے سے قطعاً انکار نہ کرتے۔

علامہ اقبال کی شراب نوشی کی تکذیب میں ایک اور واقعہ یوں مذکور ہے کہ ایک سکھ حضرت علامہ سے شرف ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ علی بخش کا بیان ہے کہ میں نے اسے علامہ صاحب کے پاس پہنچا دیا، کیونکہ ان کے پاس ہر قسم اور ہر مذہب کے لوگ آتے جاتے تھے کسی کو روک ٹوک نہ تھی۔ بیٹھتے ہی اس سکھ نے ایک گلاس مانگا۔ میں نے اس کے ارادے سے ناواقفیت کی بنا پر گلاس لا کر دے دیا۔ اس سکھ نے ایکا ایکی اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے بوتل نکالی اور گلاس میں شراب انڈیل کر غٹاغٹ پی گیا۔ حضرت علامہ اسے دیکھتے رہ گئے۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور مجھ سے گرجدار آواز میں مخاطب ہوئے۔ علی بخش! تم نے اس کمبخت کو گلاس کیوں لا کر دیا اور جب یہ شراب پینے لگا تھا تو اسے روکا کیوں نہیں؟ اب یہ گلاس باہر پھینک دو اور اس بدتمیز شرابی کو میرے گھر سے باہر

---

[1] : روایت حکیم محمد حسن قرشی روزنامہ کوہستان اقبال نمبر ۱۹۵۹ء / اقبال درون خانہ ص ۱۲۵

نکال دو۔ میں نے خاموشی سے علامہ کے احکامات پر عمل کیا، لیکن باقی سارا دن ان کی طبیعت مکدر رہی اور اس روز پہلی دفعہ مجھے زندگی میں علامہ سے جھڑکیاں سننا پڑیں لے اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ مے نوشی تو درکنار، شراب سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ اپنے سامنے کسی کو شراب نہیں پینے دیتے تھے۔ علی بخش، ان کے ہاں انگلستان جانے سے قبل ملازم ہوا، اور مرتے دم تک ان کا جاں نثار اور غمگسار رہا۔ اس سے معتبر کسی اور کی رائے نہیں ہو سکتی۔

اس بہتان کی نفی میں خالد نظیر صوفی رقمطراز ہیں "میری والدہ محترمہ ایک واقعہ یوں بیان فرماتی ہیں۔ ایک روز نشست گاہ میں محفل جمی ہوئی تھی۔ چچی جان (والدۂ جاوید) اور میں اس وقت ملحقہ کمرے میں تھیں۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا، جس سے بند ہونے کے بعد تمام گفتگو بآسانی سنی جا سکتی تھی۔ چچا جان اس وقت اپنے حیدر آباد (دکن) کے حالاتِ سفر بیان فرما رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے بتایا کہ ایک روز حیدر آباد کے وزیرِ اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد کے ہاں رات کے کھانے کی دعوت تھی۔ کھانے کے بعد ناچ گانا شروع ہوا اور جام چھلکنے لگے۔ چچا جان اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا۔ کیا آپ نے بھی شوق فرمایا؟ چچا جان نے بلا تامل اور بڑی ملائمت سے جواب دیا۔ نہیں بھائی! میں محفل سے اٹھ گیا، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ ۲ے اگر حضرت علامہ مے نوشی کا ذرا بھی شغل فرماتے یا ان کی عادت ہوتی، تو وہ اس کا برملا اظہار نہ کرتے، تو کم از کم خاموش ضرور رہتے۔ لیکن اس موقع پر بھی اقبال نے خاموشی کو گناہ یا اعتراف گناہ سمجھا اور پُر زور الفاظ سے اس الزام کی تردید کر دی۔

صاحبِ اقبال درون خانہ مزید لکھتے ہیں "میری والدہ مکرمہ حلفیہ بیان فرماتی ہیں کہ

لے اقبال کی کہانی، علی بخش کی زبانی۔ قندیل اقبال نمبر ۱۹۵۰

۲ے اقبال درون خانہ ص ۱۲۴-۱۲۵

"حضرت علامہ نے کبھی شراب سے شغف نہیں رکھا۔ وہ اتنا طویل عرصہ ان کے پاس رہیں، لیکن ان کے مشاہدے میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا، جس سے یہ شبہ ہو سکتا ہو کہ علامہ صاحب شراب کا شوق کرتے تھے اور نہ ہی علامہ صاحب کی بیگم صاحب (والدۂ جاوید) نے کوئی ایسا اشارہ کیا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے میرے خیال میں کسی قسم کے پردے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب کہ والدہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ وہ بلا روک ٹوک حضرت علامہ کے کمرے میں چلی جایا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے باہر جانے کے بعد ان کے کمرے کی پوری طرح تلاشی لیا کرتی تھیں، تاکہ کوئی ایسی کتاب مل جائے، جو ابھی تک پڑھی نہ ہو۔ ان حالات میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علامہ روزانہ رات کو سونے سے پیشتر ایک بوتل شراب پیا کرتے تھے تو وہ خالی بوتل آخر کیا ہوتی تھی[1] اور بات بھی صحیح ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتے، جب کہ شرابی سے احتیاط کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی، تو پھر علامہ صاحب کی شراب کی خالی بوتل کو، کون سی بوتل کا جن راتوں رات اڑا کر لے جاتا تھا۔

اقبال پر مے نوشی کا الزام لگانے والے عموماً ایک خط کا حوالہ دیتے ہیں۔ اقبال اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں "اس لیے اب واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈوں کہ خودکشی کا مرحلہ آسان ہو جائے"[2] یہ خط بعض مخصوص حالات کے پیش نظر انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۹۰۹ء میں لاہور سے لکھا گیا اور اس خط سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال نے ۱۹۰۹ء تک شراب کو منہ تک نہ لگایا تھا اور یورپ میں قیام کے دوران وہ اس لعنت سے بچے رہے۔ خواجہ عبدالوحید کا تعلق حضرت علامہ سے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء تک یعنی دم واپسیں تک رہا۔ ان کا بیان ہے۔ میں نے حضرت علامہ کو شروع سے لے کر ان کی وفات تک (تقریباً تیس برس) حقہ پیتے دیکھا اور کبھی یہ نہیں سنا کہ انہوں نے اس تمام زمانے میں شراب کو ہاتھ لگایا ہو[3] اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علامہ اقبال

---

[1] اقبال درون خانہ ص ۱۲۴

[2] اقبال از عطیہ بیگم ص ۳۷۔

[3] اقبال ریویو، جنوری ۱۹۶۹ء ص ۷۴

نے عالم شباب سے لے کر عالم جاودانی کو سدھارنے تک شراب نوشی سے اپنا دامن پاک رکھا۔

عاقبت نا اندیش نکتہ چین، اپنی نادانی میں اس مفروضے کا جواز پیدا کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ شراب نوشی کے بغیر شاعری ناممکن ہے۔ یہ تصور حقیقت کے سراسر منافی ہے، کیونکہ اگر اس مفروضے کو صحیح مان لیا جائے، تو پھر سب شاعروں کو شرابی ماننا پڑے گا اور یہ ممکن نہیں۔ اس دور میں بھی کئی عظیم شاعر زندہ ہیں، جو شراب مطلقاً نہیں پیتے، لیکن شعر کہنے میں بدطولیٰ رکھتے ہیں۔ اقبال تو پھر بھی اقبال تھے کہ جن کی شاعری کے متعلق یہاں تک کہا گیا کہ وہ آیات قرآنی کی تشریح ہے۔ جب عظیم شخصیات کا نظریہ بلکہ ایمان یہ ہو کہ "اقبال کی شاعری قرآن کی آیات سے مملو ہے، اور پڑھنے والوں کے علاوہ سننے والوں کو بھی باوضو ہونا چاہیے۔ تو پھر اس الزام سے کہ اقبال مے نوش تھے۔ حکیم الامت کی کھلی توہین ہی نہیں، بلکہ تذلیل بھی ہوتی ہے۔ شاعر مشرق خود فرما گئے ہیں ؎

کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منت تاک

کیا یہ حقائق اور وزنی دلائل، اقبال کے نادان نکتہ چینوں کو آئینہ دکھانے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

رنگ رلیاں

اقبال کے بعض نادان نکتہ چین ان پر رنگ رلیاں منانے کا الزام بھی بڑے شدومد سے لگاتے ہیں اور اس قسم کا الزام لگانے والوں میں وہ طبقہ بھی شامل ہے جسے اقبال کا بہت کم قرب نصیب ہوا، بلکہ انہیں کبھی کبھار ہی اقبال کی بارگاہ میں شرف باریابی حاصل ہوا یا انہوں نے صرف دو تین موقعوں پر شاعر مشرق کو انجمن حمایت کے سالانہ جلسوں میں نظمیں پڑھتے ہوئے دیکھ لیا اور پھر نادان نکتہ چینوں کے مفروضوں پر ایمان لے آئے اور اقبال کی بے داغ شخصیت پر الزام لگانا شروع کر دیا کہ وہ رنگ رلیاں منایا کرتے تھے۔ ایسے ہی نادان نکتہ چینوں اور الزام لگانے والوں کی باتوں میں مولانا عبدالمجید سالک بھی آ گئے اور

انہوں نے اس کی طرف یوں اشارہ کر ڈالا کہ: رنگ رلیوں کا ذکر آ گیا، تو یہ بھی سن لیجیے کہ اقبال عنفوان شباب میں اپنے عہد کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے، بلاشبہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے، شہد کی مکھی کبھی نہ بنے، لیکن آج بھی ان کے بعض ایسے کہن سال احباب موجود ہیں، جو اس گئے گزرے زمانے کی رنگین صحبتوں کی یاد کو اب تک سینوں سے لگائے ہوئے ہیں، خود اقبال نے اپنی ابتدائی لغزشوں کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی، ان کے تمام ہمنشیں اس حقیقت کے گواہ ہیں، علاوہ بریں مثنوی رموز بیخودی کے آخر میں حضور رحمۃ للعالمین، میں عرض حال کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشق مجاز اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا، لیکن یہ آرزو میرے سینے میں برابر آباد رہی کہ میری موت حجاز میں ہو، فرماتے ہیں[1]

مدتے بالالہ رویاں ساختم — عشق با مرغولہ مویاں باختم

بارہا با ماہ سیمایاں زدم — بر چراغ عافیت داماں زدم

برقہا گرد حاصلم — رہزناں بر دند کالائے دلم

ایں شراب از شیشۂ جانم نریخت

ایں زر سارا ز دامانم نریخت

مولانا عبدالمجید سالک کا دعویٰ ہے کہ وہ اقبال کی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے والوں میں شامل تھے اور یہ کہ وہ حضرت علامہ کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں، کہ اور کوئی نہیں جانتا۔ ان کی ان معلومات کا اظہار ذکر اقبال، میں بھی جا و بیجا ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ذکر اقبال، میں سالک مرحوم نے بعض ایسی باتوں کو ابدا میں محفوظ کر دیا، جو واقعی مستند اور اقبال کی سوانح سے متعلق تھیں، لیکن اس میں بھی انہوں نے اقبال کو ایک خاص عینک سے دیکھا اور ان کی سوانح کو ایک خاص مقصد اور نقطہ نظر سے قلمبند کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اقبال کی ذات سے متعلق وہ چند ایسی باتیں بھی کہہ گئے، جن کا حقیقت سے

---

[1] ذکر اقبال ص ۷۰-۱۷

دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ اقبال کو بچپن میں بٹیر پالنے کا شوق تھا اور "مولانا میر حسن بھی انہیں منع نہ کرتے تھے"۔ بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کمبخت! اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے؟ تو اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے[1] اوّل تو یہ بات بالکل غلط ہے کہ اقبال کو بچپن میں یا کبھی بٹیر پالنے کا شوق تھا، البتہ انہیں کبوتر پالنے کا جو شوق تھا، اس کا تذکرہ ہر کتاب میں موجود ہے اور سب لوگ جانتے ہیں "صاحب ذکرِ اقبال" کی مجہول نویسی کے اس شاہکار پر تبصرہ کرتے ہوئے صوفی نے لکھا ہے۔ ایک معمولی عقل و فہم کا مالک بھی سالک صاحب کی اس تحریر پر سوائے ہنسنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا مقامِ غور ہے کہ موجودہ زمانے میں جب استاد کا رعب اور وقار تقریباً ختم ہو چکا ہے، اگر ایک طالب علم بٹیر پکڑے بیٹھا سبق پڑھ رہا ہو اور استاد کے پوچھنے پر مندرجہ بالا جواب دے تو استاد اس کی مرمت نہیں کرے گا تو کم از کم اس کے والدین تک شکایت ضرور پہنچائے گا۔ اب ذرا اس دور کو تصور میں لائیے، جب استاد کے دبدبے اور رعب سے طالب علم تو کجا والدین تک کانپتے تھے۔ اقبال بٹیر لیے بیٹھے ہیں اور استاد کے پوچھنے پر استاد کو بھی بٹیر پکڑنے کا مشورہ دیتے ہیں اور طرفہ یہ کہ استاد انہیں کچھ بھی نہیں کہتے۔ علامہ اقبال اپنے استادوں خاص طور پر مولانا میر حسن صاحب کا جس قدر ادب و احترام کرتے تھے، اس کے متعلق متعدد کتابوں میں ذکر آیا ہے۔ ایک دفعہ کسی نے شاعرِ مشرق سے پوچھا تھا کہ کیا کبھی سرری صاحب (مولانا میر حسن صاحب) کو اپنے اشعار بھی سنائے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی[2] حضرت علامہ تو اپنے استاد مکرم کا انتہائی ادب کرتے تھے۔ اس بارے میں ان کے ایک ہم مکتب کا بیان ہے:

"حضرت علامہ جیسا مؤدب شاگرد آج تک دیکھا، نہ سنا، شاگردی کے زمانے

---

[1] ذکر اقبال ص ۱۲

[2] اقبال درون خانہ ص ۱۳۶

میں شاہ صاحب قبلہ کے سامنے باادب بیٹھ کر سبق حاصل کرنا علامہ صاحب پر ختم تھا۔ اقبال بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد بھی جب کبھی شاہ صاحب سے ملاقات کے لیے آتے تو دو زانو ہو کر بڑے باادب ان کی خدمت میں بیٹھتے اور انتہائی خشوع و خضوع سے ان کی نصیحتیں سنتے۔ اگر شاہ صاحب کوئی سوال کرتے تو اس کا مختصر ترین جواب دے کر انہیں گفتگو کا زیادہ موقع دیتے۔[۱]

اقبال پر رنگ رلیاں منانے کا الزام ان کے ایک اور نادان نکتہ چین نے بھی لگایا ہے اور اقبال کی "حیاتِ معاشقہ" کے عنوان سے یہاں تک دشنام طرازی کی ہے کہ اقبال قیامِ یورپ کے دوران اپنی استانیوں مس ویگی ناسٹ، مس فنی شیل اور ایک دوسری خاتون عطیہ بیگم سے معاشقے لڑاتے تھے[۲]۔ اس نادان نکتہ چین کی مفروضہ نگاری کا پول صرف اس معمولی سی بات سے کھل جاتا ہے کہ بقول ان کے علامہ اقبال کی بیگم صاحبہ (والدہ جاوید) وکٹوریہ گرلز کالج کی طالبہ تھیں[۳]۔ انہوں نے یہ تحقیق بھی غالباً ذکرِ اقبال سے کی، جس کے صفحہ ۷۰ پر سالک نے لکھا ہے کہ اقبال کی بیگم صاحبہ (والدہ جاوید) وکٹوریہ گرلز سکول کی طالبہ تھیں، جو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اقبال کی بیگم صاحبہ "کالج تو کیا، کسی سکول کی تعلیم یافتہ بھی نہیں تھیں۔ والدہ جاوید گھر پر صرف قرآن مجید اور معمولی اردو پڑھی ہوئی تھیں اور صحیح طرح لکھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ شادی کے بعد انہوں نے معمولی اردو لکھنا سیکھا"[۴] اور کسی نکتہ چین نے اقبال کی رنگ رلیوں کا پس منظر اور پیش منظر بیان کرنے میں انہیں وکٹوریہ گرلز سکول کی طالبہ بنا ڈالا تو کسی نے کالج کی۔ شاید اس لیے کہ ع

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے

اقبال کا عالمِ شباب سامنے ہو تو یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ قیامِ یورپ کے

---

[۱] روایت، پروفیسر محمد دین بھٹی

[۲] [۳] اقبال با کمال، عظیم فیروز آبادی ص ۱۰۵ - ۱۰۶

[۴] اقبال درونِ خانہ ص ۱۲۸

تین برسوں میں اضافہ اور بعد میں بھی جب کبھی وہ یورپ گئے، انہوں نے گوشت بالکل استعمال نہ کیا چہ جائیکہ وہ شراب پیتے یا رنگ رلیاں مناتے۔ واپس آکر اقبال اکثر بتایا کرتے تھے کہ وہاں کوئی گوشت مسلمان کے قابل نہیں ہوتا، کیونکہ غیر اسلامی طریق سے ذبح شدہ جانوروں اور سؤر کا گوشت ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ یورپ میں غیر ذبیحہ جانور کے گوشت سے اجتناب قریب قریب ناممکن تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب نے انگلستان میں اس کے متعلق خاص احتیاط کی اور آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش کی کہ ان کے قیام کا انتظام ایسے گھر میں کرا دیا جائے، جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ چنانچہ آرنلڈ صاحب نے اقبال کی حسب منشا ان کا انتظام کر دیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ، جب اقبال پہلی مرتبہ بحیثیت ایک طالب علم کے انگلستان گئے، تو ایک لیڈی کے مکان میں قیام کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا لوٹا ساتھ تھا اور جب وہ رفع حاجت کے لیے غسل خانہ میں جاتے تو یہ لوٹا ان کے ساتھ ہوتا۔ چند روز اسی طرح گزرے تو ان کی میزبان یعنی مالکہ مکان نے پوچھا کہ یہ چیز تم غسل خانے میں کیوں لیجاتے ہو؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں ہے بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے، اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کئے اور لیڈی صاحبہ کو ان پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ یہ باتیں سن کر وہ بہت خوش ہوئیں اور فرمانے لگیں کہ میں بھی ضرور ایسا کیا کروں گی، کیونکہ مسلمانوں کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہیں۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یورپ پہنچ کر اقبال پر مذہبی رنگ اور بھی غالب آگیا اور جب ایک شخص کی یہ حالت ہو کہ وہ غیر ذبیحہ جانور کا گوشت نہ کھائے اور طہارت کے لیے اسلامی طریق کار کو حرز جان بنائے رکھے، تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ رنگ رلیوں میں کھو جائے۔

۱؎ روایت محترمہ کریم بی بی، ہمشیر اقبال

۲؎ آثار اقبال ص ۷۰

۳؎ اقبال کامل ص ۱۷

نادان نکتہ چیں اقبال اور عطیہ بیگم کے مابین تعلقات کو بطورِ خاص ہوا دیتے ہیں۔ وہ عطیہ کے نام اقبال کے خطوط کو بنیاد بنا کر عجیب و غریب اور مضحکہ خیز مفروضے تشکیل دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ تمام خطوط باصرہ نواز ہوں، تو ان میں کہیں عشق و محبت کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ دو ایک خطوط کے سوا، باقی تمام خطوط اقبال نے عطیہ بیگم کے خطوط کے جواب میں لکھے اور ان خطوط میں سیدھی سادی باتیں ہیں یا کہیں کہیں علمی نوشگافیاں، دلچسپ امر تو یہ ہے کہ "اقبال کی حیاتِ معاشقہ" کا راوی خود اعتراف کرتا ہے کہ: اقبال کے عطیہ بیگم کے نام خطوط Love Letter کا اچھا نمونہ نہیں ہیں، بلکہ محض رسمی اور خشک باتیں ہیں اور نہ ان میں ان کی والہانہ شیفتگی کا پتہ چلتا ہے[۱]۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعتراض کرنا کہ: یہ جاننے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ عطیہ بیگم کی کن خواہشات کا احترام اقبال نے نہیں کیا اور اگر اس خلا کو قیاس سے پُر کیا جائے، تو سب کھیل ہی کھیل نظر آئے گا[۲]۔ انتہائی درجے کا تعصب اور تنگ نظری ہے کہ اقبال کی جوانی کو مانندِ سحر بے داغ بھی سمجھا جائے اور ان پر معاشقے لڑانے کا الزام بھی دھرا جائے۔ حالانکہ "اقبال از عطیہ بیگم" سے علامہ اقبال کے اخلاق پر کسی قسم کا کوئی دھبہ ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی عطیہ بیگم نے ان پر کوئی الزام عائد کیا ہے، البتہ چند ایک مقامات پر عطیہ کے ریمارکس یہ چغلی کھاتے ہیں کہ وہ (عطیہ بیگم) علامہ اقبال کے ساتھ شادی کی خواہش مند تھیں، مگر شاعرِ مشرق نے کبھی اس کا نوٹس نہ لیا[۳] اور حکیم الامت کے اس خط سے جس میں عطیہ بیگم کی ان خواہشات کا ذکر ہے، جن کا احترام نہ ہو سکا، نادان نکتہ چینوں کی الزام تراشیاں ناقابلِ فہم ہیں۔ حقیقت پسند نقادوں کی رائے کے مطابق علامہ اقبال، عطیہ بیگم کو ایک علمی دوست کی حیثیت سے تو پسند کرتے تھے، لیکن بیوی کے روپ میں وہ ان کے لیے ناقابلِ قبول تھیں، کیونکہ وہ جس قسم کی بیوی کے خواہشمند تھے، وہ عطیہ بیگم سے مختلف تھی۔ عطیہ بیگم نے خود اور ان کے بہنوئی نواب آف جنجیرہ نے علامہ اقبال کو یورپ

۱، ۲ اقبال باکمال ص ۱۰۴

۳ اقبال درونِ خانہ ص ۱۳۹، ۱۴۰

سے واپسی پر فوراً اپنے ہاں آنے کی کئی بار دعوت دی، لیکن اقبال ہمیشہ ٹالتے رہے۔ بعد میں انہیں والدہ جاوید ایسی بیوی کی صورت میں اپنا آیڈیل مل گیا اور شاعر مشرق نے کافی عرصہ بعد ۱۹۳۱ء میں عطیہ بیگم کی دعوت کو شرفِ قبولیت بخشا اور بمبئی تشریف لے گئے۔

ان حالات میں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ علامہ اقبال کبھی بھی آزاد پریوں کی عشوہ طرازیوں کے دلدادہ نہ تھے اور نہ ہی وہ ان پری وشوں کی کمزوری سے لذت گیر ہونے کے قائل تھے۔ عطیہ بیگم و یگی ناسٹ اور شنی شیل جیسی عالم خواتین سے اقبال کے تعلقات محض علمی و ادبی استفادے کی حد تک ضرور تھے، لیکن ان سے یہ قیاس آرائی کرنا کہ اقبال رنگ رلیاں مناتے رہے۔ بالکل غلط ہے۔ اقبال کا عمل درحقیقت حرام چیزوں سے ان کی بے پناہ نفرت کی روشن دلیل ہے۔" وہ یورپ گئے تو عام ہندوستانی طلبہ کی طرح وہاں کے چار مخالف، خمر و خنزیر و روز نامہ وزن سے مرعوب نہ ہوئے، برخلاف اس کے ان پر ان کا برعکس اثر پڑا ایسے گویا قیام یورپ کے دوران انہوں نے ہر اس چیز سے پرہیز کیا، جو اسلام کی رو سے حرام تھی اس ضمن میں حضرت علامہ کے ایک قریبی دوست کا یہ قول کافی ہے۔

"اقبال اچھی شکل کو اچھی شکل ضرور کہتے تھے، لیکن عاشقی کے گنہگار کبھی نہ ہوئے"[۱]

اسی سلسلے میں پروفیسر جی سی چیٹرجی آئی ای ایس سابق صدر شعبہ فلسفہ، گورنمنٹ کالج لاہور نے اپنے ایک مضمون "ایک عظیم الشان شخصیت" میں لکھا، سب سے پہلے اور سب سے زیادہ میں ان کی غیر معمولی سادگی سے متاثر ہوا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اقبال عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں۔ ان کو ہمیشہ سادہ ترین لباس میں فرش پر بیٹھے ہوئے کسی

۱؎ اقبال کی پیش گوئیاں، ڈاکٹر ہاشمی ص ۱۱۸

۲؎ اسماء الرجال اقبال، ڈاکٹر تاثیر، مطبوعہ کریسنٹ مجلہ اسلامیہ کالج فروری تا اپریل ۱۹۵۱ء

کتاب کے مطالعہ میں مصروف یا کسی ہم فکر کے ساتھ گہری حکیمانہ بحث میں مشغول پاتا تھا۔ دوسری بات جو میں نے ان کے متعلق محسوس کی، یہ تھی کہ ایک ایسے وقت میں، جبکہ ہماری اجتماعی زندگی مکر و فریب اور خود غرضی کا شکار ہو رہی تھی، اقبال ذاتی مفاد سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور ان کی آرزوؤں اور خواہشوں کا واحد مرکز تمدّن اور روحانیت کی دنیا رہی[1]۔ یہ اظہار خیال حضرت علامہ اقبال پر رنگ رلیوں ایسا مذموم الزام عائد کرنے والے نادان نکتہ چینوں کی امیدوں پر پانی پھیرنے کے لیے کافی ہے۔

جہاں تک علامہ اقبال کے اخلاق و عادات کا تعلق ہے، اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خوش جمال ہی نہیں، خوش خصال بھی تھے، مگر انہوں نے اپنے دامن کو رنگ رلیوں ایسی پراگندیوں سے ہمیشہ دور رکھا۔ اگرچہ "ان کی شاعری، فلسفے اور سیاسی نظریات پر بکثرت اعتراضات کئے گئے ہیں، اس کے علاوہ صوفیوں کا ایک گروہ، جو مستقل طور پر ان کا مخالف تھا، وہ اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے ان پر سخت سے سخت اعتراض کر سکتا تھا، لیکن ہم نے ڈاکٹر صاحب پر جو مضامین دیکھے ہیں۔ ان میں کوئی مضمون ہماری نظر سے ایسا نہیں گزرا، جس میں ڈاکٹر صاحب کے اخلاق و عادات پر اعتراض کئے گئے ہوں[2]۔ اس سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اخلاقی حیثیت سے بھی حضرت علامہ اقبال کا دامن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک تھا۔

طوائف کا قتل

یورپ سے واپس وطن آنے کے بعد مذہبی رنگ اور بھی گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اقبال تہجد اور سحر خیزی تک کے پابند ہو گئے۔ اپنے ایک خط محررہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں بنام مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر رقمطراز ہیں۔ "صبح چار بجے، کبھی تین بجے اٹھتا ہوں۔ پھر

---

[1] اقبال نامہ، مرتبہ چراغ حسن حسرت ص ۹۲

[2] اقبال کامل، مولانا عبدالسلام ندوی ص ۷۰

اس کے بعد نہیں سوتا، سوائے اس کے کہ مصلّی پر کبھی اونگھ جاؤں۔[1] مقام افسوس ہے کہ تہجد گزار اقبال پر یہ شرانگیز اور بے سروپا الزام بھی لگایا گیا کہ ایام شباب میں انہوں نے ایک طوائف کو قتل کیا تھا۔ اقبال جیسے انسان سے، جس نے گھر اور مدرسے میں نیک والدین اور متقی و پرہیزگار استادوں کی صحبت پائی ہو، نیکی و بدی، شر و خیر اور برے بھلے کا فرق بچپن ہی میں ذہن نشین کر لیا ہو، یورپ میں رہ کر بھی اپنے دین کی قدروں کی حفاظت کی ہو، اس کے بارے میں یہ الزام لگانا کہ وہ قتل جیسے قبیح فعل کے مرتکب ہوئے تھے، خود اپنی گندی ذہنیت کا اعتراف کرنے کے مترادف ہے۔ یہ الزام ہمیشہ بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے اقبال پر ان کو بدنام کرنے کے لیے لگایا گیا کہ اس سے ان کی عالمی شہرت کو نقصان پہنچے اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی مفکر اسلام اور حکیم الامت حضرت علامہ کی ذات سے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوں اور ان لوگوں کی توجہ ان کے مقدس فن، اور قومی خدمات سے ہٹا کر، ان کی ذات کے ایسے واقعات کی طرف مبذول کرا دی جائے کہ عام و خاص کو آزادی پاکستان کے قافلہ کے پیشرو سے نفرت ہو جائے۔

حضرت علامہ اقبال کے خاندان کے سب ہی افراد، حکیم الامت کے شیدائی اور شاعر مشرق سے بدترین سے بدترین دشمن بھی اس الزام کو کذب بیانی اور دشنام طرازی پر محمول کرتے ہیں۔ جس طوائف کے قتل کا الزام حضرت علامہ پر عائد کیا جاتا ہے، "در اصل وہ خاتون طوائف نہیں تھیں، بلکہ کشمیر کے کسی اچھے ہندو گھرانے سے تھیں، جنہیں اغوا کر کے اس بازار میں پہنچا دیا گیا تھا۔"[2] اقبال کی برادر زادی کا بیان ہے یہ ۱۹۱۵ء کا ذکر ہے۔

ہمارے ایک پھوپھی زاد بھائی، جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں، چچا جان (علامہ صاحب) کے پاس لاہور میں رہتے تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات میں حسب معمول چچا جان اہل خانہ کے

---

[1] شاد۔ اقبال ص ۱۹

[2] اقبال درون خانہ ص ۱۴۴

ہمراہ سیالکوٹ تشریف لے آئے اور لاہور والے مکان پر ان کے بھانجے اکیلے رہ گئے۔ ان ہی دنوں ہمارے ان پھوپھی زاد بھائی کو بازار حسن جانے کا چسکا پڑا اور وہاں کی ایک طوائف کی التجاؤں سے متاثر ہو کر اسے گناہ آلود زندگی سے نجات دلائی اور گھر لا کر نکاح پڑھوا لیا۔ اس عورت کے لواحقین نے بڑا طوفان اٹھایا اور آخر معاملہ پولیس تک پہنچا، لیکن عورت کے بیان سے فیصلہ ہمارے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں ہوا۔ تعطیلات کے اختتام پر چچا جان جب واپس لاہور پہنچے تو گھر پر ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ اپنے بھانجے سے دریافت کیا تو انہوں نے تمام واقعہ بتا دیا۔ مگر چچا جان کو "تاب کہاں! بہت برہم ہوئے اور اسی وقت ہمارے پھوپھی زاد بھائی کو ان کی بیوی سمیت گھر سے چلے جانے کا حکم سنا دیا اور پھر تمام زندگی ان کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ ہوئے[1] بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو ایک بیکس اور مجبور عورت کو جسے سماج نے اس بازار کی زینت بنا دیا تھا، شمع محفل بنانے کی بجائے چراغ خانہ بنا لینا کوئی جرم نہ تھا، لیکن اقبال ایسے صوفی منش، اصول پرست اور پاکیزہ مزاج انسان یہ برداشت نہ کر سکے اور اپنے پھوپھی زاد بھائی کو بیوی سمیت نہ صرف گھر سے نکال دیا، بلکہ مرتے دم تک اس سے دوبارہ تعلق نہ جوڑا۔ اقبال کے پھوپھی زاد بھائی کی بھی وہ بیوی تھی، جو آخری وقت تک اپنے شوہر کی تابع فرمان اور وفا شعار رہی اور نادان نکتہ چینوں نے اپنی مقصد براری کے لیے اسے نہ صرف طوائف رہنے دیا، بلکہ اس کے قتل کا الزام بھی شاعر مشرق کے سر تھوپ دیا اور اس درجے پر کی اڑائی کہ: اس کو اقبال کی کمزوری کہیے یا جرأت رندانہ کی کمی کہ انہوں نے اپنی ان خطاؤں کو داد طلب سمجھنے کی جگہ ان کی ایسی تاویل کی، جس کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا[2]۔ یہ حاشیہ آرائی تعمیری نہیں، تخریبی تنقید کی غمازی کرتی ہے۔

ترجمان حقیقت پر جھوٹ کا بہتان لگانا کم علمی کی دلیل ہے کیونکہ حضرت علامہ کی

---

[1] روایت محترمہ وسیمہ مبارک / ایضاً ص ۵۰۴

[2] اقبال باکمال، عظیم فیروز آبادی ص ۹۸

طالب علمی کے زمانے کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک "مولانا" جو عالم دین ہونے کے دعویدار بھی تھے، دروغ گوئی کے مرتکب ہوئے تو علامہ اقبال بڑے بددل ہوئے اور کئی روز تک بے کیف اور بے چین رہے[۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود جھوٹ بولنا تو درکنار، اقبال دوسروں کی زبانی جھوٹ سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے حیرت کی بات ہے کہ طوائف کے "قتل جیسے بھیانک جرم کا اقبال کے خاندان کے کسی فرد کو علم ہو اور نہ اس قتل کی کوئی خبر اخبار میں شائع ہوئی ہو اور نہ اس کا کسی تھانے یا پولیس چوکی میں اندراج ہو، پھر ان نادان نکتہ چینوں کو کیسے معلوم ہو گیا۔ کسی شاعر نے شاید ان ہی کے بارے میں کہا ہے ؎

یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

اقبال کی نیک نامی کے ساتھ ساتھ ان کی صاف گوئی بھی مسلّمہ ہے۔ زندگی بھر طوائف کا قتل تو درکنار، طوائف کا لفظ بھی اقبال کی زبان پر نہ آیا۔ اور "یہ ڈاکٹر صاحب کی بے ریائی اور نیک نفسی ہے کہ انہوں نے اپنے ان اخلاق کو بھی بہ تصریح بیان کر دیا ہے، جو قابلِ اعتراض سمجھے جاتے ہیں[۲] لیکن ان میں بھی کہیں کسی طوائف سے متعلق داستان کا سراغ نہیں ملتا۔ اب اگر ان کی ان نظموں اور غزلوں کو جو یورپ میں قیام کے دوران کہی گئیں، بنیاد بنا کر اقبال پر عشق بازی، مے نوشی اور طوائف کے قتل کی تہمتیں لگائی جائیں، تو یہ بالغ نظری نہیں، بلکہ طفلانہ حرکتیں ہیں۔ اقبال تو اعلیٰ پایہ کے حقیقت نگار، سخنور تھے۔ ان کی روح اسی اعلیٰ درجے کی حساس اور حسن شناس تھی کہ ؎

جستجو کل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں ہے، درد لا دوا رکھتا ہوں میں

"اس لیے اگر انہوں نے کسی مقام پر کسی کے حسن دل آویز کی سحر کاریوں کے لطیف تاثر کو نشاط انگیز لہجے اور حسین پیرائے میں بیان کیا ہے، تو اس سے یہ خیال آرائی کرنا

---

[۱] سیرت اقبال ص ۳۱

[۲] اقبال کامل ص ۷۰

کہ وہ بقول سالک "رنگ رلیوں" میں مشغول رہا کرتے تھے اور بقول عظیم فیروز آبادی عشق و محبت کے کھیل کھیلا کرتے تھے، حد درجہ افسوسناک ہے[1]۔ جو نادان نکتہ چین، اقبال کی رومانی نظموں اور غزلوں کی من مانی تشریحات کر کے اقبال کو مے نوش، عاشق مزاج اور طوائف کا قائل تک کہنے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کے لیے ایک فاضل نقاد کی یہ رائے ملحوظ رکھنی ہے کہ: علامہ کو انسان سے عشق ہو ہی نہیں سکتا، ان کا عشق خدا سے تھا یا پیغمبر سے[2]۔ اور "اقبال کا عشق حیات و کائنات کی ایک اساسی اور نفسیاتی کیفیت ہے، یہ حیات علی الاطلاق کا عشق ہے، جو افراد واشیا سب پہ پھیلا ہوا ہے، لیکن کوئی ایک فرد اس کا مرکز یا مطمح نظر نہیں، اس کا عشق فرد سے گزر کر ملت کا عشق بن جاتا ہے، اس کے بعد وہ تمام نوع انسانی پہ بلا امتیاز مذہب وملت پھیل جاتا ہے، آخر میں تمام حیات و کائنات اس میں غرق ہو جاتی ہے[3]۔" خلیفہ عبدالحکیم کے نزدیک "اقبال عشق مجازی کا شاعر نہ تھا، لیکن محض مشق سخن کے طور پہ مصنوعی عاشقی کی کچھ غزلیں اقبال نے کہیں[4]۔" گویا اقبال ہی تھے جنھوں نے عشق کو مجاز کی پر پیچ اور ناہموار راہوں سے نجات دلا کر عشق حقیقی کے صراط مستقیم پہ چلنا سکھایا۔

اقبال کے نادان نکتہ چینوں کی بعض موشگافیاں تو لطائف کا مزہ دیتی ہیں اور تفنن طبع کا باعث بنتی ہیں۔ ان موشگافیوں سے ایک طرف تو نادان نکتہ چینوں کی حماقتوں پہ ہنسی آتی ہے اور دوسری طرف ایک ایسی منظم منصوبہ بندی یا سازش کا پتہ چلتا ہے، جو حکیم الامت علامہ اقبال کی ذات بابرکات کو متنازعہ فیہ یا داغدار بنانے کے لیے کی گئی اور جس کی کونپلیں کبھی کبھی "موسم خزاں" میں پھوٹتی رہتی ہیں مثلاً ایک نادان نکتہ چین کو اعتراض ہے کہ اقبال نے تین شادیاں کیں اور وہ "بوالہوس" تھے۔ شاید یہ نکتہ چین اتنا بھی نہیں جانتے کہ اسلام میں بیک وقت

---

[1] اقبال درون خانہ ص ۱۴۷

[2] حیات اقبال کا ایک جذباتی دور ص ۱۳۷

[3] فکر اقبال، خلیفہ عبدالحکیم ص ۳۸۵

[4] ایضاً ص ۱۸

چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ یہی نکتہ چین اپنی "عالمانہ اور محققانہ تصنیف" میں یہ سنسنی خیز انکشاف بھی فرماتے ہیں، "چونکہ تحریرات اقبال میں خورشید کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اس لیے علامہ اقبال کی کوئی محبوبہ خورشید نامی ضرور رہی ہو گی[1]۔ یہ انکشاف، نادان نکتہ چینوں کو دعوت فکر دیتا ہے ممکن یہ نکتہ چین کلام اقبال میں آئندہ چل کر "لالہ" اور "شاہین" کے اشارات اور علامات سے صحرا کی کسی 'لالہ رُخ' یا گلشن کی کسی شاہینہ بیگم کا بھی سراغ لگانے لگیں اور پھر ثابت کریں کہ اقبال عاشق مزاج تھے، رنگ رلیاں منانے تھے اور ممکن ہے کہ انہوں نے کسی طوائف کو قتل کیا ہی ہو۔ جو نکتہ چین ایسی موشگافیوں کے قائل ہوں، ان کے لیے اقبال کی یہ تحریر کافی ہے جو انہوں نے ایک مکتوب کی صورت میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کو لکھی، علامہ فرماتے ہیں۔

"انشاء اللہ کل صبح کی نماز کے بعد دعا کروں گا۔ کل رمضان کا چاند یہاں دکھائی دیا۔ آج رمضان المبارک کی پہلی ہے۔ بندہ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لئے اٹھتا ہے، سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی دعا کروں گا۔ اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے، کیا عجب کہ دعا قبول ہو جائے[2]۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی کا اکثر حصہ لا ابالی پن میں گزرا اور وفات سے صرف پانچ سات سال قبل ہی فرائض مذہبی کی تکمیل کا جوش پیدا ہوا تھا، لیکن شاد و اقبال مکاتیب سے پتہ چلتا ہے کہ وفات سے بیس سال قبل ہی اقبال صوم و صلوٰۃ اور تہجد کے پابند ہو چکے تھے۔ زہد و ریاضت کا حال یہ تھا کہ ایک دفعہ پورے دو مہینے رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے رہے اور ان دنوں کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا۔ صرف شام کو تھوڑا سا دودھ پی لیا کرتے تھے[3]۔ ان حالات و واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے ذہن پر اسلامی قدروں کے جو نقوش

---

[1] کلام اقبال کا بے لاگ تجزیہ، آسی ضیائی ص ۵۹

[2] شاد اقبال ص ۸۵

[3] حیات اقبال ص ۳۶

بچپن ہی میں ثبت ہو گئے، وہ دم آخر تک محو نہ ہو سکے۔ انہوں نے کالج کے زمانہ میں اور یورپ کی رنگینیوں میں بھی دین حنیف کی اقدار اور مذہب کی سادگی اور شریعت کی پابندی کو نہ چھوڑا اور وطن واپس آنے کے بعد جیسا کہ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے، وہ نماز، روزہ اور تہجد کے پابند ہو گئے تھے، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انہوں نے کسی طوائف کو قتل کیا ہو!

اقبال، قادیانی تھے؟

مے نوشی، رنگ رلیاں اور طوائف کا قتل، دراصل اس نوع کے تمام بے سروپا اور فرسودہ الزامات تراشنے میں ایک مخصوص مذہبی فرقے کے افراد کا ہاتھ کارفرما رہا ہے اور یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوئی، جب اقبال نے قادیانیوں کے خلاف کھل کر اپنے نظریات اور عقیدے کا اظہار کیا۔ برصغیر پاک و ہند میں اقبال ہی وہ اولین رہنما تھے، جنہوں نے سب سے پہلے قادیانیوں اور مرزائیوں کے مذموم ارادوں کو بے نقاب کیا اور برملا کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار مذہب کی آڑ میں مسلمانوں میں انتشار پھیلا رہے ہیں، ان کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور انہیں جتنی جلد ممکن ہو، غیر مسلم اقلیت قرار دے دینا چاہیئے اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں مولانا ظفر علی خاں اور مجلس احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک کا آغاز کیا، صوبے کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے عالیشان جلسے منعقد ہوئے، جلوس نکالے گئے، اخباروں نے بالخصوص 'زمیندار' نے اپنے صفحوں کے صفحے احمدیت کی مخالفت میں سیاہ کر دیئے۔ عامۃ المسلمین کا قول یہ تھا کہ حضورؐ کے بعد مدعی نبوت کافر مطلق ہے اور جو لوگ حضور صلعم کے بعد کسی کو نبی مانتے ہیں۔ وہ رسالت محمدیہ صلعم کے منکر ہیں۔ لہذا ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں کو مسلمانوں کی فہرست رائے دہندگان سے حذف کر دیا جائے اور ان کو ہندوؤں، اچھوتوں اور عیسائیوں کی طرح ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے[1] سالک مرحوم نے مزید لکھا ہے۔ خدا جانے علامہ اقبال نے کسی

---

[1] ذکر اقبال ص ۲۱۰

عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا، جس میں بتایا کہ اس فرقے کی بنیاد ہی غلطی پر ہے اس کے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کئے اور آخر میں حکومت کو مشورہ دیا کہ اس فرقے کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے۔ "سن رائز" اور "لائٹ" انگریزی کے دو ہفتہ وار پرچے احمدیوں کے زیر ادارت نکلتے تھے۔ انہوں نے کچھ لکھا تو علامہ نے ان کا بھی جواب دیا۔ پھر سٹیٹسمین مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۳۵ء میں اس مسئلے کے متعلق ایک مفصل جوابی مضمون لکھا۔[1]

یہ انداز بیان کہ علامہ اقبال نے "خدا جانے کس عقیدت مند کی درخواست پر" احمدیت کے خلاف بیان دیا اور مضامین لکھے، یہ شک ظاہر کرتا ہے کہ خدانخواستہ حضرت علامہ اقبال بھی قادیانی تھے۔ بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، بلکہ سالک ایسے مصنف و مورخ نے علامہ پر یہ تہمت لگا کر کسی عقیدت مند کی درخواست پر انہوں نے ایسا کیا، خود مصنف و مورخ کے بارے میں یہ شک و شبہ ظاہر کرتا ہے کہ ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بعض معتبر اصحاب، مولانا عبدالمجید سالک پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ خود احمدیت کے طرفداروں میں سے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ انہیں اپنے اس ممدوح کی یہ ادا پسند نہ آئی ہو۔ لیکن علامہ جیسے صحیح العقیدہ مسلمان اور سچے عاشق رسول سے یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ کھل کر اپنے عقیدے کا اظہار کریں۔ اس زمانے ہی میں دراصل یہ چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں کہ اقبال قادیانی ہیں۔ یہ شوشہ بھی احمدیوں کی طرف سے چھوڑا گیا، کیونکہ قادیانی ایک مدت سے علامہ کی شخصیت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ علامہ کے نظریات ان کے بارے میں بڑے واضح تھے۔ انہوں نے احمدیت کا بڑی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا اور ان کے سیاسی عزائم کو بھی بھانپتے رہے اسی لیے انہوں نے جون ۱۹۳۵ء میں احمدیوں کے خلاف اپنے نظریات کا دو ٹوک اعلان کر کے ان نادان نکتہ چینوں کی امیدوں پہ بھی پانی پھیر دیا، جو اسی فرقے کی آڑ لے کر حضرت علامہ اقبال کو عامۃ المسلمین کی اکثریت کی نظروں سے گرانا چاہتے تھے مگر

---

[1] ذکر اقبال ص ۲۱۰

جب علامہ نے احمدیوں ہی کو رنگے ہاتھوں لیا اور مطالبہ لیا کہ اس فرقے کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو احمدیوں ہی نے علامہ کے خلاف ان کے قادیانی ہونے کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا اور نہ صرف حضرت علامہ کے دین حنیف پر کاری وار کیا، بلکہ ان پر مے نوشی، رنگ رلیاں منانے اور طوائف کو قتل کرنے کے علاوہ اور نہ جانے کیا کیا الزامات لگا ڈالے۔

اقبال کے ذہن میں مسئلہ ختم نبوت بہت واضح تھا، انہوں نے جب قادیانی تحریک کے خلاف بیان دیا تو اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے اعتراضات شائع ہوئے۔ ان اعتراضات کی روشنی میں اقبال نے اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی اور سید نذیر نیازی[1] کے نام دو خط لکھے۔ ان ہی خطوط کو بمعہ عکس "انوار اقبال" میں ممتاز حسن صاحب نے شامل اشاعت کیا، مگر افسوس کہ اس میں بھی انہوں نے قصداً یا سہواً اقبال کے نظریۂ ختم نبوت کو مزید الجھا دیا، کیونکہ اصل خطوط، جو اسی کتاب میں شامل کئے گئے ہیں، ان میں اقبال نے واضح طور پر لکھا ہے کہ حضور کو خاتم النبیین نہ ماننے والا کاذب ہے اور واجب القتل۔ مگر ان خطوط سے اصل متن لکھتے ہوئے یہ عبارات حذف کر دی گئیں[2]۔ اب ان خطوط کا متن ملاحظہ ہو:

"راجہ صاحب[3] کا مضمون میں نے نہیں دیکھا۔ دیکھا تو تھا، پڑھا نہیں۔ آپ اپنے مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔ ان کے خیالات کی تردید ضروری نہیں۔

نبوت کے دو اجزا ہیں (۱) خاص حالات و واردات جن کے اعتبار سے نبوت روحانیت کا ایک مقام خاص تصور کی جاتی ہے (مقام تصوف اسلام میں ایک اصطلاح ہے)

(۲) ایک Socio-Political Institution قائم کرنے کا عمل یا اس کا قیام۔ اس Institution کا قیام گو ایک نئی اخلاقی فضا

---

[1] آپ ان دنوں طلوع اسلام کے مدیر تھے۔

[2] انوار اقبال ص ۴۴ عکسی خطوط

[3] غالباً راجہ حسن اختر

کی تخلیق ہے، جس میں پرورش پا کر فرد اپنے کمالات تک پہنچتا ہے اور جو فرد اس نظام کا ممبر نہ ہو یا اس کا انکار کرے، وہ ان کمالات سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس محرومی کو مذہبی اصطلاح میں کفر کہتے ہیں۔ گویا اس دوسری جزو کے اعتبار سے نبی کا منکر کافر ہے۔

دونوں اجزا موجود ہوں تو نبوت ہے صرف پہلا جزو موجود ہو، تو تصوف اسلام میں اس کو نبوت نہیں کہتے۔ اس کا نام ولایت ہے۔ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں۔ یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے، تو وہ شخص کاذب ہے [اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا، حالانکہ طبری لکھتا ہے کہ وہ حضور رسالت مآبؐ کے نبوت کا مصدق تھا اور اس کی اذان میں حضور رسالت مآبؐ کی نبوت کی تصدیق تھی]لے

لیڈنگ سٹرنگز Leading string سے مراد لیڈنگ سٹرنگز آف ریلجن نہیں بلکہ لیڈنگ سٹرنگز آف نیوچر۔ پرانٹس آف اسلام ہے، یا یوں کہیے کہ ایک کامل الہام و وحی کی غلامی قبول کر لینے کے بعد کسی اور الہام و وحی کی غلامی حرام ہے۔ بڑا اچھا سودا ہے کہ ایک کی غلامی سے باقی سب غلامیوں سے نجات ہو جائے اور لطف یہ کہ نبی آخر الزمانؐ کی غلامی، غلامی نہیں، بلکہ آزادی ہے، کیونکہ اس کی نبوت کے احکام دینِ فطرت ہیں، یعنی فطرت صحیحہ، ان کو خود بخود قبول کرتی ہے۔ فطرت صحیحہ کا انہیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس واسطے عین فطرت ہے، ایسے احکام نہیں۔ جن کو ایک مطلق العنان حکومت

لے انوار اقبال سے یہ عبارت حذف کر دی گئی ہے۔

نے ہم پہ عائد کر دیا ہے اور جن پہ ہم محض خوف سے عمل کرنے پہ مجبور رہوں۔
اسلام کو دین فطرت کے طور پر Realise کرنے کا نام تصوف
ہے اور ایک اخلاص مند مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس کیفیت کو اپنے
اندر پیدا کرے۔ اس کیفیت کو میں نے Camancipation
سے تعبیر کیا ہے[1]"

اپنے دوسرے خط میں اقبال یوں رقمطراز ہیں (۱) عقل اور وحی کا مقابلہ یہ فرض کر کے کہ دونوں علوم کے مواخذ ہیں، درست نہیں ہے۔ علوم کے مواخذ انسان کے حواس اندرونی اور بیرونی ہیں۔ عقل ان حواس ظاہری و معنوی کے انکشاف کی تنقید کرتی ہے اور یہی تنقید اس کا حقیقی Function ہے اور بس۔ مثلاً آفتاب مشرق سے طلوع کرتا ہے اور مغرب کی طرف حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، یہ حواس ظاہری کا انکشاف ہے۔ عقل کی تنقید کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حواس کا انکشاف درست نہ تھا۔

(۲) وحی کا Function حقائق کا انکشاف ہے یا یوں کہیے کہ وحی تھوڑے وقت میں ایسے حقائق کا انکشاف کر دیتی ہے، جن کا مشاہدہ برسوں میں بھی نہیں کر سکتا، گویا وحی حصول علم میں جو Time کا عنصر ہے اس کو خارج کرنے کی ایک ترکیب ہے۔ انسان کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں اس ذریعہ علم کی بے انتہا ضرورت تھی، کیونکہ ان مراحل میں انسان کو ان مقامات کے لیے تیار کیا جا رہا تھا، جن پہ پہنچ کر وہ قوائے عقلیہ کی تنقید سے خود اپنی محنت سے علم حاصل کرے۔ محمد عربی کی پیدائش انسانی ارتقاء کے اس مرحلے پہ ہوئی، جب کہ انسان کو استقرائی علم سے روشناس کرنا مقصود تھا۔ میرے عقیدہ کی رو سے بعد وحی محمدی کے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے، سلسلہ تو الہام کا جاری ہے مگر الہام بعد وحی محمدی حجت نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہر شخص کے لیے جس کو الہام ہوا ہو۔ بالفاظ دیگر بعد وحی محمدی الہام ایک پرائیویٹ Fact ہے اس کا کوئی سوشل مفہوم یا وقعت نہیں

---

[1] ماہنامہ طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۳۵ء ص ۱۰۲ - ۱۰۳

ہے۔ میں نے آپ کے خط میں لکھا تھا کہ نبوّت کی دوسری حیثیت ایک Socio-political Institution کی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ بعد وحی محمدی کسی کا الہام یا وحی ایسے Institution کی بنا پر قرار نہیں پا سکتا۔ تمام صوفیہ اسلام کا بھی مذہب ہے۔ محی الدین ابن عربی تو الہام پانے والے کو نبی کہتے ہی نہیں، اس کا نام ولی رکھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام سے پہلے بنی نوع انسان میں شعور ذات کی تکمیل نہ ہوئی تھی۔ اسلام نے انسان کی توجہ علوم استقرائی کی طرف مبذول کی تاکہ انسانی فطرت فی کل الوجود کامل ہو اور اپنی ذاتی محنت سے حاصل کردہ علم کے ذریعے انسان میں اعتماد علی النفس پیدا ہو۔ غرضیکہ بعد وحی محمدی میرے عقیدہ کی رو سے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ جس شخص کو ہوتا ہے، اس کے لیے حجت ہو تو ہو، اوروں کے لیے نہیں ہے۔ اگر آج کوئی شخص کہے کہ میں نے بالمشافہ حضور رسالت مآبؐ سے مل کر دریافت کیا ہے کہ فلاں ارشاد جو محدثین آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں، آپ کا ہے یا نہیں اور مجھے حضورؐ نے کہا ہے کہ نہیں تو ایسا مکاشفہ اس شخص کے لیے حجت ہوگا۔ عالم اسلام کے لیے نہیں۔ اگر اس قسم کے مکاشفات کو تمام عالم اسلام کے لیے حجت قرار دیا جائے تو تمام تنقیدی تاریخ کا خاتمہ ہو جاتا ہے یا بالفاظ دیگر روایت و درایت و استقراء کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شعر[1] میں لفظ حیا (شرم) ہے[2]۔

اقبال کی بیشتر تحریریں بیانات اور ان کا کلام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ حضورؐ کی ختم نبوّت کے صدق دل سے خواہاں تھے اور حضورؐ کو نبی آخرالزماں نہ ماننے والوں کو

---

[1] اشارہ اس طرف ہے کہ اقبال نے نبوت کے متعلق جو تحریریں بھیجیں تو اسی کاغذ پر ایک طرف "مرتبت اسلام" کے نام سے ایک نظم بھی لکھ بھیجی، جو طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی اس کا ایک مصرعہ تھا۔ "نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بیزاری" اس مصرعہ میں شاید لفظ حیا پڑھا نہیں گیا تھا۔ یہ نظم بعد میں ضرب کلیم ص ۵۴ پر شائع ہوئی (حاشیہ انوار اقبال ص ۴۰)

[2] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۳۵ء ص ۱۰۲-۱۰۴

کاذب اور واجب القتل سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اگر وہ خود قادیانی ہوتے، تو ہرگز یہ مطالبہ نہ کرتے یہ ان کے اسی مطالبہ کا رد عمل تھا کہ احمدیوں نے اقبال کی ذات پر طرح طرح کے الزامات لگانے شروع کر دیئے اب وقت کے ساتھ ساتھ یہ الزامات خود بخود غلط ثابت ہو رہے ہیں۔

مرقعِ اقبال

باپ کا خواب

اقبال کی پیدائش سے چند روز پہلے میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ فضا میں رنگا رنگ پروں والا ایک نہایت ہی خوبصورت پرندہ اڑ رہا ہے۔ اس کی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اٹھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ اس ہجوم میں، میں بھی ہوں۔ وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا۔ آخر ایک دم فضا سے اترا اور خود بخود میرے دامن میں آگرا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ کچھ روز بعد میرے ہاں اقبال پیدا ہوا۔ میں نے اس خواب کی تعبیر یہ کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے اور خدمت اسلام میں اپنا نام پیدا کرے گا۔ (شیخ نور محمد)

فیضِ تربیت

علامہ اقبال میں علم و عرفان اور فکر و عمل کی بہت سی خوبیاں جمع تھیں اور یہ محض حسن اتفاق نہ تھا۔ بلکہ اس میں علامہ کے صالح اور متقی والدین کی ابتدائی تعلیم و تربیت کو بھی بہت دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اقبال کے ذاتی حالات کا ذکر چھڑتا ہے ان کے والدین کی محبت کا تذکرہ بھی یقینی ہوتا ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ کے انتقال پر لسان العصر اکبر الہ آبادی نے جو اشعار کہے۔ ان سے بھی اس حقیقت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ان اشعار میں غم و الم اور سوز و گداز کے علاوہ علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کے درمیان منصفانہ تعلقات کا تاثر بھی ملتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؂

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی، یہ خوش گوئی، یہ ذوق معرفت
یہ طریق دوستی، خودداری با تمکنت!
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے، اہل دل تھے، صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انہیں کا ہے یہ فیض تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبع عالی منزلت!
مادر مرحومۂ اقبال جنت کو گئیں!
چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہ گیں
روکنا مشکل ہے، آہ و زاری و فریاد کو
نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبرؔ اس غم میں شریک حضرتِ اقبالؔ ہے
سال رحلت کا یہاں منظور اُسے فی الحال ہے
واقعیٔ مخدومۂ ملت تھیں وہ نیکو صفات
"رحلت مخدومہ" سے پیدا ہے تاریخ وفات

۱۳۳۲ھ

والد بزرگوار کے انداز تربیت کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ سفر کابل سے واپسی میں قندھار کا ریگستانی میدان طے ہو چکا تھا اور سندھ اور بلوچستان کی پہاڑیوں پر ہماری موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ شام کا وقت تھا۔ ہم دونوں ایک ہی موٹر میں بیٹھے تھے روحانیت پہ بات چیت ہو رہی تھی۔ ارباب دل کا تذکرہ تھا کہ موصوف نے بڑے تاثر کے ساتھ اپنی ابتدائی زندگی کے دو واقعے بیان کیے۔ فرمایا۔ جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ کلام پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف

سے فرصت پاکر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گزرے تو مسکرا کر فرمایا کہ کبھی فرصت ملی، تو میں تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ اصرار کیا تو فرمایا کہ جب امتحان دے لو گے تب۔ جب پاس ہو گیا، تو پوچھنے پر فرمایا: بتاؤں گا۔

ایک دن صبح سویرے میں حسب دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آگئے اور فرمایا "بیٹا کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے ـــ ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں کہ ان کا یہ فقرہ میرے دل میں اتر گیا اور اس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔

اور دوسرا واقعہ یہ ہے کہ باپ نے ایک دن بیٹے سے کہا کہ میں نے تمہیں پڑھانے سکھانے میں جو محنت کی ہے، اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ لائق بیٹے نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ باپ نے کہا کسی اور موقع پر بتاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ بیٹا! میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔ بات ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ اس کے بعد میں نے امتحان وغیرہ دے کر اور کامیاب ہو کر لاہور میں کام شروع کیا ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا ہوا۔ ترانہ ملی اور دوسری نظمیں لکھیں اور لوگوں نے ان کو ذوق شوق سے پڑھا اور سنا اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا تو ان ہی دنوں میں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ میں ان کو دیکھنے لاہور سے جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں؟ باپ نے شہادت دی کہ جانِ من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔

(سید سلیمان ندوی)

استاد اور شاگرد

حافظ میر حسن نے اقبال کو اقبال بنانے کے لیے جس قدر محنت کی، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ انہوں نے اقبال کو مشرقی اور مغربی علوم کی بھٹی سے کندن بنا کر نکالا۔ اللہ

مکتب میں اپنے ہونہار شاگرد کو عام طلبہ کے ساتھ لیکچر دینے کے علاوہ رات کو بلا ناغہ انہیں پڑھایا کرتے تھے۔ میر حسن ریاضیات ادبیات، نفسیات اور فلسفے کے اعلیٰ استاد تھے اور انہوں نے اقبال ایسے شاگرد کو ان تمام علوم میں پوری طرح ماہر کر دیا۔

عالی مرتبت استاد اور ہونہار و فرمانبردار شاگرد کے آپس کے تعلقات خاصے دوستانہ تھے اور حافظ صاحب نے کبھی اقبال میں مکتب یا گھر کے تعلیمی ماحول میں بدمزگی کا احساس پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ علامہ اقبال بھی شہرت اور تعلیم کے بام عروج تک پہنچنے کے باوجود اپنے عالی مرتبت ، استاد کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ جب بھی کبھی حضرت شاہ صاحب ان کی مجلس میں جاتے تو وہ اٹھ کھڑے ہوتے اور استاد کی موجودگی میں کرسی پر نہ بیٹھتے۔ علامہ اقبال نے اسی ادب و احترام کے تحت بڑے واضح انداز میں کہا کہ ؎

مجھے اقبالؔ اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

(مرزا جلال الدین)

وکالت کا پیشہ

علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد بلوچستان میں اوورسیئر تھے اور فن تعمیر میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ ایک سازش کا شکار ہوئے۔ ان کے دو غیر مسلم ساتھیوں نے ایک انگریز افسر سے مل کر سازباز کی۔ یہاں تک کہ ان کے خلاف ایک فوجداری مقدمہ کھڑا کر دیا۔ شیخ صاحب کو اندیشہ تھا کہ ان کے مخالف افسر عدالت اور گواہوں کو متاثر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسی لیے شیخ صاحب نے اس بات کی تگ و دو کی کہ مقدمہ کسی دوسری عدالت میں منتقل ہو جائے یا ان ایک دو عہدیداروں کا تبادلہ کر دیا جائے، مگر بلوچستان پولیٹیکل ایجنسی کے کرتا دھرتا، ان میں سے کسی ایک مطالبہ پہ رضامند نہ ہوئے۔ مجبور ہو کر علامہ اقبال نے وائسرائے ہند کو تمام حالات سے مطلع کیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب

اقبال کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ سرکاری حلقوں میں ان کی رسائی تھی نہ کوئی اثر ورسوخ ان کی شاعرانہ شہرت پر ابھی شباب بھی نہیں آیا تھا لیکن علامہ اقبال کا خط اس قدر مناثر تھا کہ وائسرائے ہند نے انگریز سرکار کے انصاف کی ساکھ برقرار رکھنے کی خاطر شیخ عطا محمد سے جھگڑا کرنے والے افسروں کا تبادلہ کر دیا، جس سے وہ مقدمہ بھی بے جان اور کمزور پڑ گیا۔ علامہ اقبال نے ۶ راگست ۱۹۰۲ء کو نواب صدر یار جنگ بہادر کو جو خط لکھا، اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ موجود ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"میرے بڑے بھائی جان بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل افسر ملٹری ورکس تھے۔ ان کے مخالفین نے ایک خوفناک فوجداری مقدمہ بنا دیا تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ دشمنوں کے منہ میں خاک پڑی.... بلوچستان ایجنسی والے تو ہمارے ساتھ نا انصافی کرنے پر آمادہ تھے۔ مگر خدا لارڈ کرزن کا بھلا کرے کہ میرے لکھنے پر معاملہ دگرگوں ہو گیا۔"

علامہ اقبال کی دعائیہ نظم "برگِ گل" کے اس شعر

کیا کروں اوروں کا شکوہ اے امیر ملکِ فقر
دشمنی میں بڑھ گئے اہلِ وطن اغیار سے

میں دشمنوں کی اس سازش کی طرف اشارہ ہے، جس میں علامہ کے بڑے بھائی کے خلاف محکمے کے دو غیر مسلم عہدیدار خاص طور سے شریک تھے۔ یہ نظم علامہ اقبال نے اسی اضطراب کے عالم میں کہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سن لی۔ شیخ عطا محمد باعزت طور پر بری ہو گئے۔ عدالت کے فیصلہ بریت کے علاوہ محکمہ نے ان کی سروس بک میں یہ ریمارکس دیئے۔

Not Qualily

Free of susPicion

اس مقدمے کے بعد علامہ اقبال نے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

(شیخ اعجاز احمد)

والہانہ استقبال

انگلستان سے واپسی پر ۱۹۰۸ء میں علامہ اقبال سیالکوٹ تشریف لائے تو ریلوے سٹیشن پر عقیدت مندوں کا ایک جم غفیر تھا۔ استقبال کے لیے آنے والوں میں آغا باقر خاں بھی تھے، جو آنریری مجسٹریٹ تھے اور ان کا شمار رؤسائے سیالکوٹ میں ہوتا تھا۔ انہوں نے استقبال کا انتظام و انصرام بڑے سلیقے کے ساتھ کیا تھا علامہ اقبال کی یہ غزل ع

لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھالی ہے

جس کا مقطع یہ ہے ؎

گل مضمون سے اے اقبال یہ سہرا ہے ناصر کا
غزل میری غزل کیا ہے، کسی گلچیں کی جھولی ہے

اس میں جس ناصر کے سہرے کا ذکر ہے، وہ ان ہی آغا صاحب کے فرزند تھے۔ علامہ اقبال جس وقت سیالکوٹ ریلوے سٹیشن پر پہنچے، تو پلیٹ فارم پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ لوگوں نے اقبال کو پھولوں کے ہار اتنی کثیر تعداد میں پہنائے کہ علامہ کا چہرہ پھولوں میں چھپ کر رہ گیا۔ پھر علامہ اقبال کو شہریوں کی طرف سے ٹاؤن ہال میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ سیالکوٹ میں ایک صاحب منشی میراں بخش تھے۔ ان کا تخلص جلوہ تھا۔ عدالت میں اپیل نویس تھے اور انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں بھی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے اس استقبالیہ میں "خوش آمدید" کے عنوان سے نظم پڑھی۔ جس کا ایک شعر تھا ؎

مبارک ڈاکٹر اقبال انگلستان سے آیا
وہ پی ایچ ڈی اور ایل ایل ڈی کی ڈگری واں سے لایا

علامہ اقبال پی ایچ ڈی کی ڈگری تو ضرور لائے تھے، مگر " ایل ایل ڈی " کی ڈگری منشی میراں بخش صاحب نے ضرورت شعری کے لیے اپنی طرف سے عطا کر دی ع

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے

(شیخ اعجاز احمد)

ملازمت سے بیزاری

انگلستان جانے سے پہلے علامہ اقبال اورنٹیل کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرر اور اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد کچھ دنوں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر بھی رہے، لیکن ملازمت سے انہیں طبعی نفرت اور بیزاری تھی۔ ولایت سے واپسی پر انہیں انڈین ایجوکیشنل سروس کی پیشکش کی گئی۔ لیکن انہوں نے بیرسٹری کے آزاد پیشے کو اس پابندی پر ترجیح دی۔ اوّل تو علامہ نے قلندرانہ مزاج اور آزاد طبیعت پائی تھی۔ پھر ایک واقعہ نے اس رنگ کو اور بھی تیز اور پختہ کر دیا۔ فرماتے تھے کہ میں جن دنوں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھا، وہاں کے پرنسپل نے طالب علموں کی حاضری کے بارے میں مجھ سے کچھ ایسے انداز میں گفتگو کی، جیسے کوئی عہدیدار کلرک سے کرتا ہے۔ بس اس دن سے ملازمت سے میرا دل کھٹا ہو گیا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا، ملازمت سے دامن کشاں ہی رہوں گا۔ (شیخ اعجاز احمد)

مکان کی آرزو

۱۹۱۸ء میں جب علامہ اقبال کو وکالت کرتے ہوئے دس سال ہو چکے تھے تو انہوں نے اپنے والد کو خط میں لکھا۔

"میں نے اپنے دل میں ارادہ کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا کہ یہ ایک خداداد قوت ہے، جس میں میری محنت کو کوئی دخل نہیں۔ خلق اللہ تعالیٰ کی خدمت میں اسے صرف ہونا چاہیئے، لیکن ضروریات سے مجبور ہو کر مجھے اس ارادے کے خلاف کرنا پڑا۔"

دس سال کی پریکٹس میں علامہ اقبال نے بیس پچیس ہزار روپے کی رقم پس انداز کی۔ یہ رقم موقع کی مناسبت سے خرچ ہوئی۔ لیکن اس وقت تک اقبال نہ تو کوئی معقول مکان کرائے

پر لے سکے اور نہ اچھا فرنیچر اور ساز و سامان مہیا کر سکے۔ علامہ نے اپنے والدِ بزرگوار کے نام ایک خط میں اپنی اس ضرورت کا اظہار یوں کیا:

"حالات اس قسم کے پیدا ہو گئے ہیں کہ وکالت کے پیشے کے لیے ان لوازمات کا بہم پہنچانا ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ یہ لوازم بہم پہنچائے جائیں"۔

لیکن ان کا یہ ارادہ بس ذہن و نکر ہی تک محدود رہا۔ عملی جامہ نہ پہن سکا۔ انار کلی والا مکان چھوڑ کر علامہ اقبال نے میکلوڈ روڈ پر کوٹھی کرائے پر تو ضرور لے لی۔ مگر وہ "عمدہ مکان" حاصل نہ کر سکے۔ تھوڑا بہت ساز و سامان بھی خریدا، لیکن وہ معمولی تھا۔ زندگی کے آخری برسوں میں ایک موٹر بھی رکھا، لیکن پرانا سا۔ (شیخ اعجاز احمد)

درود و سلام

چچا جان کو دعا پر بڑا اعتقاد تھا۔ ان کا کلام پڑھنے سے اس اعتقاد کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے اشعار میں جہاں دعا کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دعا رسماً نہیں، بلکہ دل سے نکل رہی ہے۔ نبی کریمؐ پر درود بھیجنا بھی ان کے معمولات میں تھا اور اپنے خطوط میں اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھا کہ مسلمان کی بہترین تلوار دعا ہے۔ اس سے کام لینا چاہیئے۔ ہر وقت دعا کرنی چاہیئے اور نبی کریمؐ پر درود بھیجنا چاہیئے۔

اوراد کے بھی قائل تھے۔ جب مجھے بی اے کا امتحان دینا تھا تو دادا جان کی ہدایت پر میری کامیابی کے لیے آیۂ کریمہ کا ورد بھی کیا تھا۔ چنانچہ دادا جان کو لکھا کہ امید ہے، آپ کی دعا سے اعجاز امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ آیۂ کریمہ کا ورد شروع ہے۔

(شیخ اعجاز احمد)

احترامِ قرآن

علامہ کی چھوٹی ہمشیرہ کی شادی وزیر آباد کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی۔ غالباً اس لیے کہ

ان کے یہاں شادی کے بعد ایک دو سال میں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ان کی خوش دامن نے سسرال میں انہیں رہنے نہ دیا۔ تلخی اس قدر بڑھی کہ علامہ کی ہمشیرہ میکے چلی آنے پر مجبور ہو گئیں اور کئی سال یہیں رہیں۔ ان کی ساس نے بیٹے کی دوسری شادی بھی کر دی۔ پھر نہ معلوم کیا واقعات پیش آئے کہ ان کی ساس، اپنی بہو (علامہ کی ہمشیرہ) کو دوبارہ سسرال واپس لانے پر مصر ہو گئیں۔ وہ اپنے بیٹے کے ہمراہ علامہ کے والد کے پاس تشریف لائیں کہ طرفین کے رشتہ داروں میں مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ پہلے تو ادھر سے انکار ہوتا رہا۔ پھر بہت سوچ بچار کے بعد علامہ کے والدین رضامند ہو گئے۔ اتفاق سے اس دوران علامہ بھی سیالکوٹ پہنچ گئے۔ انہیں جب صورت حال کا علم ہوا، تو برہمی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سابقہ حالات کے پیش نظر انہیں غصہ آ گیا اور انہوں نے صلح پر رضامندی سے انکار کر دیا۔ والد نے جو ان کو غصے میں دیکھا تو فوراً کہا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں "والصلح خیر" فرمایا ہے، اتنا سننا تھا کہ علامہ چپ ہو گئے۔ قدرے توقف کے بعد والد نے ان سے پوچھا کہ پھر کیا فیصلہ کیا جائے۔ علامہ آبدیدہ ہو گئے اور بولے۔ وہی جو قرآن کہتا ہے۔ چنانچہ مصالحت ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ صلح خیر ہی ثابت ہوئی۔ (شیخ اعجاز احمد)

تلاوتِ قرآن

علامہ اقبال نے جب سیالکوٹ میں وکالت شروع کی، تو اکثر خطوط میں نماز اور تلاوتِ قرآن کی تلقین کرتے۔ خود انہوں نے مدرسہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی قرآن کریم ختم کر لیا تھا۔ مجھے تاکید فرمائی کہ کسی حافظ قرآن سے قرآن کریم دہرا لوں۔ ان دنوں سیالکوٹ کی ایک مسجد کے امام نابینا حافظ قرآن تھے۔ ان کا نام محمد رمضان تھا، جنہیں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ قرآن پڑھانے کی کوئی اجرت نہ لیتے تھے۔ جس نوجوان کو قرآن کریم کی تعلیم دیتے، اس کا نام اپنی پاکٹ بک میں لکھوا لیتے۔ حافظ رمضان صاحب کو علامہ کا کلام سننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک بار عدالت کی تعطیلات میں علامہ سیالکوٹ تشریف لائے ہوئے تھے کہ حافظ صاحب کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا اور انہوں نے علامہ سے

ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے ذکر کیا اور پوچھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو حافظ صاحب کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ علامہ نے جواباً کہا ” وہ تمہارے استاد ہیں اور وہ بھی قرآن کے، ان کی عزت ہم پر لازم ہے۔ اس کے بعد خود حافظ صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ حافظ صاحب کی عادت تھی کہ نئے آدمی سے ملتے تو اس کے چہرے، ہاتھوں اور بازوؤں پر ہاتھ پھیر کر اس کی شناخت کرتے۔ جو لوگ بصارت سے محروم ہو جاتے ہیں، ان کی قوت حاسہ بہت زیادہ تیز اور نازک ہوتی ہے اور انگلیاں آنکھوں کا کام دیتی ہیں۔ لہذا حافظ صاحب نے قوت لامسہ کے ذریعے علامہ کی ”شناخت“ بھی اپنے ذہن میں محفوظ کر لی۔ (شیخ اعجاز احمد)

عشقِ رسول ؐ

علامہ اقبال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے عشق تھا۔ سچا اور والہانہ عشق اور وہ عاشقانِ رسول کے دل و جان سے مداح اور قدر شناس تھے۔ سرکارِ دو عالم ؐ کی شان اقدس میں گستاخی کرنے والے راجپال کو جب لاہور کے ایک غیرتمند نوجوان غازی علم الدین نے کیفرِ کردار کو پہنچا کر عدالت عالیہ سے سزائے موت پائی، تو اس سارے واقعہ کے متعلق علامہ کے تاثرات واضح تھے۔ بقول یوسف سلیم چشتی علامہ نے علم الدین کی شہادت کے زمانہ میں بار بار یہ جملہ دہرایا ”اسیں گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا“ یعنی ہم باتیں ہی بناتے رہے اور نجار کا لڑکا سبقت لے گیا۔ اسی طرح جب ۱۹۳۲ء میں آریہ سماج حیدر آباد (سندھ) کے سیکرٹری نتھو رام نے ”ہسٹری آف اسلام“ کے نام سے کتاب شائع کر کے سرکار دو عالم ؐ کی شان اقدس میں سخت دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا، تو غازی عبدالقیوم نے انگریز کی عدالت منعقدہ کراچی میں نتھو رام پر چاقو کے پے درپے وار کیے اور جب غازی عبدالقیوم کو پھانسی کی سزا دی گئی تو علامہ نے اس واقعہ سے بھی بڑا اثر قبول کیا اور اس تاثر کو ” لاہور اور کراچی “ کے عنوان سے یوں منظوم فرمایا:

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور

موت کیا شئے ہے؟ فقط عالم معنی کا سفر

ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ

قدر و قیمت میں ہے خون جن کا حرم سے بڑھ کر

آہ اے مردِ مسلماں، تجھے کیا یاد نہیں؟

حرف لاتدع مع اللہ الٰھاً آخر

(فقیر سید وحید الدین)

احترامِ رسول

علامہ اقبال، حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات اقدس سے بے پناہ محبت اور والہانہ عشق رکھتے تھے۔ ایک روز میں ان کے مکان پر پہنچا تو علامہ کو بہت زیادہ فکرمند، مغموم اور بے چین پایا۔ گھبرا کے دریافت کیا: خیریت تو ہے کہ آج آپ خلاف معمول بہت زیادہ مضطرب اور پریشان ہیں۔

علامہ نے ایک مخصوص انداز میں نظریں اوپر اٹھائیں اور غم انگیز لہجے میں فرمایا۔ یہ سوچ کر میں اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہ کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے۔

علامہ مرحوم کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ اس حساب سے ۱۹۳۸ء میں انتقال کے وقت عاشق رسول کی عمر رسول اکرمؐ کے سن مبارک سے دو سال کم یعنی ۶۱ سال تھی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے علامہ کی تمنا اور دعا کو قبول فرما لیا۔

(حکیم احمد شجاع)

خدا کی ہستی

علامہ مرحوم کی قیام گاہ پر چند احباب کی موجودگی میں ایک ملاقاتی یکایک یہ سوال

کر بیٹھا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ عالم بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں۔ کیا آپ خدا کی ہستی اور باری تعالیٰ کے وجود کو فلسفیانہ دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں؟ علامہ نے اس کے جواب میں کہا "نہیں"

طاقانی نے اس پر مزید دریافت کیا کہ جب یہ بات ہے تو پھر آپ کے نزدیک خدا کی حقیقت قابل تسلیم کیوں کر ہوئی؟

علامہ نے فرمایا: یقیناً خدا کی ہستی ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس کے لیے مجھے کسی فلسفیانہ دلیل کی ضرورت نہیں۔ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرے پیغمبر نے جن کے متعلق ان کے دشمن بھی کہتے تھے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، جب فرمایا کہ خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے، تو خدا کی ہستی یقیناً ہے۔

(فقیر سید نجم الدین)

وجودِ باری

"ڈاکٹر صاحب! اگر اجازت ہو، تو ایک بات میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں؟"

"کیا؟"

علامہ اقبال کو اپنی طرف متوجہ پا کر میں نے عرض کیا۔ آپ ایک دانش ور فلسفی ہیں اور نہ صرف یہ کہ قدیم و جدید فلسفوں سے اچھی طرح آگاہ و باخبر ہیں، بلکہ آپ اپنی جگہ خود بہت بڑے مفکر ہیں، مگر اس کے باوجود آپ اپنے اشعار اور مقالات میں خدا کا ذکر غیر فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے، امانوئل کانٹ کے فلسفیانہ افکار کی روشنی میں اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ محض عقل و فلسفہ کی رُو سے نہ تو خدا کے وجود کا اثبات ممکن ہے اور نہ اس کی تردید اور خدا کے بارے میں جب بھی فلسفے کی رُو سے گفتگو ہو گی تو لازمی طور پر ہم وہی کہیں گے جو کانٹ نے کہا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ اتنے بڑے مفکر اور فلسفی ہیں، پھر آپ کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا کے وجود پر عقلی دلیل لانے کی بجائے خوش اعتقادی کے ساتھ اس کا ذکر کریں۔

علامہ بڑی خاموشی اور ہمدردی سے میرے خیالات سنتے رہے۔ انہوں نے درمیان میں ٹوکا اور نہ ہی تعجب کا اظہار کیا۔ جب میں اپنی بات پوری کر چکا، تو فرمایا۔ خدا کے متعلق پوچھتے ہو! میں نے اسے دیکھا ہے؟

پھر زیر لب مسکرائے اور تھوڑے سے توقف کے بعد مزید فرمایا:۔

"انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں۔ جب وہ خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ لمحے کم ہی نصیب ہوتے ہیں"۔

اور مزید فرمایا! "بہت ہی کم"۔

میں نے دریافت کیا! "کیا ہر شخص کے لیے خدا کا مشاہدہ ممکن ہے؟"

علامہ نے فرمایا:۔

"یہ دروازہ کسی پر بند نہیں ہے، لیکن جو شخص مشاہدے کا طالب ہو، اسے صبر اور انتظار لازم ہے"۔

(ممتاز حسن)

حقیقتِ قرآن

ایک روز میکس پلانک (Max Planck) کے نظریہ کوانٹم (Quantum Theory) اور اس کے بعد کی علمی تحقیق پر بحث ہو رہی تھی میں نے سائنس کی اس دریافت کا ذکر کیا کہ جب بہت سے برقیے مل کر حرکت کرتے ہیں تو ان کا عمل یکساں ہوتا ہے یعنی اس عمل کے نتائج یکساں ہوتے ہیں لیکن جب ایک برقیہ اپنی انفرادی حیثیت میں مصروف عمل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ یکساں حالات میں اور یکساں اسباب کے پیش نظر اس برقیے کا ردعمل یکساں ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسباب و نتائج کے جس رشتے کی بنیاد پہ سائنس کا سارا کارخانہ قائم ہے، خود وہ رشتہ ہی کمزور نظر آتا ہے اور کائنات کی بنیادی ساخت میں کچھ غیر متعین عناصر ایسے ہیں، جن کے عمل کے بارے میں کوئی پیشگی اندازہ کرنا ممکن نہیں۔

علامہ نے فرمایا "اب سائنسدانوں پر وہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے، جس کو قرآن کریم نے مختصر طور پر یوں بیان کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلیٰ کُلِّ شَیءٍ قَدِیْرٌ، یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

میں اس جواب سے بہت متاثر ہوا اور عرض کیا، واقعی قرآن کریم کی اس حقیقت پر عام مسلمانوں کی نظر نہیں گئی اور سائنس دان اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ خدائے حقیقی و برتر جو قادرِ مطلق ہے ان اسباب و نتائج کے محرکات اور مسلسل عمل کے سامنے اصولی طور پر مجبور اور بے بس ہے۔

ایک روز آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کے سلسلے میں روشنی کی رفتار کا ذکر آیا تو میں نے کہا "عجیب بات ہے، اب تک خلا میں روشنی سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی چیز دریافت نہیں ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشنی بجائے خود طبیعیاتی نقطہ نگاہ سے ایک قدرِ مطلق ہے۔"

علامہ نے نہایت متانت سے میرا سوال سنا اور فرمایا "کیا تمہیں قرآن حکیم کی وہ آیت یاد نہیں: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (ممتاز حسن)

بارگاہِ رسالت ﷺ میں

۱۹۲۰ء کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کے نام ایک گمنام خط آیا، جس میں لکھا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے دربار میں تمہاری ایک خاص جگہ ہے، جس کا تم کو کچھ علم نہیں۔ اگر فلاں وظیفہ پڑھا کرو، تو تمہیں بھی اس کا علم ہو جائے گا۔ اس شخص نے وظیفہ کے الفاظ بھی اس خط میں لکھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خیال سے کہ کاتب خط نے اپنا نام نہیں لکھا۔ اس گمنام خط کی طرف توجہ نہ کی اور وہ خط ضائع ہو گیا۔

کوئی تین چار مہینے بعد کشمیر سے ایک پیرزادے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے آئے۔ عمر تیس پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ بشرے سے شرافت اور چہرے سے ذہانت

کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس شخص نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے خیال کیا یہ شخص مصیبت زدہ اور پریشان حال ہے اور میرے پاس اپنی کوئی ضرورت لے کر آیا ہے انہوں نے شفقت آمیز لہجے میں استفسار حال کیا تو وہ بولا۔

"مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا فضل ہے۔ میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی۔ اب میں اس کی پنشن کھا رہا ہوں۔ میرے اس بے اختیار رونے کی وجہ خوشی ہے نہ غم۔"

ڈاکٹر صاحب کے مزید استفسار پر وہ بولا "میں سری نگر کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں (گاؤں کا نام شاید نوگام بتایا تھا) وہاں میں نے ایک دن عالم کشف میں نبی کریمؐ کا دربار دیکھا۔ صف نماز کے لیے کھڑی ہوئی تو حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ محمد اقبال آیا یا نہیں! معلوم ہوا کہ محفل میں نہیں تھا۔ اس پر ایک بزرگ کو اقبال کو بلانے کے لیے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان، جس کی ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی اور رنگ گورا تھا، اس بزرگ کے ساتھ نمازیوں کی صف میں داخل ہو کر حضورؐ کی دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔

اس پیرزادہ نے مزید کہا کہ میں نے آج سے پہلے نہ آپ کی شکل دیکھی تھی نہ آپ کا نام اور پتا جانتا تھا۔ کشمیر میں ایک بزرگ مولوی نجم الدین ہیں کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے یہ ماجرا بیان کیا تو انہوں نے آپ کا نام لے کر آپ کی بہت تعریف کی، کیونکہ آپ کی تحریروں کے واسطے سے وہ آپ کو جانتے تھے، گو انہوں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس دن سے مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ میں نے آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کے لیے کشمیر سے لاہور تک کا سفر کیا ہے۔ آپ کی صورت دیکھتے ہی میری آنکھیں اس لیے بے اختیار اشکبار ہو گئیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے کشف کی عالم بیداری میں تصدیق ہو گئی، کیونکہ جو شکل میں نے حالت کشف میں دیکھی تھی آپ کی شکل و شباہت ٹھیک اس کے مطابق ہے۔ سر مو فرق نہیں ہے۔

یہ ساری گفتگو سن کر ڈاکٹر صاحب کو وہ گمنام خط یاد آگیا۔ اس خط میں جو وظیفہ لکھا تھا، وہ انہیں یاد نہیں رہا تھا۔ پیرزادہ ملاقات کے بعد چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سارے واقعہ کی تفصیل والد بزرگوار کے گوش گزار کی اور اس کا اظہار بھی کیا کہ اب اس خط کے ضائع ہونے کا مجھے عمر بھر افسوس رہے گا۔

(شیخ اعجاز احمد)

لحن داؤدی

قرآن حکیم سے علامہ کو بے حد شغف تھا۔ بچپن سے بلند آواز سے قرآن پڑھنے کے عادی تھے۔ قرآن حکیم پڑھتے ہوئے وہ بے حد متاثر ہوتے۔ اپنی آواز کے بیٹھ جانے کا علامہ کو سب سے زیادہ قلق تھا کہ آپ قرآن عزیز بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ جب کبھی کسی نے قرآن حکیم کو خوش الحانی سے پڑھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ان پر لرزش و اہتزاز کی کیفیت طاری ہو گئی۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا بے حد احترام کرتے اور اگر جدید تعلیم یافتہ حال محمد صاحب، کہتا تو بہت رنج اور تکلیف محسوس کرتے اور اسے سختی سے ٹوک دیتے۔

(حکیم محمد حسن قرشی)

بے مثال مومن

صدی کے جشن مبارک کی تقریب (مسدس کا صدی ایڈیشن) ۱۹۳۵ء میں منائی گئی۔ حضرت علامہ بھی تشریف لے گئے۔ میں بھی ہمراہ تھا۔ تقریب کے خاتمہ پر منتظمین کی طرف سے مدعوئین کی فوٹو کا انتظام کیا گیا۔ فوٹو کے لیے حضرت علامہ کی کرسی صدر جلسہ نواب صاحب بھوپال کے سامنے رکھی گئی۔ اس بات کی اطلاع مولانا حالی مرحوم کے صاحبزادے نے ہمیں دی۔ حضرت علامہ یہ سن کر وہاں سے چل دیئے اور اپنی جائے رہائش پر پہنچ گئے۔ وہاں سے سامان لے کر سٹیشن پر پہنچے۔ میں حیران تھا کہ فوٹو میں شامل ہونے سے آپ نے

کیوں اجتناب فرمایا ہے۔ وٹینگ روم میں علی بخش نے حقہ تازہ کر کے پیش کیا۔ آپ نے ہلکے ہلکے کش لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے تصویر میں نہ شامل ہونے کے معمہ کو معلوم کرنے کی غرض سے پوچھا کہ ہمارے علماء کے نزدیک فوٹو کھنچوانا حرام ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ علامہ بولے: بات تو یہ ہے، مگر دلیل غلط دیتے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ صحیح دلیل کیا ہے؟ فرمانے لگے۔ صحیح دلیل یہ ہے کہ مومن کو بے مثال ہونا چاہیئے۔

(راجہ حسن اختر)

توکّل علی اللہ

علامہ اقبال کو اللہ تعالےٰ کی ذات پہ اس قدر بھروسہ اور توکل تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں متردد اور پریشان نہ ہوتے تھے۔ ان کے اندر راضی برضا رہنے کی سچ مچ کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ قناعت کے ساتھ خودداری اور صبر کے ساتھ توکّل۔ یہ اُن کے کردار کا نمایاں پہلو تھا۔ علامہ دوسروں کو بھی توکل علی اللہ کی تلقین فرماتے اور اس انداز میں نصیحت کے کلمات کہتے کہ یاس و نومیدی کی بجائے امید و رجا اور حوصلہ پیدا ہو۔

شیخ اعجاز احمد ۱۹۲۲ء میں جب انکم ٹیکس افسر مقرر ہو کر ٹریننگ کے لیے پشاور بھیجے گئے اور وہاں ایک عیسائی ٹریننگ افسر کے تعصب سے سابقہ پڑا تو انہوں نے اس افسر کے غیر ہمدردانہ اور متعصبانہ رویّے کا حال لکھ کر علاّمہ کو بھیجا۔ علاّمہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ رزق انسان کا عمر و زید کے ہاتھ میں نہیں، اللہ کے ہاتھ میں ہے ؎

رزق از وے جو، مجو از زید و عمر
مستی از مے جو، مجو از بنگ و خمر

تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیئے اور ہر قسم کی فکروں کو نکال دینا چاہیئے۔ خدا کارساز ہے اور انسان کی فکر اس کے لیے باعث آزار ہے۔ بالفرض اگر تم کو اپنی موجودہ مہم میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر کیا! خدا تعالےٰ رزق کا کوئی اور سامان

پیدا کر دے گا۔

۱۹۳۱ء میں جب علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے تو وہاں انہیں اطلاع ملی کہ ان کے بڑے بھائی بیمار ہیں اور بنکوں کے متعلق منشی طاہر دین نے لکھا کہ ان کے فیل ہو جانے کی افواہیں گرم ہیں۔ اس پر علامہ نے جواب میں تحریر فرمایا۔ برادر مکرم کی طبیعت کی ناسازی کی خبر سُن کر مجھے یک گونہ فکر پیدا ہوا ہے، زندگی اور موت، رنج و راحت سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ انشاءاللہ ان سے ملاقات ہو گی اور میں ان کو تندرست پاؤں گا۔ طاہر دین نے بنکوں کے متعلق فکر کا اظہار کیا تھا۔ اس سے کہہ دینا چاہیئے کہ فکر کی بات نہیں۔ میرے تمام معاملات جان و مال اور روپیہ اللہ کے سپرد ہے۔ جب سے میں نے ایسا کیا ہے، مجھے کوئی تردد نہیں ہوتا۔ اس کی مرضی میری مرضی ہے۔

(فقیر سید وحید الدین)

خوفِ خدا

سردار چچی جان، بڑی فراخ حوصلہ خاتون تھیں۔ ایک مرتبہ کسی کی طرف سے چچا جان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ چند ہزار روپے ان کے کسی کام کے لیے صرف کریں۔ چچا جان کے پاس روپیہ موجود نہ تھا۔ سردار چچی جان کو اس مطالبہ کا علم ہوا تو انہوں نے دادا جان کو خط لکھا کہ ان کا زیور فروخت کر کے مستحق ضرورت مند کو دے دیا جائے۔ اس کے جواب میں دادا جان کا جو خط آیا، وہ چچا جان نے دیکھ لیا اور اس طرح انہیں اس پیشکش کا علم ہو گیا۔ علامہ نے اپنے والد بزرگوار کو لکھا تھا۔ آپ کا جو خط اعجاز کی چچی کے نام آیا ہے، میں نے دیکھا ہے اور اس نے اس خط کا مضمون بھی سنایا ہے، جو اس نے آپ کی خدمت میں تحریر کیا تھا۔ یہ اس کے دل کی وسعت اور فراخ حوصلگی کی دلیل ہے، مگر یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ میں اس کا زیور لے کر ایسے کام پہ صرف کروں، جس سے نہ اسے کچھ فائدے کی توقع ہو سکتی ہے، نہ مجھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنا زیور

اس خیال سے نہیں دیتیں کہ کل کو اس کا معاوضہ ملے گا۔ بلکہ وہ محض اس غرض سے دیتی ہے کہ مجھ پر کوئی شخص حرف گیری نہ کرے لیکن اگر کوئی شخص مجھ پر حرف گیری کرے، تو اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ وہ شخص مجھ سے ناخوش ہے، برخلاف اس کے ناانصافی کا مطلب خدا اور رسول کو ناخوش کرنا ہے، جس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ میں اور لوگوں کی حرف گیری آسانی سے برداشت کر سکتا ہوں۔ خدا اور رسول کی ناراضگی سے میرا دل کانپتا ہے۔

(شیخ اعجاز احمد)

سوزِ عشق

اقبال کو ذاتِ رسالت مآب سے جو والہانہ محبت تھی، اس کا اظہار ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ ان کا تنہا یہ شعر سوزِ عشقِ نبیؐ کا آتش کدہ ہے ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست!

ایک مرتبہ علامہ نے اپنی چھوٹی ہمشیرہ کو لکھ بیں لکھا۔ میں جو اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں، تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے۔ اگر یہ قوی دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسول کی میں کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ والدہ مکرم مجھے دینی علوم ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہر حال جو کچھ خدا کے علم میں تھا، ہوا اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا، میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا، اس سے بڑھ کر ہونا چاہیئے تھا اور زندگی تمام و کمال نبی کریمؐ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیئے تھی۔

(نفیر سید وحید الدین)

گدائے دردمند

مثنوی رموزِ بے خودی میں علامہ نے اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک سائل بھیک مانگتا اور صدا لگاتا ہوا ان کے دروازے پر آیا۔ یہ گدائے مبرم یعنی اڑیل فقیر تھا۔ دروازے سے ٹلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کے بار بار چیخ چیخ کر صدا لگانے پر علامہ اقبال نے طیش میں آکر اسے مارا اور اس مار پیٹ میں فقیر کی جھولی میں جو کچھ تھا، زمین پر گر گیا۔ علامہ کے والد اس حرکت پر بہت آزردہ اور کبیدہ خاطر ہوئے اور دل گرفتہ ہو کر بیٹے سے کہا کہ قیامت کے دن جب خیر الرسلؐ کی امت سرکار کے حضور جمع ہوگی تو یہ گدائے دردمند تمہارے اس برتاؤ کے خلاف حضورؐ سے فریاد کرے گا۔ اس وقت علامہ اقبال پر ایک کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اپنے دل کی صدا بن گئے ؎

اے صراطت مشکل از بے مرکبی
من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ
"حق جوانے مسلمے با تو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد!
از تو ایں یک کار آساں ہم نشد
یعنی آں انبارِ گلؔ آدم نشد"
در ملامت نرم گفتار آں کریم
من رہینِ خجلت و امید و بیم
اندکے اندیش و یاد آر اے پسر
اجتماعِ امتِ خیر البشرؐ
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر
لرزۂ بیم و امیدِ من نگر

بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیش مولا بندہ را رسوا مکن

یہ شاعرانہ پیرایۂ بیان یا خیالی حکایت نہیں ہے، بلکہ ایک سچا واقعہ ہے۔ علاّمہ مرحوم کے والد کو اپنے بیٹے کی تربیت کا بڑا خیال رہتا۔ وہ کسی بات پر ٹوکتے یا اس کے کرنے سے منع کرتے تو اکثر و بیشتر قرآن کریم یا اسوہ رسول کریم کے سہارے حوالہ سے پند و نصیحت فرماتے۔ علاّمہ اقبال قرآن کی آیت اور حدیث رسولؐ سنتے ہی "گردن بہ طاعت نہادن" کی تصویر بن جاتے

(نقیر سید وحید الدین)

روحانی اضطراب

ایک مرتبہ علاّمہ نے مجھے خط میں لکھا کہ جرمنی کے مایہ ناز شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر نوجوانوں کے روحانی اضطراب اور دلی بے چینی کو محسوس کرکے ان کو یہ پیغام دیا تھا۔

"Art still has Truth, Take Refuge there"

اس وقت دنیائے اسلام کی وہی حالت ہے، جو پولین کے وقت جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مسلمانوں کے لئے وہی ہے، جو گوئٹے نے دیا تھا۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے Art کی جگہ Religion رکھ دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آرٹ میں اطمینان و مسرّت ضرور ہے، مگر قوت نہیں۔ مذہب میں اطمینان اور قوّت دونوں چیزیں ہیں۔

(شیخ اعجاز احمد)

شجاعت و دلیری

علاّمہ نے ایک انگریز جرنیل کا ذکر کیا، جو لکزان کے پاس آیا کرتا تھا اور

مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ کہنے لگا۔ مجھے قرآن بہت پسند ہے۔ اکثر میرے مطالعہ میں رہتا ہے، علامہ نے دریافت کیا کہ آپ نے قرآن کریم میں ایسی کون سی چیز دیکھی ہے، جو آپ کو اس قدر پسند آئی ؟

جرنیل نے جواب دیا۔ قرآن میں دلیری اور مردانگی کی باتیں بہت ہیں، جن کو پڑھ کر انسان میں جرأت اور بہادری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

(ممتاز حسن)

بذلہ سنجی

جناب عبداللہ چغتائی سے علامہ کو بہت لگاؤ تھا۔ ان کی ملاقات کے منتظر رہتے۔ ان کی باتیں سنتے اور محظوظ ہوتے۔ اگر ان سے ملاقات ہوئے زیادہ مدّت ہو جاتی تو خود انہیں بلاتے۔ ایک بار چغتائی صاحب عرصے کے بعد علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا:

"عبداللہ! اتنے دنوں سے کہاں تھے؟"

چغتائی صاحب نے جواب دیا "ڈاکٹر صاحب! کیا عرض کروں، آجکل اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی اور فرصت ملتی ہے تو وقت نہیں ملتا"

علامہ نے اس جواب پر بے اختیار قہقہہ لگایا اور فرمایا۔

"عبداللہ! تم نے آج وہ بات کہی ہے، جو آئن سٹائن کے باپ کو بھی نہیں سوجھی ہوگی"

(ممتاز حسن)

انصاف یا فضل

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شیخ اعجاز احمد کی ایک پھوپھی نے کسی سلسلے میں علامہ کے سامنے اللہ تعالےٰ کے عدل و انصاف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ منصف ہے

اور انصاف کرے گا۔

علامہ نے اس پہ فرمایا کہ اللہ تعالےٰ سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ ہمارے ساتھ اپنی صفت عدل کا مظاہرہ نہ کرے کہ ہم اس کے انصاف کے متحمل نہیں ہو سکتے، البتہ وہ ہم پہ اپنا فضل و کرم فرمائے، کیونکہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے سبب بخشا جاؤں گا۔

(فقیر سید وحید الدین)

اقبال، خود شناس

علامہ اقبال خود نگر نہیں، خود شناس تھے۔ انہیں اپنی شخصیت کا احساس اور اپنی خودی کا عرفان تھا۔ اس لیے اضافی نسبتوں کی طرف ان کا میلان نہیں رہا۔ انہیں اس کی کبھی خواہش نہ ہوئی کہ کسی انجمن یا ادارے میں انہیں کوئی عہدہ دیا جائے۔ جلسوں کی صدارتوں کا بھی انہیں شوق نہ تھا۔ لوگوں کے اصرار پہ جب کبھی انہیں کسی اجتماع یا کانفرنس کی صدارت کرنا پڑی، تو اہلِ نظر نے محسوس کیا کہ وہ اسے ذاتی اعزاز سمجھ کر نہیں، محض خدمت جان کر ادا کر رہے ہیں۔

ایک بار تجویز ہوا کہ اقبال کے نام سے ایک فوجی سکول قائم کیا جائے۔ علامہ نے تجویز پیش کرنے والے فوجی افسر کو جواب دیا کہ ایک شاعر کے نام سے فوجی سکول کو منسوب، اور موسوم کرنا موزوں نہیں ہے اور پھر خود تجویز کیا کہ اس سکول کا نام "ٹیپو فوجی سکول" رکھا جائے۔

(فقیر سید وحید الدین)

صوفی اقبال

میں شام کے وقت حسبِ معمول حاضر خدمت تھا کہ ایک بزرگ فقیر حضرت کے پاس آئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ حضرت نے فرمایا۔ سائیں جی میرے لئے دعا کیجیے

وہ کہنے لگے "کیا آپ کو دولت مطلوب ہے"؟

"نہیں مجھے دولت کی ہوس نہیں۔ درویش آدمی ہوں۔ اللہ مجھے ضرورت کے مطابق عطا کر دیتا ہے۔" پھر فقیر نے پوچھا "کیا دنیا میں عزت و جاہ کے طلب گار ہو؟" نہیں وہ بھی اللہ کے فضل سے حاصل ہے۔ میں کسی اونچے رتبہ کا طالب نہیں ہوں"۔ سائیں جی نے پوچھا "تو پھر کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟" اس پر حضرت کی آنکھوں میں خاص چمک پیدا ہوئی۔ فرمانے لگے۔

"خدا سے ملنا؟ سائیں جی، خدا خدا کرو۔ میں اس سے کیونکر مل سکتا ہوں۔ میں بندہ! وہ خدا۔ میرا اس کا واسطہ صرف بندگی کا ہے، ملنا کیا معنی! اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ خدا مجھے ملنے آ رہا ہے تو میں بیس بیس کوس دور بھاگ جاؤں۔ اس لیے کہ دریا قطرے سے ملے گا تو قطرہ غائب ہو جائے گا۔ میں قطرے کی حیثیت سے قائم رہنا چاہتا ہوں اور اپنے آپ کو مٹانا نہیں چاہتا، بلکہ قطرہ رہ کر اپنے آپ میں دریا کے خواص پیدا کرنا چاہتا ہوں۔

اس پر سائیں بے خود ہو کر جھومنے لگے اور کہنے لگے۔ واہ اقبال بابا، جیسا سنتے تھے، ویسا ہی پایا۔ تو خود آگاہ مشرب ہے، تجھے کسی فقیر کی دعا کی کیا ضرورت ہے؟

(عبدالمجید سالک)

اسلام اور آرنلڈ

میں نے عرض کیا۔ سر آرنلڈ کا تو آپ نے سن ہی لیا ہوگا۔

متعجب ہو کر فرمایا۔ "کیا؟"

میں نے کہا "صبح کے اخبار میں ان کے انتقال کی خبر ...."

بس اتنا کہا تھا کہ حضرت علامہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور پھر سر جھکا کر چند لمحے خوب روئے۔ ان کے دل کا بخار ہلکا ہوا، تو فرمایا: اقبال، اپنے استاد اور دوست سے محروم ہو گیا۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اتنے گہرے روابط اور تعلق خاطر کے باوجود جب میں نے آرنلڈ صاحب کے مرتبہ استشراق اور اسلام سے ان کی عقیدت کا ذکر چھیڑا تو فرمایا۔ اسلام! اسلام سے آرنلڈ کا کیا تعلق؟ میں نے کہا: جب کوئی شخص ازراہ تحقیق اور طالب علمانہ اسلام پہ قلم اٹھاتا ہے تو اس سے یہی توقع ہوتی ہے کہ اسلام کے بارے میں اچھی ہی رائے قائم کرے گا، بلکہ شاید دل سے اس کی طرف مائل بھی ہو جیسے نپولین یا گوئٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے اور آرنلڈ صاحب تو دعوت اسلام' ایسی کتاب کے مصنف بھی تھے۔

فرمایا: دعوت اسلام، اور اس قسم کی کتابوں پہ نہ جاؤ۔ آرنلڈ کی وفاداری صرف خاک انگلستان سے تھی۔ جو کچھ کیا، انگلستان کے مفاد کے لئے کیا۔ میں جب انگلستان میں تھا تو انہوں نے مجھے براؤن کی تاریخ ادبیات ایران پہ کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا، کیونکہ مجھے اس قسم کی تصنیفات میں انگلستان کا سیاسی مفاد کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ دراصل یہ ایک کوشش تھی، ایرانی قومیت کو ہوا دینے اور اس طرح امت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی۔

(سید نذیر نیازی)

شعروں کا نیلام

جنگ بلقان کے دوران خبر ملی کہ اقبال نے شکوہ کا جواب لکھا ہے، جو عنقریب کسی جلسے میں پڑھا جائے گا۔ اس پہ جوش امید ہر طرف پھیل گیا اور شاید اسی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مولانا ظفر علی خاں، زمیندار، والوں نے موچی دروازہ لاہور کے باہر باغ میں ایک عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا اور مشتہر ہوا کہ اس میں اقبال کی نظم ہو گی۔ مشائقین کا ایک جم غفیر باغ کے پنڈال میں جمع ہوا۔ میں خود اس جلسے میں موجود تھا۔ اقبال نے نظم اسی طرح ہر طرف سے داد کی بوچھاڑ میں پڑھی کہ ایک ایک شعر نیلام ہوا اور ایک گراں قدر رقم بلقان فنڈ کے لئے جمع ہو گئی

(میاں عطاء الرحمٰن)

مغربی اقوام

یورپین اقوام کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا: ہر فرعون کی حکمرانی کے اصول قریب قریب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا۔ اس کے بعد کہا کہ ایک بحیرۂ قلزم میں ڈوبا تھا، ممکن ہے، دوسرا بحیرہ روم میں غرق ہو۔

(راجہ حسن اختر)

کون سے ڈاکٹر؟

میرے والد فقیر سید نجم الدین جن دنوں شرقپور میں متعین تھے، ایک شادی میں شریک ہونے کے لئے لاہور تشریف لائے۔ علامہ اقبال بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ والد صاحب کے ہمراہ ان کا ان پڑھ چپراسی بھی تھا۔ چپراسی سے والد صاحب نے کہا "دیکھو، یہی وہ ڈاکٹر اقبال ہیں، جن کا میں اکثر ذکر کیا کرتا ہوں"۔

والد صاحب اپنی نشست سے اٹھ کر کہیں گئے تو چپراسی بڑے ادب کے ساتھ علامہ صاحب سے کہنے لگا "میرے پیٹ میں اکثر درد رہتا ہے۔ آپ کوئی دوا بتا دیں، تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی"۔

ڈاکٹر صاحب اس کی اس سادگی پر مسکرا دیئے۔ اس مسکراہٹ میں ایک خاص لطف اور خوش ذوقی بھی شامل تھی۔ ایک شخص جو علامہ کے قریب ہی بیٹھا تھا اس نے چپراسی سے کہا کہ یہ جسم کے نہیں، علم کے ڈاکٹر ہیں۔

لطیفے کے طور پر یہ واقعہ بھی بعض محفلوں میں سنا گیا کہ کسی مقام پر "یوم اقبال" منایا جا رہا تھا۔ وہاں ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر اقبال نے قوم کے لئے بہت بڑی قربانی دی۔ ولایت سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے آئے، مگر ایک دن بھی ڈاکٹری کا پیشہ اختیار نہیں کیا اور ساری عمر قوم کی خدمت

میں گزار دی۔ یہاں یہ ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر سید محمد حسین اور ڈاکٹر محمد اقبال نے ایک بار میڈیکل کالج میں داخلے کی واقعی کوشش بھی کی تھی۔ سید محمد حسین کو تو داخلہ مل گیا، مگر ڈاکٹر اقبال کسی وجہ سے رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود مجھے سنایا کہ بھئی! میں نے ڈاکٹر بننے کی ایک بار کوشش کی۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اللہ تعالےٰ کی اس میں بہت بڑی مصلحت پنہاں تھی۔ مشیّت ایزدی علامہ اقبال کو جو کچھ بنانا چاہتی تھی، اس کے پیش نظر میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملنا ہی مناسب تھا اور اس ناکامی میں شاندار مستقبل کی کامیابی اور کامرانی مضمر تھی۔ طبی ڈاکٹر بن کر وہ چند ہزار مریضوں کی خدمت کر سکتے تھے، مگر انہوں نے فلسفی، مفکر، شاعر، بلکہ یوں کہیے کہ حکیم الامت بن کر آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے اسباب مہیا فرما دیئے اور حکمت و بصیرت کے نہ بجھنے والے چراغ روشن کر دیئے۔

(فقیر سید وحید الدین)

سائنس کی بے مائگی

۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے کہ نیاز محمد خان، ممتاز حسن اور میاں نصیر احمد میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں علامہ اقبال سے ملنے کے لئے گئے۔ علامہ نے ان طلبہ سے دریافت کیا کہ تم کون سے مضامین پڑھتے ہو؟

میاں نصیر احمد نے جواب دیا "فزکس اور کیمسٹری"۔ یہ سن کر علامہ نے نظریہ اضافیت کا ذکر شروع کر دیا اور فرمایا "اس تھیوری کو سمجھنے کے لئے میں نے ریاضی کا مطالعہ بھی کیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، نظریہ اضافیت کا یہ مطلب ہے کہ دنیا ازلی و ابدی نہیں ہے، بلکہ یہ پیدا ہوئی ہے اور اسے فنا ہو جانا ہے۔

میاں نصیر احمد نے عرض کیا کہ آجکل ایک امریکی ماہر طبیعیات۔ جس کا نام پروفیسر کامپٹن ہے، لیکچر دینے کے لئے لاہور آیا ہوا ہے اگر آپ اس کا لیکچر سننے چلیں اور اس سے تبادلۂ خیالات کریں، تو اس کا نتیجہ یقیناً مفید

رہے گا۔ پروفیسر کامپٹن نے بعد میں نوبل پرائز پانے کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔
علامہ نے فرمایا۔ "میں ضرور جاؤں گا۔"
اس لیکچر کا انتظام گورنمنٹ کالج لاہور کے نزکس تھیٹر میں کیا گیا تھا۔ میاں نصیر احمد کہتے ہیں کہ جب میں لیکچر ہال میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ علامہ سب سے آخری بینچ پر بڑے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ امریکی پروفیسر کی تقریر ختم ہوئی تو اس نے سامعین کو سوالات کی دعوت دی۔ علامہ نے اس وقفہ سوالات کے دوران پروفیسر کامپٹن سے کئی اہم سوالات کیے، جو اس قدر عالمانہ اور پیچیدہ تھے کہ میاں نصیر احمد کے قول کے مطابق ان کی فہم و ادراک کی وہاں تک رسائی نہ ہو سکی۔ اور سمجھ سے بالا تر ہونے کے سبب ہی انہیں یادداشت میں محفوظ نہ رکھا جا سکا۔ البتہ پروفیسر کامپٹن کے جواب کا مفہوم ان کے ذہن نشین رہا۔ اس نے علامہ کے سوالات سے تقریباً عاجز ہو کر کہا تھا "سائنس قطعی طور پر ان سوالات کے جواب نہیں دے سکتی۔"

ایٹمی توانائی کا راز

علامہ اقبال جن دنوں لندن میں تھے، میں ایک دن گیارہ بجے ان سے ملنے کے لئے گیا۔ وہاں مجھ سے پہلے ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ یہ نوجوان غالباً امرتسر کے کسی مسلمان کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور ۱۹۳۲ء میں اس نے انگلستان کی کسی یونیورسٹی سے آنرز کے ساتھ انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس نوجوان نے عرض کیا کہ میرے والدین نے مجھے خط لکھا ہے کہ تم نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے، ڈاکٹر اقبال حسن اتفاق سے لندن میں تشریف رکھتے ہیں، اپنے مستقبل کے بارے میں ان سے مشورہ کرو۔ دراصل یہ نوجوان علامہ کے اثر و رسوخ کے ذریعے کسی موزوں ملازمت کی تلاش میں تھا۔
علامہ نے اس نوجوان کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا، بلکہ جائزہ لیا اور فرمایا۔
"تم بڑے صحیح وقت پر آئے ہو۔ تم جیسے نوجوان کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے بعد

کہا "میں جب ہندوستان سے روانہ ہو رہا تھا تو اس وقت استنبول سے استنبول لائبریری کے لائبریرین کا میرے پاس خط آیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ میرے پاس ایٹم توڑنے کا جو نسخہ موجود ہے، اسے حاصل کرنے کے لئے جرمن مجھ پر بہت دباؤ ڈال رہے ہیں۔ اس لئے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ میرا خط لے کر استنبول چلے جاؤ اور وہاں اس اہم مقصد کے لئے اپنی زندگی کے کم از کم پانچ سال وقف کر دو۔ اس کام میں جو اخراجات ہوں گے، ان کو پورا کرنے کے لئے اگر مجھے گھر گھر جا کر مانگنا پڑا، تو میں ضرور مانگوں گا۔

وہ نوجوان علامہ کے اس مشورے کو سن کر بولا۔ "میرے والدین نے بڑی تکلیفیں اٹھا کر مجھے لکھایا پڑھایا ہے۔ اس لئے مجھے آپ کے مشورے پر اچھی طرح سوچنا پڑے گا۔"

افسوس ہے، بات جہاں تھی، وہیں کی وہیں رہ گئی۔ نہ تو یہ نوجوان طالبعلم استنبول جانے کی ہمت کر سکا اور نہ علامہ اقبال کسی دوسرے پر اس اہم کام کے لئے اعتماد کر سکے۔ اس طرح سائنس کا یہ عظیم کارنامہ مسلمانوں کی بجائے یورپی اقوام کے مستقبل میں لکھا گیا۔

(ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی)

یادگار مشاعرہ

وہ جلسہ نہیں تھا، پنجاب پبلسٹی کمیٹی کی طرف سے ایک عظیم مشاعرہ تھا، جس کی صدارت کچھ وقت کے لئے خود لیفٹیننٹ گورنر نے کی۔ پنجاب اور دہلی سے شعراء کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ بندہ مرحوم بھی مدعو اور شرکاء میں شامل تھا۔ علامہ اقبال کے علاوہ ناظر، نیرنگ، دہلی کے نواب سائل اور برق مرحوم بھی شامل تھے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر کا حفیظ جالندھری میرے پاس بیٹھا تھا۔ مشاعرے میں ظفریہ نظمیں پڑھی گئیں۔ لیکن علامہ اقبال کی دو مختصر نظمیں (ایک اردو اور دوسری فارسی) اپنی مثال آپ تھیں۔ علامہ نے دونوں نظمیں سٹیج پر ٹہل ٹہل کر ترنم سے اور زبانی سنائیں۔ آواز نہایت دلکش

پرسوز اور دل نشین تھی۔ میں نے آج تک ایسا پرتاثیر نغمہ نہیں سنا۔ سناتے سناتے وہ ایک شعر بھول گئے۔ برابر سوچنے کے انداز میں کوئی آدھا منٹ ٹہلتے رہے اور پھر سر اٹھا کر شعر اسی لے میں ادا کر دیا۔ ان کی خموشی کے دوران میں مکمل سناٹا چھایا رہا۔ اس مشاعرے میں تین انعام بھی مقرر تھے۔ جج علامہ اقبال تھے۔ انہوں نے مقابلے میں شامل ہونے والے شعراء کی نظمیں اپنے مکان پر منگوالیں اور چند روز میں فیصلہ دیا۔ انہوں نے پہلے اور دوسرے انعام کا مستحق دو ہندو شاعروں کو اور تیسرے انعام کا مستحق ایک مسلم شاعر کو ٹھہرایا۔

(تلوک چند محروم)

پہلا انعام

علامہ اقبال نے والد محترم ہی کو پہلا انعام دیا تھا۔ ان کی جو نظم انعام کی مستحق قرار پائی، وہ ایک قصیدہ تھا، جسے "اب کلام محروم" سے خارج کر دیا گیا ہے ؎

چلی گلزار عالم میں نسیم فضل رحمانی
فرو آخر ہوئی جنگ و جدل کی شعلہ افشانی

(جگن ناتھ آزاد)

عوام کا اقبال

لاہور میں فلیمنگ روڈ (متصل پرانی میوہ منڈی) پر ایک جراح محمد عاشق تھے۔ اقبال نے اس کو اس کے فن جراحی کے سلسلے میں ایک سند دی تھی، جس کو محمد عاشق نے بطور اشتہار استعمال کیا۔ اس اشتہار کا عنوان تھا "فن جراحی کا حیرت انگیز کرشمہ" اس سند کا مضمون حسب ذیل ہے۔

"مسٹر محمد عاشق فن جراحی میں فوق العادت دسترس کے مالک ہیں جس حد تک مجھے آزمائش کا موقع ملا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ

فن جراحی میں ید طولےٰ رکھنے کے علاوہ نہایت فرض شناس اور دقیقہ رس انسان ہیں۔ مزید براں مجھے یہ بھی احساس ہے کہ وہ لاہور کی پبلک میں ایک ہر دلعزیز جراح واقع ہوئے ہیں۔"

(ممتاز حسن)

پنجابی شاعری

ایک دفعہ کہیں سے بکری کا ایک بچہ جاوید ماموں کے ہاتھ آ گیا۔ وہ سارا دن اس کو لئے لئے پھرتے۔ ایک روز حضرت علامہ باہر سے تشریف لائے، تو جاوید ماموں حسبِ معمول بکری کے بچے کے ساتھ کھیلنے میں مشغول تھے۔ آپ ان کے پاس ہی بیٹھ گئے اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ والدہ جاوید کو خدا جانے کیا خیال آیا کہ کہنے لگیں۔ "آپ نے بے شمار شعر کہے ہیں، لیکن جاوید پر کبھی کچھ نہیں لکھا؛" علامہ علیہ الرحمہ مسکرائے اور فرمایا "یہ کون سی مشکل بات ہے، لو ابھی کہہ دیتے ہیں" اور پھر مندرجہ ذیل پنجابی اشعار فی البدیہہ کہے۔

اک سی ببا بکری والا   ہتھ وچ رکھدا ڈنڈا
نانی جو اوہنوں پھڑن گئی   لیا مار پچھنڈا
بھائی ببا بکری والا
نالے کھاندا توس تے انڈا   نالے کھاندا حلوا منڈا
بھائی ببا بکری والا

جاوید ماموں کو بچپن میں پیار سے ببا کہتے تھے۔ مندرجہ بالا واقعہ کے وقت ان کی عمر چار پانچ برس کے قریب تھی۔ (خالد نظیر صوفی)

اور ایک پنجابی پہیلی

ایک دفعہ رات کو اقبال منزل سیالکوٹ میں گھریلو محفل جمی ہوئی تھی۔ باتوں باتوں

میں حضرت علامہ نے ایک منظوم پنجابی پہیلی بھجوائی، جو کسی سے بوجھی نہ گئی۔ پہیلی یوں تھی۔

ایس گبھرو دے کم کوّلے
رہندا رتاں دے دوّلے
پگ نہ بنھدا ٹوپی پاندا!
بن پیراں نچیں ٹردا جاندا!

جواب :۔ دسیدحا برقع)
(خالد نظیر صوفی)

نہرو دی پوٹ

جاوید کو بچپن میں کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔ رات کو سونے سے پہلے مجھ سے ضرور کہانی سنا کرتا۔ ایک روز دوپہر کو چچا جان کھانا کھانے کے بعد پلنگ پر نیم دراز تھے کہ جاوید ان سے کہانی کی فرمائش کرنے لگا۔ انہوں نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں، مگر جاوید ٹلنے والا کہاں تھا۔ کہنے لگا تو پھر کوئی پہیلی ہی سہی۔ چچا جان مان گئے اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فرمایا۔

اک جناور ایسا جدی چنج اتے بیبہ
اوہدیاں ہڈیاں حلال اوہدا شوربہ حرام

جاوید کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر ایک دم بولا "نہرو دی پوٹ" اس جواب پر چچا جان خوب ہنسے اور فرمایا "بالکل درست، بالکل درست تم نے نہرو رپورٹ کو بالکل صحیح پہچانا ہے۔" دراصل ان دنوں نہرو رپورٹ کا بہت چرچا تھا اور جاوید چونکہ ہر وقت اسی کا تذکرہ سنتا رہتا تھا، اس لئے وہی کہہ دیا۔ (وسیمہ مبارک)

دلشاد بہن

سیالکوٹ سے عنایت خالہ جان جب بھی لاہور خط لکھتیں، تو ہمیشہ ان الفاظ سے

ابتدا کرتیں:- "آپ کا خط ملا، پڑھ کر دلشاد ہوا۔" بار بار "دلشاد" پڑھ پڑھ کر نانا جان (علامہ اقبال) نے ان کا نام ہی "دلشاد بہن" رکھ دیا۔ اب جب ان کا خط لاہور پہنچتا تو فرماتے "لو جی، آج ہماری دلشاد بہن کا خط بھی آیا ہے۔

(خالد نظیر صوفی)

چڑیا گھر

نانا جان کو کبوتروں کا بہت شوق تھا اور ان کی بیگمات نے بھی کئی ایک مختلف جانور اور پرندے پال رکھے تھے۔ والدہ مکرمہ بتاتی ہیں کہ ہمارے گھر میں اس قدر پالتو جانور ہوا کرتے تھے کہ بعض اوقات تو چڑیا گھر کا گمان گزرتا، ان میں تو سب سے زیادہ چچا جان کے کبوتر تھے، جن کے لئے انہوں نے ایک بڑا سا کمرہ نما پنجرہ بنوا رکھا تھا، جس میں قسم قسم کے کبوتر بھرے رہتے اور سارا دن غٹرغوں غٹرغوں کا شور مچایا کرتے۔ بچپن میں میں گھنٹوں پنجرے کے پاس بیٹھی ان کا تماشا دیکھنے میں مصروف رہا کرتی تھی اور ان کو دانہ دنکا ڈالا کرتی تھی۔ مختارہ چچی جان کو بلیوں کا شوق تھا، چنانچہ انہوں نے ایک بڑی پیاری سی بلی پال رکھی تھی، جسے وہ "پسی" کے نام سے پکارا کرتی تھیں۔ چچی جان کو تو ہر وقت پسی ہی کا خیال رہا کرتا تھا اور وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے دم ہلاتی پھرا کرتی تھی۔ چچی جان جہاں بھی ہوتیں پسی کی موجودگی لازم ہوتی، یہاں تک کہ سونے کے لئے بھی اسے چچی جان کی گود ہی پسند تھی اور وہ بھی بڑے پیار سے اس کو گود میں لئے بیٹھیں پان چبایا کرتیں یا سروتے سے چھالیہ کی ڈلیاں کاٹتی رہتیں۔ چچا جان بھی پسی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اکثر پیار سے اس کو تھپتھپایا کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ اسے "مختار کی بے زبان بیٹی" کہہ کر چچی جان کو چھیڑا کرتے، اس کے علاوہ سردار چچی جان (والدہ جاوید) نے طوطا، مینا اور چند مرغیاں پال رکھی تھیں اور اکثر چوزے بھی نکلوایا کرتی تھیں، چوزے نکلنے سے ہمارے گھر کی رونق میں مزید اضافہ ہو جایا کرتا۔

مرغی اپنے بچوں کی فوج کو لئے سارے گھر میں گھومتی پھرتی۔ چچا جان اس کو "چوزہ بریگیڈ" کہا کرتے تھے۔ اگر کبھی مرغی اپنے بریگیڈ کے ہمراہ ان کے کمرے میں جا گھستی تو آپ فوراً علی بخش کو آواز دیتے "علی بخش! چوزہ بریگیڈ کی ڈیوٹی کسی دوسری طرف لگاؤ"۔ سردار بیگم چچی جان کا پالتو طوطا بڑے مزے کی باتیں کیا کرتا تھا اور سینا تو انتہا درجے کی باتونی واقع ہوئی تھی اور ایسی ایسی باتیں بنایا کرتی تھی کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ چچا جان اس کو ناپسند کرتے تھے اور "چغل خور" کہا کرتے تھے۔ البتہ طوطے کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے اور بعض اوقات سیٹی بجا کر اسے بلایا بھی کرتے تھے

(خالد نظیر صوفی)

ایک ہی درزی

گرمیوں کا موسم ہوتا تو علامہ مرحوم گھر میں سفید قمیص اور دھوتی پہنتے، سردیاں آتیں تو دُھسا اوڑھ لیتے، البتہ ہائی کورٹ جانا ہوتا یا کسی خاص تقریب میں شمول ناگزیر ہو جاتا تو سوٹ پہن لیتے، شلوار کے ساتھ چھوٹا کوٹ بھی پہنا اور شیروانی بھی۔ سر پر ترکی ٹوپی رکھتے تھے۔ جب ترکی ٹوپیاں ملنی مشکل ہو گئیں تو قراقلی یا سیاہ ٹوپی پسند فرمالی۔ کبھی کبھی پشاوری لنگی اور کلاہ بھی استعمال فرماتے۔ تکلف کا لباس کبھی نہ پہنا تکلف کے تقاضوں سے وہ بالطبع نفور تھے۔ میں نے سنا کہ اوسط عمر میں ایک درزی کو ناپ دے دیا تھا، پھر کبھی ناپ نہ دیا۔ اس سے سوٹ سلواتے رہے۔ ٹرائی کے لئے کبھی درزی کی دکان پر نہ گئے۔ درزی خود ہی پہلے ناپ کو سامنے رکھ کر اندازے کے مطابق خفیف سا رد و بدل کر دیتا۔ مرحوم بے تکلف وہی سوٹ پہنتے رہے۔ کبھی یہ نہ تھا کہ سوٹ عین جسم کے مطابق ہے یا نہیں یا اس میں کہیں کم یا زیادہ ڈھیل ہے، جسے درست ہو جانا چاہیے۔ اللہ تعالے نے ان کا جسم ایسا بنایا تھا کہ کتنا ہی سادہ لباس پہنتے، اس میں زیبائش کی ایک خاص شان نمودار ہو جاتی۔ ان کی یہ سادگی بھی سراسر فطری تھی۔ وہ لباس کو تن پوشی کا

ذریعہ سمجھتے تھے، جو لباس وقت اور ماحول کے مطابق یہ تقاضا پورا کر سکتا، اس پر مطمئن رہتے تھے۔ ایسے معاملات میں مین میکھ نکالنے سے ان کی طبیعت ابا کرتی تھی۔

(غلام رسول مہر)

بازار حکیماں کی محفلیں

جس زمانے میں ڈاکٹر لائیٹنر کے علمی ذوق اور توجہ کی بدولت پنجاب میں اردو کا باغ پھول پھل لا رہا تھا اور "پنجاب سکھشا سبھا" کی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں میرے والد ماجد حکیم شجاع الدین محمد جو اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب، فلسفی اور ادیب تھے اور سخن فہمی اور سخن گوئی سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے، انہوں نے "سکھشا سبھا" کے مفید کارناموں سے متاثر ہو کر "اردو بزم مشاعرہ" کی بنا ڈالی۔ "شور محشر" اس بزم کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے میرے عم زاد بھائی اور فقیر سید نجم الدین کے ماموں حکیم امین الدین (بیرسٹر ایٹ لاء) کے مکان پر منعقد ہوتا تھا۔ رسالے کے ایڈیٹر خان احمد حسین خان مرحوم تھے، جو ایک ناول نگار، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ اس ماہنامے "شور محشر" میں مشاعرے کی روداد بھی شائع ہوتی تھی۔ علامہ اقبال ان مشاعروں میں نہ صرف یہ کہ شریک ہوتے بلکہ اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ اسی بزم کے ایک مشاعرے میں اقبال نے وہ شعر پڑھا جسے سن کر ارباب ذوق چونک پڑے اور بہت دنوں تک ادبی محفلوں میں اس کا چرچا رہا اور آج بھی ان کا یہ شعر پرانے لوگوں کے ورد زبان بلکہ حرز جان ہے ؎

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

والد بزرگوار حکیم شجاع الدین کے انتقال کے بعد حکیم امین الدین اور حکیم شہباز دین نے مل کر "شور محشر" کو جاری رکھنے کی کوشش کی مگر جو نظام ایک بار درہم برہم ہو چکا تھا، پھر وہ جمنے اور مرتب ہونے نہ پایا۔ بزرگوں کے جذب صادق

میں جو برکت اور کشش تھی، نوجوانوں کی ہمت کو وہ میسّر نہ آسکی۔ مگر یہ بزم مشاعرہ ایک عجیب نقش قائم کر گئی۔ وہ صاحبان ذوق، جنہیں اس بزم میں شریک ہو کر ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور باہم مل بیٹھنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اب ہر روز حکیم شہباز دین کے مکان پر جمع ہوتے اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ گھر علم و ادب کے شیدائیوں کا اچھا خاصا کلب بن گیا۔

میرے بزرگ حکیم شہباز دین اور حکیم امین الدین بیرسٹر کے یہاں کی محفلیں اور بیٹھکیں سارے شہر میں مشہور تھیں۔ یہ دونوں مکانات آج بھی آمنے سامنے ہیں اور گزشتہ تہذیب و تمدن کی کتنی ہی داستانیں اپنے در و بام میں لئے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر شام برسوں تک وہ لوگ جمع ہوتے رہے، جن میں سے ہر شخص آسمان ادب و ثقافت کا درخشندہ ستارہ تھا۔

حکیم شہباز دین جسمانی طور پر بہت زیادہ لاغر اور نحیف تھے۔ سچ مچ دھان پان مگر ان کے سینے میں ایک ایسا دل تھا، جو سمندر کی طرح وسیع اور ابر کی مانند فیاض تھا۔ ان کی زبان میں شیرینی، مزاج میں انکسار اور اخلاق میں بڑی وسعت تھی۔ عربوں کی طرح مہمان نواز، خوش خلق اور کشادہ دست۔ ان صفات نے ان کے گھر کو علم و ادب کے درخشندہ ستاروں کا آسمان بنا دیا تھا۔ دور دور سے لوگ ان ستاروں کے دیکھنے اور کسب فیض کے لئے آتے۔ سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی محمد حسین، مفتی عبداللہ ٹونکی، فقیر سید افتخار الدین اور سید محمد شاہ وکیل ان لوگوں میں سے تھے، جو قریب قریب ہر شام کو اس نشست میں جمع ہو جاتے اور ہنسی خوشی کی باتوں میں علم و ادب کے تذکرے چھڑ جاتے۔

حکیم شہباز دین کے یہاں کی اس نشست کے حاضر باشوں میں کچھ بزرگ تو ایسے ہیں، جو بعد میں اس قدر مشہور ہوئے کہ ان کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان میں مولوی احمد دین مرحوم "سرگذشتِ الفاظ" جیسی نادر تصنیف کے نامور

مصنف ہیں۔ شیخ گلاب دین "قانون شریعت و رواج" کے مؤلف ہیں، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، سید محمد شاہ وکیل اور خلیفہ نظام الدین اپنی خموشی طبع اور عزلت نشینی کے باعث منظر عام پر نہ آسکے اور ان کے ذاتی جوہر اور کمالات پر گمنامی کا پردہ پڑا رہا۔ مگر اس علمی مجلس کی وہ روح رواں تھے۔ ان کی جرأت تنقید اور جوہر شناسی نے اس دور کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے ذہن فکر کی تربیت میں حصہ لیا۔ اسی زمانے میں اقبال، جو ابھی تک "علامہ" نہیں ہوئے تھے، جب تک اپنا کلام ان بزرگوں کو نہ سنا لیتے، کسی عام مجلس میں اسے نہ پڑھتے۔ "نالۂ یتیم" "ہلال عید" اور "تصویر درد" جیسی معرکہ آرا اور شہرہ آفاق نظمیں کہنے کے بعد علامہ اقبال نے پہلے ان بزرگوں کو سنائیں۔ اس کے بعد انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھ کر دنیائے اسلام سے خراج تحسین وصول کیا۔

(حکیم احمد شجاع)

فکر سخن

شعر؟

جی ہاں شعر

ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی۔ ہفتوں فکر شعر میں مستغرق رہتے۔ عموماً رات کو پچھلے پہر شعر کہتے۔ ایک عجیب سا کرب ان کے سارے جسم کو محیط ہوتا۔ ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ ان کا چہرہ تمتمانے لگتا، آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور جب شعر یا نظم دماغ میں موزوں ہو جاتی تو پکارتے "علی بخش، کاپی لاؤ، قلم لاؤ، دوات لاؤ، قرآن شریف لاؤ"۔ شعر کہنے یا لکھنے سے پہلے قرآن مجید کے اوراق کھولتے جاتے۔ اس میں کچھ دیکھتے، پھر شعر کہنے لگتے۔ کبھی کبھار قرآن کھولتے ہی چپ ہو جاتے۔ کاپی واپس کر دیتے۔ میں چارپائی پر جا کر سوتا تو آواز آتی۔

"علی بخش آؤ"۔ غرضیکہ ان کے شعر کہنے کا انداز کسی طرح ایک کٹھن سفر سے مختلف نہ تھا۔ میں نے بارہا انہیں روتے دیکھا۔ شعر کہتے جاتے اور روتے جاتے (علی بخش)

ان کے شعر کہنے کی حالت بھی دوسرے شعراء سے کچھ الگ تھی۔ فرماتے تھے کہ سال میں چار پانچ ماہ تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں ایک خاص قوت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے میں بلا ارادہ وہ شعر کہتا رہتا ہوں۔ اس قوت کی موجودگی میں گھر میں دوسرے کام بھی کرتا رہتا ہوں، مگر زیادہ تر طبیعت کا رجحان شعر گوئی کی طرف رہتا ہے۔ ان دنوں عموماً رات کو شعر گوئی کے لئے بیدار رہنا پڑتا ہے۔ میرے استفسار کرنے پر فرمایا کہ میں نے زیادہ سے زیادہ ایک رات میں تین سو اشعار کہے ہیں۔ چار پانچ ماہ بعد یہ قوت ختم ہو جاتی ہے تو غور و فکر کے بعد کچھ شعر کہے جا سکتے ہیں مگر یہ آورد ہوتی اور وہ آمد۔ دونوں طرح کے کہے ہوئے اشعار میں تمیز کی جا سکتی ہے اس حالت کو ڈاکٹر صاحب حمل سے تشبیہہ دیا کرتے تھے اور اس حالت کے اختتام کو وضع حمل سے۔

(حکیم محمد حسن قرشی)

تازہ کلام

چودھری (محمد حسین) صاحب بلاناغہ عموماً رات کو علامہ کے پاس آیا کرتے جب کہ سب ملنے جلنے والے جا چکے ہوتے اور علامہ تنہا ہوتے۔ علامہ چودھری صاحب کو اپنا تازہ کلام سناتے۔ ایک لیمپ کی ماند سی روشنی میں دونوں بزرگ فارسی یا عربی لغت کی موٹی موٹی جلدوں کے صفحے الٹتے۔ اشعار میں مضمون کی یکجہتی، الفاظ کی صحت یا جذبات کی ہم آہنگی پر بحث و تمحیص ہوتی۔ بعض اوقات اسلام، فلسفہ یا سیاست پہ گفتگو ہوتی یا ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ چودھری صاحب بہت کھل کر ہنستے تھے اور آپ کے قہقہوں کی آواز اکثر علامہ کے کمرے میں گونجا کرتی۔ آپ اچھی غذا کے نہ صرف شوقین تھے، بلکہ خوب کھاتے تھے۔ جن دنوں علامہ علیل تھے اور اطباء کے مشورے پر انہوں نے مرغن غذائیں کھانی بند کر رکھی تھیں، تو علامہ اکثر بریانی، قورمہ، مرغ مسلم اور کباب پکواتے اور اپنے روبرو چودھری صاحب کو کھلواتے۔

اور آپ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔

(ڈاکٹر جاوید اقبال)

شہرت

دوسری گول میز کانفرنس (لندن) کے موقع پر ڈاکٹر صاحب کی ناک میں کاربنکل کا چھوٹا سا پھوڑا نمودار ہوا۔ ڈاکٹر قریشی نے اس کے علاج کے لئے ایک اسپیشلسٹ کا انتظام کیا۔ جس نے مشورہ دیا کہ کسی تاخیر و تامل کے بغیر ان کا آپریشن ہونا چاہیئے۔ علامہ نے نرسنگ ہوم جانے اور آپریشن کرانے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر قریشی نے اس پر شدید اصرار کیا اور کہا "مرض خطرناک ہے۔ اگر خدانخواستہ نصیب دشمناں جان لیوا ثابت ہوا تو جس طرح آپ فیمس (Famous) ہیں اسی طرح میں بھی فیمس ( ) ہو جاؤں گا اور دنیا بھر میں میری شہرت نہیں، تشہیر ہو گی کہ میں آپ کی صحیح طور پر دیکھ بھال نہیں کر سکا۔"

ڈاکٹر صاحب اس پر بے ساختہ مسکرا دیئے۔ پھر بولے "میں لکھ کر رکھے دیتا ہوں کہ اس کی ذمہ داری آپ پر بالکل نہیں۔

راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ ہے اور والد صاحب سے بھی بارہا سنتا رہا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب علاج کی سخت پابندیوں سے بہت گھبراتے تھے۔ انہیں علاج کا سہل ہونا پسند تھا۔ لذیذ دوائیں شوق سے استعمال فرما لیتے۔ ایک بار حکیم نابینا نے سردے کھانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اس سے آواز درست ہو جائے گی، تو سردے نہایت ہی شوق سے کھاتے۔

(فقیر سید وحید الدین)

تزکیہ نفس

پھلوں میں علامہ اقبال کو آم بہت مرغوب تھے، مگر مالدہ آم پسند نہ تھے۔ اس کے

برخلاف سردار چچی جان (والدہ جاوید) کو مالدہ آم پسند تھے۔ بازار سے جب کبھی آم منگوائے جاتے تو چچا جان اپنی پسند کے آموں کے لئے کبھی فرمائش نہ کرتے۔ ان کے بعض احباب آموں کی فصل میں آم بھیجا کرتے۔ جب آموں کی پیٹی کھلتی تو علی بخش سے کہتے کہ سب سے اچھا آم چن کر مجھے دو۔ وہ جب اپنی پسند کے مطابق آم منتخب کر کے علامہ کو دیتا تو علی بخش سے کہتے کہ اس آم کو تم کھالو۔ مرغوبات نفس کے خلاف یہ وہ طرز عمل ہے جو تزکیہ نفس کے لئے صوفیا کرام کا شعار رہا ہے۔

(شیخ اعجاز احمد)

علامہ اقبال کے تذکرہ نگاروں نے ان کی سادگی غذا کا ذکر کیا ہے۔ علامہ کو کھانوں میں، کچھ شک نہیں، بعض چیزیں مرغوب تھیں اور جوانی میں انہیں بڑے شوق سے کھاتے تھے، مگر وہ ع

تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

کے ہرگز قائل نہ تھے۔ ۱۹۲۰ء میں اپنے والد کو انہوں نے خط میں لکھا: "روحانی کیفیت میں سب سے بڑا ممد و معاون کھانے پینے میں احتیاط ہے۔ نبی کریمؐ کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔ میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے معاملات میں اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں

(فقیر سید وحید الدین)

فنا و بقاء

پہلی ملاقات کے بعد مجھے بارہا علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا۔ ایک مرتبہ انسانی جسم کی ساخت، اس کی قوت طبیعی اور انحطاط کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ موضوع بحث یہ تھا کہ روح غیر فانی ہے اور جسم فانی ہے۔ علامہ نے اس موقع پر فرمایا کہ انسانی جسم کے لیے بھی غیر فانی حیثیت اختیار کر لینا ممکن ہے۔ پاس بیٹھے ہوئے ہر شخص کو تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں ڈال دیا۔ (ممتاز حسن)

طرزِ گفتگو

علامہ اقبال کو اگرچہ مختلف زبانوں پر اس قدر عبور تھا کہ جس موضوع پر جس زبان میں چاہتے، گھنٹوں گفتگو کر سکتے تھے، لیکن ان کی عام گفتگو کسی قسم کے تکلف اور پابندی سے آزاد تھی۔ گفتگو کرتے وقت اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے جس زبان کا لفظ (مخاطب کی علمی حیثیت کے لحاظ سے) موزوں سمجھتے، بلا تامل استعمال کر لیتے۔ گویا ان کا مفہوم کسی خاص زبان کا پابند نہ ہوتا اور نہ وہ مفہوم کے اظہار اور الفاظ کے استعمال میں کسی خاص زبان کی محتاجی یا اجارہ داری کے قائل تھے۔

(ممتاز حسن)

سادگی

ایک دن علامہ اقبال حسب معمول بنیان پہنے اور تہبند باندھے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے اور احباب سے تبادلۂ خیال جاری تھا۔ میں بھی اس صحبت میں شریک تھا۔ اتنے میں دو قدآور فوجی جوان، جو وضع قطع سے شمالی پنجاب کے کسی ضلع کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے، وہاں آئے اور بڑی خاموشی کے ساتھ خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نے مجھ سے سوال کیا، ترجمان حقیقت، حضرت علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی، بیرسٹرایٹ لا، ممبر پنجاب لیجسلیٹو کونسل کہاں ہیں۔ مجھے اس سوال پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ایک صاحب نے ہنسنے کا سبب پوچھا تو میں نے کہا، یہ صاحب ترجمان حقیقت، حضرت علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال . . . . کی تلاش میں ہیں، وہ ان کو ابھی تک نہیں مل سکے۔

اس پر اقبال کے پرانے دوست اور اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر محمد شفیع نے ان نوجوانوں کی طرف دیکھا اور اقبال کی طرف اشارہ کر کے کہا، یہ کون بیٹھا ہے۔

ایک قہقہہ پڑا اور قہقہہ لگانے والوں میں خود علامہ بھی شامل تھے۔ اس قہقہے کے انداز

سے وہ نوجی نوجوان سمجھ گئے، کہ ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال .... جن کی تلاش میں وہ ہیں، ان کے سامنے بیٹھے ہیں۔ یہ بیچارے تو علامہ اقبال کی شہرت و عظمت کا ایک تصور لے کر آئے تھے کہ علامہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ تزک و احتشام سے رہتے ہوں گے۔ دولت کدے پہ چوکی پہرہ ہوگا اور علامہ سے ملنے میں دشواری پیش آئے گی۔ مگر یہاں ان کو ہر طرف قلندریت نظر آئی۔ بے تکلفی کا ماحول اور سیدھی سادی زندگی۔

(ممتاز حسن)

معاشرتی بحثوں میں وہ ہمیشہ سادہ زندگی اختیار کرنے کی تلقین فرماتے، بلکہ حضور رسالت مآب کی سادہ زندگی کو اپنا اسلوب بنانا چاہتے۔ جب میری درخواست پر انارکلی سے میکلوڈ روڈ پر اٹھ آئے تو میں نے ان سے مکان کی آرائش کرنے کے لئے کہا کہ وہ اس کے بڑے کمرے کو ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم میں تقسیم کر دیں۔ مگر انہوں نے فرمایا کہ وہ کسی قسم کے بے معنی تکلفات میں الجھنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ کوٹھی میں منتقل ہونے کے باوجود انہوں نے اپنا معاشرتی اسلوب وہی رکھا، جو انارکلی کے دوران تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے کمروں کو مغربی فیشن کے مطابق آراستہ نہیں کیا، بلکہ اس میں ایک خاص اندازِ بیتّی نظر رکھتے۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے نشست کے کمروں کی کیفیت یہ تھی کہ فرش پر قالین بچھا رہتا اور کرسیاں دیوار کے چاروں طرف لگی رہتیں۔ ڈاکٹر صاحب خود فرش پر تشریف رکھتے۔ برآمدے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں ایک چارپائی پڑی رہتی تھی۔ گرمیوں کے دنوں میں آپ اس کمرے میں آرام فرماتے تھے۔

(مرزا جلال الدین)

سادہ کپڑوں میں سیدھی سادی چارپائی پر آرام کرسی پہ بیٹھے رہتے اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ سیاسی اکابر، وکلاء، علماء، کالجوں کے پروفیسر، اخباروں کے ایڈیٹر، شعرائے و اد باء، طالب علم، ان پڑھ اور پڑھے لکھے عقیدت مند، فقیر اور درویش، غرضیکہ ہر قسم اور ہر طبقہ کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر رہتے۔ معمولی معمولی جھگڑوں سے لے کر قانون، فلسفہ، سیاست، دین اور سائنس کے بلند ترین مسائل زیر بحث آتے۔ اقبال

ان سب پر اپنی وسیع معلومات سے روشنی ڈالتے اور ہر شخص آپ کے علم و فضل سے مرعوب ہو کر جاتا۔ آپ کی مجلس میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہ تھا۔ معمولی سے معمولی آدمی بھی آپ کے پاس بیٹھ جاتا اور جس وقت تک جی چاہتا، بیٹھا رہتا۔ صاف صاف کہنا تو درکنار، ڈاکٹر صاحب اپنی کسی حرکت سے بھی اکتاہٹ کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے۔

(شیر محمد اختر)

ایک دفعہ بیگم صاحبہ نے علامہ صاحب کے لئے ریشمی رضائی تیار کی۔ جب انہیں اوڑھنے کو دی گئی تو لینے سے انکار کر دیا۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ آپ کے پاس بڑے بڑے آدمی آتے ہیں، اس لئے آپ کا بستر اچھا ہونا چاہیئے۔ جواب میں فرمانے لگے۔ ظاہری نمائش سے مجھے اپنی سہولت اور آرام زیادہ عزیز ہے۔ اس لئے مجھے کھدر کے استر والی پرانی رضائی دے دی جائے۔ کھدر زیادہ گرم ہوتا ہے اور مجھے وہی درکار ہے۔

(علی بخش خادم اقبال)

علامہ اقبال ایک بار گھر کی صفائی ستھرائی پر گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اسلام نے صفائی پر کتنا زور دیا ہے۔ پھر دانتوں کی صفائی کے لئے مسواک کے فوائد کا ذکر کیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک خط میں شیخ صاحب نے علامہ صاحب سے دریافت کیا کہ اب تو اچھے اچھے ولایتی منجن ملتے ہیں۔ کیا وہ مسواک کا نعم البدل نہیں ہو سکتے؟ اس کے جواب میں علامہ نے لکھا۔ مسواک سے میری مراد دیسی مسواک تھی، نہ کہ انگریزی طرز کے منجن اور برش کیونکہ یورپ کی بنی ہوئی بعض چیزیں خوبصورت ضرور ہوتی ہیں، مگر ان میں اخلاقی زہر ہوتا ہے، جس کا اثر آجکل کے مادہ پرست مزاج رکھنے والے انسان فوراً محسوس نہیں کر سکتے۔

یورپ کے قیام کے دوران میں ہو سکتا ہے کہ دیسی مسواک نہ ملنے کے سبب علامہ اقبال نے انگریزی منجن وغیرہ استعمال کیا ہو، لیکن لاہور میں، ان کے غسل خانے میں ایک دیسی مسواک ہمیشہ ہوتی تھی۔ مسواک کا استعمال اس لئے مبارک اور مفید ہے کہ اس میں سنت رسولؐ کا اتباع مضمر ہے۔ یہی مقدس جذبہ تھا، جس نے مسواک کو علامہ کی نگاہ میں محبوب بنا دیا تھا۔

(فقیر سید وحید الدین)

حقّہ نوشی

صبح و شام حقہ پیتے۔ اس حقہ کے لئے مجھے ان کے قریب رہنا پڑتا۔ ان کے کمرے سے ملحق میرا کمرہ تھا۔ کئی کئی دفعہ آواز دیتے "علی بخش حقہ بھر دو، چلم میں آگ رکھو"۔ وہ رات کا زیادہ تر حصہ جاگ کر گزارتے تھے۔ مجھے بھی جاگنا پڑتا۔ ہمیشہ یہ فکر رہتی کہ جانے کب آواز دیں۔ پہلے تو میں ایک خدمت گزار اور وفادار کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے اپنا نظریہ بدل لیا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں کسی آقا کی خدمت نہیں کر رہا، بلکہ ایک عظیم انسان کا خدمت گزار ہوں، جس کے شب و روز انتہائی درد و اضطراب میں بسر ہوئے ہیں۔

میں ان کی رفاقت میں بچے سے بوڑھا ہو گیا اور اب سمجھئے کہ گور کنارے ہوں زندگی کے چل چلاؤ کا زمانہ ہے، لیکن مجھے وہ آج بھی اپنے سامنے ہی نظر آتے ہیں۔ جاوید میاں کے لندن جانے پر بھی جاوید منزل میری تحویل میں رہی۔ میں نے سالہا سال تنہا پایا، لیکن مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ جیسے حضرت علاّمہ مجھے پکار رہے ہیں۔

"علی بخش کہاں ہو؟
حقّہ تازہ کرو
آگ بھرو
کاغذ لاؤ"

اور پھر

"گرامی صاحب کے لئے کیا پکایا ہے،
چودھری صاحب ابھی تک نہیں آئے"

اور میں نے بارہا، ان کے کمرے کی دیواروں سے کان لگا کر ان کی آواز سننے کی کوشش کی ہے، میں نے ان کی آوازیں سنی ہیں۔

(علی بخش)

علامہ اقبال کو دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ دلچسپی حقے سے تھی۔ ان کے والد اور بڑے بھائی بھی حقے کے بڑے شوقین تھے۔ ۱۹۱۲ء میں ان کے والد کیمبل پور میں تعینات تھے۔ ان ہی دنوں عدالت عالیہ کے بند ہو جانے پر علامہ اقبال اپنے وطن سیالکوٹ تشریف لائے ہوئے تھے۔ اتفاق کی بات کہ کیمبل پور سے ایک شخص آیا اور علامہ کو مقدمے کی پیروی کے لئے کیمبل پور لے جانا چاہا۔ علامہ اقبال سفر سے بہت جی چراتے تھے، لیکن اس خیال سے کہ اس بہانے بڑے بھائی سے کیمبل پور میں ملاقات ہو جائے گی، مقدمہ لے لیا اور علامہ کیمبل پور پہنچ گئے۔

واپسی پر آدھی رات کے قریب وزیر آباد جنکشن سے سیالکوٹ کے لئے گاڑی بدلنی تھی، جو صبح پانچ بجے چلتی تھی۔ سیالکوٹ جانے والی گاڑی میں علامہ آکر بیٹھ گئے۔ اب انہیں حقے کی طلب ہوئی۔ قلی جو سامان اٹھا کر لایا تھا، اس سے کہا کہ اگر اس وقت کہیں سے حقہ لے آؤ تو تمہیں انعام ملے گا۔ قلی انعام کے لالچ میں الٹے پاؤں واپس ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک بوسیدہ سا حقہ لے کر آ گیا۔ اس حقے کی ہیئت یہ تھی کہ مٹی کا پیندا اور ٹوٹی ہوئی چلم۔ کہنگی اور بوسیدگی میں یہ حقہ اپنی مثال آپ ہی تھا۔ مگر علامہ اقبال اس حقے کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے بندھے ہوئے بستر کو پلیٹ فارم پر رکھوایا۔ اس پر بیٹھ کر حقے کے کش لگانے لگے۔ قلی بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور علامہ اقبال حقہ پیتے ہوئے اس قلی کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ جب علامہ حقہ پی کر سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں آ گئے تو میں نے کہا کہ حقہ تو بہت گندا تھا، نہ جانے قلی کہاں سے، کس کا اٹھا لایا تھا۔ علامہ نے اس کے جواب میں کہا کہ جس کو تمباکو کی عادت پڑ جائے اسے طلب کے وقت ان نزاکتوں کا خیال ہی نہیں آتا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد فرمایا۔ تم اس کی عادت نہ ڈالنا۔ (شیخ اعجاز احمد)

صحت اور مذہب

علامہ اقبال خاندان کے نوجوانوں کو جسمانی ورزش کی تاکید فرمایا کرتے۔ ایک مرتبہ

وہ سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ لعل دین پہلوان ان سے ملنے کے لئے آئے جو شیخ صاحب کے محلے کے قریب رہتے تھے اور وہیں ان کا اکھاڑہ تھا۔ علامہ نے شیخ صاحب کو ان کے سپرد کیا اور روزانہ اکھاڑے جاکر کسرت کرنے کی تائید کی۔ علامہ اکثر تاکید کے ساتھ فرمایا کرتے کہ جہاں تک ہو سکے۔ زندگی کو باقاعدہ اور سادہ بنانے کی کوشش کرو۔ جوانی کی توانائی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے تاکہ صحت دیر تک قائم رہے۔ جسمانی اور روحانی صحت کی ضامن مذہبی زندگی ہے۔ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کی بہت تاکید فرماتے تھے کہ ان کی صحبت میں اکسیر کی تاثیر ہے۔

(فقیر سید وحیدالدین)

غریب پروری

میرے آقا بہت غریب پرور تھے۔ اگرچہ بہت امیر نہ تھے کہ غریبوں کی عام مدد کر سکتے، مگر جو بھی تنگ دست آتا، تو اس کی مدد ضرور کرتے، خواہ انہیں منشی طاہر دین سے کچھ ادھار لے کر حاجت مندوں کی ضرورت پوری کرنا پڑتی۔ یہ عجیب بات تھی کہ جب قرض لینے والا اپنا قرض واپس کرنے کے لئے آتا تو لینے سے انکار کر دیتے تھے۔

کوئی فقیر مانگنے کے لئے آتا، تو اس کے چہرے سے اس کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کرتے اسے مایوس نہ کرتے۔ کئی سائل چپکے سے عرض حال کرنے آجاتے۔ کہتے علی بخش انہیں کہو، پھر کبھی آنا۔ جب وہ باہر چلا جاتا تو مجھے کہتے، دور جاکر اسے یہ روپیہ دے آؤ۔ یہ خبر نہ ہونے دینا کہ میں نے بھجوائے ہیں۔

(علی بخش)

روپے پیسے کے معاملے میں بے حد دیانت دار اور محتاط تھے۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کا پونے دو سو روپے ماہوار کرایہ دیا کرتے تھے۔ ہزار دفعہ عرض کیا کہ یہ کوٹھی اتنے کی نہیں، آپ کیوں روپیہ برباد کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ یہی کہتے کہ یہ کوٹھی ایک

ہندو بیوہ کی ہے، جس کے بچوں کی گزران اسی کے کرائے پر ہے۔ مجھے کرایہ کم کرنے کی تحریک کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو نہایت پابندی سے پونے دو سو روپے اس بیوہ کو بھیج دیا کرتے تھے۔

(عبدالمجید سالک)

زندہ دلی

علامہ اقبال کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہ تھا۔ شیلے کو شلی کہتے تھے اور اردو فارسی بھی حد درجہ پنجابیت لئے ہوئے لہجے میں بولتے تھے۔ قاف کو کاف ہی کہتے تھے اور حقّہ کو حکہ ..... لباس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ کالج یا ہائی کورٹ میں انگریزی سوٹ پہن کر جاتے تھے تو وہ بھی ڈھیلا ڈھالا، بغیر استری کے ٹائی ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی ہی سہی۔ عام طور پر بندھی بندھائی جو چپکا لیا کرتے تھے۔ بوٹ میلے ہیں تو کچھ پروا نہیں۔ بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے پیچھے کو برش کر لیا کرتے تھے ..... باوجود اس کے کہ ہماری اس سال کی بی اے کی جماعت جو شروع سنٹرل ماڈل اسکول سے ہی اپنی شرارت پسندی کے لئے مشہور چلی آتی تھی اور خصوصاً بڑے تلفظ والے پروفیسر کا تو ناک میں دم کر دیا کرتی تھی۔ ان کے گھنٹے میں اس قدر خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھی کہ ایک تنکا بھی زمین پر گرے اور اس کی آواز سنائی دے جائے۔ مجھے یاد نہیں کہ اقبال نے کبھی کسی لڑکے کو کسی قصور پر سزا دی ہو، بلکہ دھمکی تک کبھی نہیں دی۔ حیرت کی بات ہے کہ میں نے علامہ کو سگریٹ یا سگار پیتے کبھی نہیں دیکھا۔ گو سنا ہے کہ حقّہ کے بہت شوقین تھے۔ کالج میں تو بغل میں ایک آدھ کتاب یا کلاس کا رجسٹر لئے، سر جھکائے کبھی گنگناتے ہوئے، ادھر ادھر جاتے دکھائی دیتے تھے، کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے۔ ہاں البتہ فرصت کے اوقات میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ محفل جماتے اس دوران احباب ان کی زندہ دلی پر جھوم جھوم جاتے۔

(میاں عطاء الرحمٰن)

یادیں

ان دنوں حضرت اقبال اسلامیہ کالج میں پروفیسر تھے اور انار کلی کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ میں بھی ان دنوں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا اور ان کے نام اور مرتبے سے واقف ہو چکا تھا۔ ایک دن کچھ دوستوں کی رائے ہوئی کہ مثنوی کے کچھ اشعار کی تشریح کے لئے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیئے۔ میں خود بھی اس موقع کی تلاش میں تھا، مگر تنہا جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بہر حال جب دوسرے دوست تیار ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ جب ہم ان کے مکان پر پہنچے تو ڈاکٹر صاحب کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میں ڈرتا ڈرتا اندر داخل ہوا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت ایک سوٹ پہنے ہوئے تھے، سر پر ترکی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں حقّے کی نے۔ ہمیں دیکھ کر وہ تھوڑا سا مسکرائے اور پھر مثنوی کے اشعار کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔ اب اچھی طرح یاد نہیں کہ کون سے شعر گفتگو کا موضوع تھے۔ تاہم اس گھڑی ڈاکٹر صاحب کا متبسم چہرہ اور شیریں کلامی ہمیشہ کے لئے میرے دل میں اتر گئی۔ ان کی ذات کی یہ خوبی ایسی تھی، جو ہر آدمی کا دل موہ لیتی تھی۔ مجھے ان کی باتوں کی مٹھاس آج بھی مزہ دیتی ہے۔

(سلامت اللہ شاہ)

ایک روز میں نے بعض سیاسی لیڈروں کا ذکر کیا۔ جوش میں آکر فرمانے لگے۔ یہ لوگ سب خود غرض ہیں اور ایثار نہیں کر سکتے۔ لیڈر امیروں کی جماعت میں موجود ہی نہیں۔ مسلمانوں کے لیڈر عوام میں پیدا ہوں گے۔ تم دیکھ لینا، ایسا ہو کر رہے گا، پھر وہ لوگ رہنمائی کر سکیں گے۔

ایک دفعہ ان کی شاعری کے پیغام اور اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق وغیرہ کا ذکر آگیا تو انگریزی میں فرمایا کہ وسط ایشیا کے قلب پہ ایک پپڑی (crest) جمی ہوئی ہے۔ میں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہوں

(میاں بشیر احمد)

ایک روز حضرت علامہ کیمبرج کی باتیں کر رہے تھے کہ فرمایا: کیمبرج کے زمانے میں چند ہمعصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی ایک صاحب پوچھنے لگے۔ مسٹر اقبال! یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیانِ مذہب دنیا میں آئے، وہ بلا استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ یورپ میں ایک بھی پیدا نہ ہوا۔ میں نے جواب دیا " بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پینترا جما لیا۔ اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو۔ اسی لئے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں۔ ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ وہ صاحب بول اُٹھے " تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے! میں نے جواب دیا " یہ تمہارے میکاؤلی اور مشور اہلِ سیاست، اس کے رسول ہیں۔

(پروفیسر خواجہ عبدالمجید)

علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کا دوسرا موقعہ مجھے ۱۹۳۰ء میں ملا۔ لاہور میں ہم لوگوں نے ایک مجلس اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ خواجہ عبدالوحید (مصنف کتابیات اقبال) اس کے سیکرٹری تھے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ علامہ اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے یوم اقبال منایا جائے۔ یہ براعظم ہند و پاکستان میں پہلا یوم اقبال تھا۔ ہم اس سلسلے میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ ایک شام ہوٹل سٹفلز (واقع شاہراہ قائداعظم) میں عقیدت مندوں کے ساتھ چائے پئیں۔ علامہ نے یہ دعوت قبول فرمالی۔

گفتگو سے نطع نظر، سٹفلز میں ان کی آمد، ان کا حلیہ، مشہدی لنگی وغیرہ تمام جاذب نظر تھیں۔ ان کی شخصیت میں تمکنت اور وقار تھا۔ یہ مجلس بھی باثر اور ایک یادگار موقعہ تھا۔ اس مجلس میں علامہ اقبال نے تقریر بھی کی۔ اس کا خلاصہ جو مجھے یاد ہے، وہ یہ ہے، میں شاعر نہیں ہوں، شعر شناس ہوں اور حکمت زندگی اور حکمت دین کا طالبعلم ہوں، میری آرزو ہے کہ میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اسرار منکشف کر جاؤں، تاکہ وہ دین کے قریب آجائیں۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

زندگی اور موت

۱۹۲۸ء میں جب میں کشمیر جا رہی تھی، چند روز لاہور میں ٹھہرنا ہوا۔ ہمارے ہوٹل کے بازو میں سر محمد اقبال کا مکان تھا۔ بیرسٹر صاحب (سید ہمایوں مرزا) ان سے ملنے گئے اس کے بعد مجھے چائے پر بلایا۔ میں ان کی بیوی سے ملی۔ جاوید ان دنوں بہت چھوٹے تھے۔ میں نے اثنائے سفر ریل میں "نورجہاں" پر ایک نظم لکھی تھی اور اس کا تذکرہ چائے کے دوران علامہ صاحب سے بھی کیا۔ انہوں نے نظم کی اصلاح کرنے کی ہامی بھرلی میں نے نظم بھیجی اور انہوں نے اصلاح دے کر مع خط کے ہوٹل میں نظم بھجوادی۔ میں اس خط سے بہت متاثر ہوئی۔ بعد میں میرے اور سر محمد اقبال کے درمیان خط و کتابت رہا کرتی تھی۔ پردہ کی سختی کی وجہ سے میں ملاقات نہ کر سکی۔ حالانکہ میرے شوہر مرحوم سید ہمایوں مرزا بھی اس موقع پر میرے ہمراہ تھے۔ میں نے ایک آٹوگراف البم میں علامہ صاحب کے دستخط لئے۔ آپ نے اس البم پر لکھا۔

"اسلام کی تعریف میں چند الفاظ ظاہر کرتا ہوں۔ یعنی ذات باری تعالےٰ پر پورا بھروسہ ہے اور موت سے مطلق نہیں ڈرتا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں موت کا ڈر نہیں تھا۔ ۲۸ء میں انہوں نے آٹوگراف کے ساتھ جو کچھ لکھا، وہی آخر وقت میں بھی زبان سے نکلا۔ ایک غزل میں جو اقبال کے مجموعوں میں شامل نہیں، یہ شعر بھی ملتا ہے ؎

موت یہ میری نہیں، میری اجل کی موت ہے
کیوں ڈروں اس سے کہ مر کر پھر نہیں مرنا مجھے

(بیگم صغرا ہمایوں)

میں بعض ذاتی تاثرات کی بنا پر حیات بعد الموت کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ جیسے ہی میرے منہ سے لفظ موت، نکلا، علامہ نے کسی تامل کے بغیر فرمایا۔ موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اصل حقیقت زندگی ہے۔ موت نہیں۔ یہ گفتگو انگریزی میں ہوئی۔

علامہ نے اس موقع پر انگریزی کے جو فقرے کہے، وہ یہ تھے۔

"Death does not exist. It is life that is the predominant reality, not death."

"وجود باری" کی طرح علامہ اقبال نے یہ بات بھی اسی قدر قطعیت اور یقین سے کہی کہ مجھے مزید گفتگو کی جرأت نہ ہوئی اور اس کے بعد میں اپنا کوئی شک و شبہ پیش ہی نہ کر سکا۔ علامہ اقبال کے ساتھ پہلی ملاقات کی یہ گفتگو مجھے کبھی نہ بھول سکے گی اور ہمیشہ میرے دل و دماغ پر نقش رہے گی۔

(ممتاز حسن)

تبلیغ اسلام

ڈاکٹر محمد اقبال ایک پختہ دماغ عارف اور حکیم تھے۔ آپ جب بھی کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے تھے، اس کے تعلق میں کلیات و تخیلات کا اور ان کے ساتھ ہی مثالوں اور حوالوں کا ایک موّاج دریا آپ کے دماغ سے اٹھتا تھا اور زبان سے بہ جاتا تھا۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو راقم الحروف، موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ حقہ سامنے رکھا تھا۔ رسمی مزاج پرسی ہوئی اور اس کے بعد تبلیغ اسلام کے عنوان پر گفتگو شروع ہو گئی۔

"آپ ایک کتاب لکھئے" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"کیسی کتاب؟" میں نے پوچھا۔

"تحقیق کرنے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ ہندوستان کے قصبات اور دیہاتوں میں ہزارہا غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص از خود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور ان سے قبول اسلام کی وجوہ دریافت کر کے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اس سے تبلیغ اسلام کے مقصد کو

بے حد تقویت حاصل ہو گی"۔

"کیا صداقت اسلام کے متعلق پہلے دلائل ناکافی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کافی ہیں، مگر ایسا کرنے سے کئی عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی"۔

اس کے بعد خود علامہ صاحب نے میرے اصرار پر لارڈ ہیڈلے اور لیڈی بارنس ایسے دو نو مسلموں کے قبول اسلام کے واقعات بیان فرمائے (صاحب ملاقات نے یہاں سے ان واقعات کو تفصیل سے لکھا ہے، جو کئی صفحات پر مشتمل ہیں) دوسرے روز علامہ صاحب نے اسلام اور تبلیغ اسلام کے متعلق سیر حاصل بحث فرمائی، جو ایک الگ موضوع کی حامل ہے۔ اس گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر محمد اقبال کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے۔

(قاضی عبدالمجید قریشی)

شعر اور قرآن

۱۹۲۵ء کا ذکر ہے، میں علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر تلاش معاش کے سلسلے میں لاہور، اپنے نانا مرحوم کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ والد مرحوم بھی کچھ عرصہ کے لئے لاہور آئے ہوئے تھے۔ میرے نانا مرحوم کو فارسی شاعری سے گہری نسبت تھی۔ خود تو شعر نہیں کہتے تھے، لیکن شعر کا ذوق بہت اچھا تھا۔ والد مرحوم فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

ایک روز نانا مرحوم کی کوٹھی کے پائیں باغ میں والد صاحب، میں اور نانا مرحوم بیٹھے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں شعر و سخن کا ذکر شروع ہو گیا۔ والد صاحب نے علامہ اقبال کا یہ مشہور شعر پڑھا ؎

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است اینجا
قسمت بادہ باندازہ جام است اینجا

شعر سن کر نانا مرحوم بے ساختہ داد دینے لگے۔ والد مرحوم نے بھی جھوم جھوم کر شعر دہرایا۔ میں خاموش رہا۔ نانا مرحوم اور والد صاحب کی وارفتگی کو دیکھ کر مسکرا دیا

مجھے مسکراتا دیکھ کر نانا مرحوم مجھ پر برس پڑے، شاعر کتنے ہو اپنے آپ کو، ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی گدھے کے گدھے ہی رہے۔ اتنا اچھا شعر پڑھا ہے، تمہارے والد نے اور تم داد دینے کی بجائے مسکرا رہے ہو۔ غور تو کرو، کتنا اچھا شعر ہے علّامہ کا۔،

مجھے کچھ شرارت سوجھی اور میں نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ مجھے یہ شعر پسند نہیں آیا۔

"کیا کہتے ہو؟ سنا نہیں تم نے شاید"۔ نانا اس طرح چلاّئے، جیسے میں نے قرآن کی کسی آیت کو جھٹلا دیا ہو۔

"مجھے شعر میں بیان کئے ہوئے نظریے ہی سے اختلاف ہے" میں نے مزید شرارت کی۔

"کیا اختلاف ہے، آپ کے علی گڑھی نظریے کو علاّمہ کے اس پیارے سے شعر سے؟" والد مرحوم بھی بگڑے۔

"تضاد ہے علامہ کے اس شعر میں"! میں نے یونہی بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔ نانا غصّے سے چلاّئے، کیا تضاد ہے؟

اور میری شرارت دھری کی دھری رہ گئی۔ شرارت سے کہے ہوئے جملے گلے کی پھانس بن گئے۔ کہاں علاّمہ کا بصیرت افروز شعر، میں کیا تنقید کر سکتا تھا، حکیم مشرق کے شعر پہ۔ میں خاموش ہو کر بوٹ کی نوک سے زمین کریدنے لگا۔ اسی دوران میاں نظام الدین مرحوم تشریف لے آئے۔ انہوں نے آتے ہی علاّمہ کی علالت کی خبر سنائی۔ جسے سنتے ہی نانا مرحوم اور والد صاحب عیادت کو جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے اس وقت تک علاّمہ کو قریب سے نہیں دیکھا تھا اور مجھے خود ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اشتیاق تھا۔ لہٰذا فوراً تیار ہو گیا۔

شام کے کوئی پانچ بجے تھے، جب ہم "جاوید منزل" پہنچے۔ علاّمہ اپنے پلنگ پہ کوٹھی کے لان میں آرام فرما رہے تھے۔ کچھ آرام کرسیاں پلنگ کے قریب رکھی تھیں۔ علاّمہ کے گلے میں تکلیف تھی۔ البتہ وہ پہلے سے بہتر تھے اور بہت ہی کسل مند نظر آ رہے تھے۔

جب ہم سب کرسیوں پر بیٹھ گئے اور مزاج پُرسی ہو چکی تو علامہ نے مجھے نووارد دیکھ کر نانا صاحب سے پوچھا کہ یہ نوجوان کون ہے ؟

" میرے بڑے لڑکے ہیں۔ علی گڑھ سے ایم اے کیا ہے۔ فکر معاش میں ہیں۔ نانا کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں "۔ والد صاحب نے تعارف کرا دیا۔

میں نے نہایت ادب سے جُھک کر سلام کیا۔

اس موقع پر نانا مرحوم کو نہ جانے کیا سوجھی۔ میری طرف غصّے سے دیکھا اور فرمایا علی گڑھ نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ گستاخ ہو گیا ہے۔ آپ کے شعر پر اعتراض کرتا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میرا سر ندامت سے جُھک گیا۔

" میرے کون سے شعر پر آپ کو اعتراض ہے۔ علامہ کی پیار بھری آواز نے مجھے چونکا دیا۔

" آپ کے شعر پر میں کیا اعتراض کر سکتا ہوں ؟ میں کیا اور میری بساط کیا "؛ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

" دیکھو بیٹا ! جو بات کسی کے منہ پر نہ کہہ سکو، وہ اس کی غیر حاضری میں کبھی نہ کہو۔ میرا شعر قرآن کی آیت تو نہیں، جو اس پر اعتراض نہ ہو سکے۔ اگر تمہیں کوئی شک ہے، تو اس کا رفع ہو جانا بہتر ہے "؛ علامہ نے آہستہ آہستہ رُکتے رُکتے کہا۔ اور مجھے اپنی شرارت پر افسوس ہونے لگا۔ میں نے ندامت سے اپنا سر جھکا لیا۔ بعد ازاں میں نے علامہ کی حوصلہ افزائی پر شعر کے محاسن اور اپنی شاعری کے بارے میں ان سے کھل کر باتیں کیں۔ (کرنل صلاح الدین گوہر حزیں)

ختمِ نبوّت

۱۹۳۵ء کے موسمِ گرما میں ختمِ نبوّت کی بحث گرم تھی۔ علامہ مرحوم نے اس سال

مئی میں قادیانیوں کے خلاف ایک بیان دیا تھا، جس نے اس جماعت کے دونوں فریقوں کو ڈاکٹر صاحب سے ناراض کر دیا تھا۔ یاد نہیں ان دنوں میں علامہ نے مجھے کس غرض سے طلب کیا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ گفتگو زیادہ تر ختم نبوت کے مسئلہ پر ہوئی تھی۔ آپ نے مقام نبوت پر اظہار خیال کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سیرت سے ایک واقعہ بیان فرمایا اور کہا، حضرت ابوبکرؓ سے کسی نے پوچھا "کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ زیادہ محبت ہے یا اللہ کے رسولؐ کے ساتھ؟" ایک خشک زاہد تو عموماً یہی جواب دیتا کہ مجھے اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہے، کیونکہ رسولؐ کے ساتھ زیادہ محبت اس کے نزدیک شرک ہوگی۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا "مجھے اللہ کے رسولؐ کے ساتھ زیادہ محبت ہے۔" کہنے لگے کہ رسول اللہ کی بعثت سے پہلے ہم بھی یہیں تھے اور اللہ بھی یہیں تھا۔ اس نے ہم کو پوچھا۔ نہ ہم نے اس کو پہچانا۔ اب جو اللہ کا رسولؐ آگیا تو ہم نے اللہ کو پہچان لیا اور اللہ نے ہم کو پہچان لیا۔ علامہ نے فرمایا کہ میں نے یہ واقعہ شعر میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے دو شعر سنائے۔ آپ نے ایک شعر تو صاف پڑھ لیا۔ تیسرے مصرع پر رقت طاری ہوگئی۔ گھگی بندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور بڑی مشکل سے شعر پورا کیا۔ یہ شعر رموز بیخودی میں ہیں ؎

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوت قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی

(فضل کریم خان درانی)

الارض للہ

جنگ سے غالباً پہلے یا شاید جنگ کے دنوں کا واقعہ ہے۔ پنجاب گورنمنٹ انہار پر مربع جات تقسیم کر رہی تھی۔ میں ان دنوں انارکلی میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن مغربی پنجاب

کے ایک پیر صاحب تشریف لائے۔ عموماً آیا کرتے تھے۔ شریف آدمی تھے اور میری ان کی دیرینہ ملاقات تھی۔ کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ایک درخواست لکھ دیں کہ مجھے بھی کچھ مربعے دیئے جائیں۔ علامہ صاحب نے دریافت کیا کہ زمین کس کی ہے؟ پیر صاحب علامہ صاحب کے سوال پر کچھ پریشان سے ہو گئے اور جلدی سے کہنے لگے کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ علامہ نے کہا" پہلے آپ یہ دریافت کر آئیں کہ زمین کس کی ہے۔ پھر میں درخواست لکھ دوں گا" چنانچہ پیر صاحب چلے گئے۔ دوسرے دن پھر آئے اور کہنے لگے" ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا۔ زمین تو گورنمنٹ دے رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین گورنمنٹ کی اپنی ہوگی۔" علامہ نے کہا" شاہ صاحب، ایک کتاب ہے بہت پرانی۔ اس کو لوگ قرآن کہتے ہیں۔ ایک شخص ہمارے یہاں سے دور عرب ملک میں ہوا ہے۔ اس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا یہ کتاب اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ہے۔ اب آپ فرمائیں تو میں اللہ تعالیٰ کے نام چھٹی لکھ دیتا ہوں"۔

پیر کے سینے میں ایمان کی روشنی ابھی باقی تھی۔ وہ بے حد متاثر ہوئے۔ علامہ کی بات سن کر رو پڑے اور کہنے لگے" ڈاکٹر صاحب! کوئی درخواست نہ لکھیں۔ میں زمین کے لئے انگریز سے درخواست نہیں کروں گا"۔

(فضل کریم خان درانی)

قطبِ پنجاب

میں جب ۱۹۳۴ء میں ہائی کورٹ کے کام سے سبکدوش ہو کر پانچ سال کے لیے اس وقت کے وزیر ہند کے محکمے میں لندن گیا، تو میرے محترم دوست سر محمد اقبال بحیثیت مجموعی بخیریت تھے۔ ان کی علالتوں کا دور میری غیر حاضری میں شروع ہوا اور جب میں اپنے بیٹے کی شادی کی تقریب پر رخصت لے کر ۱۹۳۷ء کے اواخر میں ہندوستان آیا، تو میں یہاں آنے کے جلد بعد ان سے ملنے گیا۔ جب میں پہنچا تو وہ ایک

پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور لحاف اوڑھے ہوئے تھے، مگر ان کے وسعت اخلاق کی وجہ سے اس حالت میں بھی مختلف ملاقاتیوں کا ایک گروہ ان کے کمرے میں کرسیوں پر ان کے قریب بیٹھا تھا۔ اس گروہ میں ایک معزز سرکاری عہدیدار اور ایک مالک اخبار اور ایک دو ایڈیٹر موجود تھے اور چند نوجوان طالب علم۔

علامہ مجھ سے بہت محبت سے ملے اور لیٹے لیٹے مجھے گلے لگایا اور اپنی چارپائی پر ہی بٹھا لیا۔ جو ملاقاتی بیٹھے تھے، وہ تھوڑے ٹھہرے اور پھر یہ سمجھ کر شاید مجھے علامہ سے بحیثیت ایک پرانے دوست کے بہت سی باتیں کرنی ہوں گی، یکے بعد دیگرے اجازت لے کر رخصت ہوتے گئے۔ میں نے علامہ کی صحت کا حال پوچھا اور انہوں نے بتایا کہ اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ وہ مجھ سے انگلستان کے قیام کے حالات سنتے رہے اور بعض دوستوں کی بابت پوچھتے رہے اور میرے رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے یہ بھی دعوت دی کہ میں دوسرے دن دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ میں نے بخوشی یہ دعوت قبول کر لی۔

دوسرے دن پھر ان کے ہاں گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس وقت علامہ لیٹے ہوئے نہ تھے، بلکہ اٹھ کر کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے دو اور دوست چوہدری محمد حسین اور بہاولپور کے سادات خاندان کے رکن اور با اثر زمیندار مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ بھی اس موقع پر موجود تھے، جنہیں علامہ نے کھانے میں شرکت کے لئے مدعو کیا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں کھانا آیا، جس میں اقبال صاحب خود بھی شریک ہوئے اور کم از کم اس وقت ایسی اچھی حالت میں تھے کہ کھانا بھی انہوں نے رغبت سے کھایا اور گفتگو بھی دوران طعام بہت دلچسپ ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو ان کی طبیعت دفعتاً تندرست ہو گئی ہے یا انہوں نے میری خاطر اس دن کمزوری اور بیماری کا لباس اتار پھینکا ہے اور پورے صحت مند ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ مخدوم الملک صاحب چونکہ پیرزادہ تھے اور اقبال مرحوم سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا۔
"شیخ صاحب کچھ بتا سکتے ہو کہ اس زمانے کا قطب پنجاب کون ہے؟
میں نے کہا" مخدوم صاحب! یہ محکمہ آپ کی معلومات کا ہے آپ ہی بتائیں"
انہوں نے کہا کہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اقبال صاحب ہی قطب پنجاب ہیں۔
میں نے کہا کہ آپ چونکہ اس راہ سے واقف ہیں، میں آپ کی بات مان لوں گا ورنہ میں اس راہ سے بے خبر ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اقبال کے ہم نشین جن میں میں بھی شامل تھا۔ کبھی کبھی ان کو "قطب از جا نمی جنبد" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے، کیونکہ وہ نقل و حرکت کے معاملے میں بہت تساہل برتا کرتے تھے۔
غرض، اس قسم کے مزاح و تفریح کے بعد وہ بزم مختصر برخاست ہوئی، مگر ان سے رخصت ہوتے وقت یہ معلوم نہ تھا کہ میں ان کو اور وہ مجھ کو آخری مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد میں بیٹے کی شادی کے کاموں میں مصروف ہو گیا اور ان سے پھر ملنے نہ جا سکا اور یہ قلق دل میں رہ گیا کہ یہ خبر ہوتی تو باوجود مصروفیت کے وقت نکال کر دو چار مرتبہ اور ان سے مل لیتا۔

(سر عبدالقادر)

"تکلف برطرف"

میں ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کے ہمراہ لاہور آئی، تو قائداعظم کے پروگرام میں اقبال سے ملاقات بھی شامل تھی۔ میں نے اس سے پہلے اقبال کو لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر دیکھا تھا۔ جب قائداعظم اقبال سے ملنے کے لیے جانے لگے، تو میں نے بھی اقبال سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ ہم دونوں بہن بھائی جاوید منزل پہنچے، تو دیکھا کہ اقبال چارپائی ڈالے برآمدے میں ایک بڑے تکیے پر سر نہیوڑائے اکڑوں بیٹھے ہیں۔ انہیں پہلے صرف یہی معلوم تھا کہ قائداعظم ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ اس لئے وہ اس سے بے پرواہی کے انداز میں بیٹھے رہے، لیکن جب انہیں معلوم

ہوا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں تو انہوں نے تکلف برتنے کی ایک کوشش کی اور لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنے خادم سے فرمایا کہ جاوید اور منیرہ کو بلا لاؤ۔

ہم دونوں بہن بھائی بید کی کرسیوں پر ان کے سامنے بیٹھ گئے اور اقبال پھر اسی بے تکلف انداز میں سر کو تکیے سے لگا کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ غالباً اس وقت ان کی طبیعت خاصی ناساز تھی۔ ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا جسم نحیف نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے پر جلال چمک رہا تھا۔

اس اثنا میں منیرہ اور جاوید بھی آ گئے۔ منیرہ گڑیا کی مانند بالکل معصوم بچی تھی۔ جاوید کی عمر بھی یہی کوئی سات آٹھ سال ہوگی۔ میں نے منیرہ کو پیار کیا تو اقبال کہنے لگے۔ "بچوں کا چھوٹی عمر میں مہر مادری سے محروم رہ جانا بہت دردناک ہے۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ان کی غور و پرداخت اور تعلیم و تربیت میرے لیے بڑا بھاری مسئلہ ہے۔ ولایت میں ایسی درسگاہیں ہیں، جہاں بچوں کو والدین پورے اطمینان کے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ یہاں پر ایسا کوئی انتظام نہیں"۔

اس پر میں نے تسلّی کے چند کلمات کہے، جس پر انہوں نے فرمایا۔ "ہاں۔ دراصل تو خدا ہی ہے، جو مستقبل کا نگہبان ہے"۔

پھر قائداعظم اور اقبال میں سیاسیات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اقبال پر مسائل کے سب گوشے بے نقاب تھے۔

ان کی صحت کے پیش نظر ہم نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان سے رخصت لے کر ہم چلے آئے۔ پچھلے دنوں میں جب جاوید منزل میں گئی، تو مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ جاوید کو یہ سارا واقعہ یاد ہے

(محترمہ فاطمہ جناح)

باعثِ رحمت

(میں اپنی چچی (والدہ جاوید) کے پاس بیٹھا تھا۔ اتنے میں منیرہ کھیلتے کھیلتے اندر آگئی

اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چچی نے منیرہ سے کہا "بیٹی، اِدھر آؤ، میں تیرے کنگھی کر دوں" منیرہ کو بالوں میں کنگھی کرانے سے بڑی چڑ تھی۔ وہ کنگھی کرانے سے بچنے کی خاطر باہر بھاگنے لگی تو چچی نے اسے پکڑ کر بٹھا لیا اور بالوں کو کنگھی سے سلجھانا اور سنوارنا شروع کر دیا۔ اس پہ منیرہ رونے لگی۔

علامہ اقبال بیٹی کے رونے کی آواز سن کر اندر آ گئے اور منیرہ کے رونے کا سبب پوچھنے لگے۔ چچی نے کہا کہ بالوں میں کنگھی کرانا نہیں چاہتی۔ علامہ نے فرمایا "کنگھی کرائے یا نہ کرائے، مگر اس کو رونے نہ دیا کرو۔ میں اس کے رونے کی آواز نہیں سن سکتا، دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ علامہ لڑکی کے وجود کو "باعث برکات لامحدود" سمجھتے تھے۔

ان کے شفقت و محبت کے اس جذبہ میں رسول اللہ صلعم کے مقدس اسوہ کی جھلک پائی جاتی تھی۔

(شیخ اعجاز احمد)

پیش گوئی

علامہ کی صحبت میں کشمیر کی سیاسی تحریک پر گفتگو ہو رہی تھی۔ علامہ موصوف فرمانے لگے کہ میں نے کشمیر کے متعلق جو نظم "ساقی نامہ" نشاط باغ میں بیٹھ کر لکھی تھی، اس میں ریشم ساز کارخانوں اور کاریگروں کا ذکر بھی شامل تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعد میں کشمیر کی سیاسی تحریک وجود میں آئی، تو اس کی ابتدا ایک ریشم کے کارخانے میں کاریگروں کی بغاوت سے ہوئی۔

علامہ کی شہرہ آفاق تصنیف "پیام مشرق"، جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی، کا نسخہ جس پہ علامہ کے دستخط بھی ثبت ہیں، میرے پاس موجود تھا۔ میں نے "ساقی نامہ" کو بہ نظر غائر دیکھا تو اس کے مندرجہ ذیل تین اشعار نے میرے دل میں علامہ کے اس ارشاد کی اہمیت میں اور اضافہ کر دیا۔

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد زسنگ مزارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے
ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

پھر چند سال قبل مجھے آزاد کشمیر جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے مظفر آباد میں ایک معزز کشمیری ڈاکٹر عبدالواحد صاحب سے سوال کیا کہ وہ کشمیر کی تحریک کے بالکل ابتدائی وجوہ اور اسباب پر روشنی ڈالیں۔ اس پر انہوں نے ایک مفصل مضمون قلمبند کر کے میرے حوالے کر دیا، جو اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ "پیام مشرق" کی اشاعت کے ایک سال بعد ۱۹۲۴ء میں اس تحریک کا آغاز ریشم کے کارخانے کے مزدوروں کی ہڑتال اور بغاوت سے ہوا۔ حکومت نے احتجاج کرنے والے مزدوروں اور شہریوں پر گولی چلوا دی، جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ حالات پولیس کے قابو سے باہر ہو گئے تو فوج طلب کر لی گئی، جس نے کشمیری عوام پر خوب تشدد کیا۔ انجام کار یہ تحریک دبنے کی بجائے پھیلتی گئی اور کشمیری عوام میں خود داری کا خوابیدہ احساس بیدار ہو گیا اور یہی وہ جذبہ تھا، جو وقت گزرنے کے ساتھ مضبوط اور پختہ ہوتا چلا گیا۔

(ممتاز حسن)

حدیث جبریل

ان کے بعض معاملات بڑے ہی عجیب تھے۔ وقتاً فوقتاً گردے یا نقرس کا درد ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ گرمیوں میں گردے کی تکلیف ہوئی اور وہ کئی روز بیمار رہے۔ میں دوپہر کے وقت دفتر جاتے جاتے مزاج پرسی کے لئے حاضر خدمت ہوا۔ میکلوڈ روڈ

والی کوٹھی میں ان کی خواب گاہ کے پیچھے ایک کمرہ تھا، جس کا دروازہ شمالی جانب تھا۔ اس میں تپش بہت کم ہوتی تھی۔ فرش پر خوب پانی ڈلوا کر اس کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے خاموش بیٹھ کر ان کے چہرہ مبارک پر نظر جمالی۔ ہم لوگ عموماً ان کی نگاہوں سے حالات کا اندازہ کرنے کے عادی تھے۔ اس اثنا میں ایک اور صاحب بھی عیادت کے لیے آگئے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ یکایک حضرت مرحوم نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا "مہر صاحب، تکلیف انسان پر اس کے نفس کی طرف سے آتی ہے یا اللہ کی طرف سے" میں جواب میں حدیث جبریل سے وہ الفاظ دہرا دینا چاہتا تھا، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے سوال پر فرمائے تھے۔ یعنی "ما المسئول با علم من السائل"

"جس سے پوچھا گیا ہے، اس کا علم پوچھنے والے سے زیادہ نہیں"۔

لیکن میں کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ جو صاحب میرے پاس بیٹھے تھے، بول اٹھے "ڈاکٹر صاحب، سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے"۔ یہ سنتے ہی ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ پہلے چیخ نکلی، پھر روتے روتے کہتے جاتے "اگر یہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے، تو میری توبہ، میری توبہ، میری توبہ، میں نے کیوں شکوہ کیا، طبیعت کے معمول پر آنے پر پانچ سات منٹ صرف ہو گئے۔

سوال یہ نہیں کہ عیادت کے لیے آنے والے صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ درست تھا یا نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ ہر بات کا ایک مقام اور محل ہوتا ہے اور بیمار کے تصورات و احساسات کا صحیح اندازہ کئے بغیر ایسی بات کہہ دینا، جو باعث راحت و اطمینان نہیں، باعث زحمت و پریشانی ہو، قطعاً مناسب نہ تھا۔

(غلام رسول مہر)

اقبال اور گرامی

مولینا گرامی فارسی شاعری میں اپنے وقت کے خیام اور نظیری تھے۔ ان کا اصل

نام غلام قادر تھا اور وطن ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) علامہ اقبال سے ان کے مراسم آخر دم تک بہت زیادہ خوشگوار رہے، وہ جب کبھی لاہور آتے، علامہ کے مکان پر قیام فرماتے۔ آپس میں کسی طرح کی معاصرانہ چشمک نہیں تھی، انتہائی اخلاص و مودت کے تعلقات و روابط تھے۔ انار کلی والے مکان میں انہیں اکثر علامہ کے ہاں فروکش دیکھا گیا۔ علامہ اور مولینا گرامی کے متعلق ایک شعر ان کی وفات پر بہت مشہور ہوا اور میں نے جب سنا تو اسی وقت یاد ہو گیا اور اب تک یاد ہے، بلکہ حرزِ جان ہے ؎

صبا! بہ حضرتِ اقبال ایں پیام دہ
کہ رفت جانِ گرامی و تو ہنوز خموش!

مولینا گرامی درویش صفت انسان تھے۔ وہ لاہور تشریف لاتے تو علامہ کی قیام گاہ پر علم و فکر کی محفلیں خوب گرم رہتیں۔ انہیں فارسی زبان و ادب پر بڑا عبور تھا۔

میرے دوست راحت بخاری صاحب، جو لاہور کے رہنے والے ہیں اور گزشتہ ۲۵ سال اقوام متحدہ کے مختلف شعبوں میں فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ اب پاکستان آ چکے ہیں۔ انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ میں ڈاکٹر تاثیر اور ایک دوسرے ہم سن نوجوان کے ساتھ علامہ اقبال کی خدمت میں بڑی عقیدت کے ساتھ حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز ہم چند دوست میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر پہنچے تو علامہ کمرے میں تشریف رکھتے تھے۔ باہر چند ملاقاتی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب نے علامہ اقبال اور مولانا گرامی کے تعلقات و روابط کا ذکر چھیڑ دیا اور دوران گفتگو میں کہا کہ مولینا گرامی نے اقبال کے متعلق یہ اشعار کہے ہیں ؎

درس ماضی از کتابِ حال گیر
ساغر از خم خانۂ اقبال گیر
حضرت اقبال، آں بالغ نظر
دارد از بود و نبودِ ما خبر

ما بہ ذوقِ سوختن کم سے خنیم!
بے خودی را از خودی نشنا ختیم
آں نوا پرداز اسرارِ ازل
شہسوارِ عرصۂ علم و عمل!
بیخودی را در خودی منزل شناس
در غبارِ کارواں محمل شناس
از نوائش بزمِ یورپ در خروش
حکمتِ امریکہ او را سفتہ گوش
نالہائے آتشینِ آں حکیم!
سوخت رختِ فتنۂ امید و بیم

ساخت با دلہا و بودش ہیچ نیست،
سوخت دل ہا را و دردش ہیچ نیست
(گرامی)

علامہ کے متعلق مولینا گرامی کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہوا ہے :–

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

(بنقل سید وحید الدین)

غالب اور رومی

علامہ پر کبھی کبھی عمیق غور و فکر بلکہ یوں کہیے، استغراق کی ایسی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور ماحول سے یکسر غافل ہو جاتے۔ آخر عمر میں ان کے دل و دماغ پر اس کیفیت کا غلبہ اور زیادہ ہونے لگا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے کمرے میں حسبِ معمول نیم دراز تھے اور کوئی ملاقاتی

اس وقت موجود نہ تھا۔ اپنے دیرینہ خادم علی بخش کی آہٹ سن کر وہ چونک پڑے اور اسے مخاطب کر کے فرمایا: علی بخش میرے پاس مرزا غالب بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ جلدی جاؤ، اور انہیں واپس بلا لاؤ۔ علی بخش ایک فرمانبردار اور سادہ لوح خادم، علامہ کا حکم سنتے ہی باہر لپکا اور ادھر ادھر دیکھ کر بظاہر مرزا غالب کی تلاش میں ناکام واپس آگیا اور کہا "غالب صاحب مجھے نہیں ملے"۔

علامہ نے فرمایا "بھئی! تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہ ابھی تو میرے پاس اس کرسی پہ بیٹھے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہے ہیں"۔

انتقال سے چند روز قبل بھی اس نوعیت کا واقعہ پیش آیا۔ اس دفعہ انہوں نے مولینا رومیؒ کے متعلق علی بخش سے کہا کہ وہ ابھی میرے پاس سے گئے ہیں۔ انہیں واپس بلا لاؤ۔ اس بار بھی علی بخش مہمان کے خیالی پیکر کو باہر ڈھونڈ کر ناکام واپس آگیا۔ علامہ کے استغراق کی یہ کیفیت تھی کہ انہوں نے نہ اپنی ہدایت پر کوئی توجہ دی نہ علی بخش کے جواب کو غور و فکر کی اہمیت کا مستحق سمجھا۔

(فقیر سید وحید الدین)

تمنائے بیتاب

علامہ اقبال حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ نبویؐ کی بڑی تمنا رکھتے تھے مدینے اور مدینے والے کا نام سن کر ان کی آنکھیں بے اختیار نمناک ہو جاتیں ۱۹۳۷ء میں بہاولپور کے ایک پیر صاحب، جن سے علامہ صاحب کے مراسم تھے، حج کی تیاریوں میں مصروف تھے وہ جو امیر مینائی نے کہا ہے ؎

جب مدینہ کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے یہ پہنچا، میں رہا جاتا ہوں

تو پیر صاحب کے سفر حرمین شریفین کی تیاری کو دیکھ کر یہ شوق اور تیز ہوگیا۔ بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا۔ طبیعت ذرا اچھی ہوتی تو پیر صاحب کے ساتھ حجاز جانے کا اچھا

موقع تھا۔ پھر کہا "عراق ہو کر بھی لوگ حجاز جاتے ہیں، مگر میں نے دریافت کرایا، تو معلوم ہوا کہ اس راستے میں دشواریاں ہیں۔ علامہ کی بہن نے جو میری پھوپھی ہیں کہا" عام صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھوں میں پانی بھی تو اتر رہا ہے۔ ایسی حالت میں حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اللہ خیر رکھے، اگلے سال آپریشن کے بعد چلے جایئے گا"۔ اس پر بڑے درد انگیز، مگر پُر شوق لہجے میں فرمایا "آنکھوں کا کیا ہے، آخر اندھے بھی تو حج کر ہی آتے ہیں"۔

اتنا کہنے کے بعد آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔ گویا کہ ایک ایک آنسو مولینا جامیؒ کے انداز میں زبانِ حال سے کہہ رہا تھا ؎

نسیما! جانب بطحا گزر کُن
ز احوالم محمدؐ را خبر کُن

(شیخ اعجاز احمد)

آپریشن

علامہ اقبال کی ایک آنکھ بچپن ہی سے کمزور تھی ۱۹۰۱ء میں جب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوئے تو طبی بورڈ نے آنکھ کی بینائی کمزور ہونے کے سبب ان کو سرکاری ملازمت میں لیے جانے کی سفارش نہیں کی یہ بظاہر ایک طرح کی ناکامی تھی، مگر علامہ کے مستقبل کے تابناک اور کامیاب ہونے کا پیش خیمہ تھی سرکاری ملازمت میں وہ کمشنر اور گورنر بن سکتے تھے، مگر "ترجمان حقیقت اور حکیم مشرق" غالباً نہ بن سکتے تھے۔

زندگی کے آخری برسوں میں آنکھ میں پانی اترنا شروع ہو گیا تھا، ۱۹۳۷ء کے آغاز میں موتیا بند کی اس قدر شدت ہو گئی کہ معالجوں نے لکھنے پڑھنے کی بھی ممانعت کر دی۔ ڈاکٹر متھرا داس موگا والے آنکھوں کے علاج میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ اس شہرت، عزت اور فنی مہارت کے باوجود بڑے خلیق اور وضع دار تھے۔ شیخ اعجاز احمد

سے ان کے تعلقات تھے۔ شیخ صاحب کے ایما پر ڈاکٹر صاحب علامہ کی کوٹھی پر خود ہی تشریف لے آئے اور آنکھوں کا کامل یکسوئی کے ساتھ معائنہ کیا۔

ڈاکٹر مظفر اداس نے رائے ظاہر کی کہ موتیا بڑی تیزی سے اتر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ مارچ ۱۹۳۸ء میں آپریشن کے لائق ہو جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ فروری ۱۹۳۸ء میں وہ پھر معائنہ کریں گے اور اطمینان دلایا کہ جب بھی آنکھ آپریشن کے لائق ہو جائے گی۔ وہ خود نہایت عمدگی کے ساتھ آپریشن کریں گے اور امید ہے کہ پوری بصارت عود کر آئے گی۔

علامہ صاحب نے شیخ صاحب کو ڈاکٹر مظفر اداس کی رائے سے مطلع کرتے ہوئے لکھا کہ ڈاکٹر صاحب نہایت خوش اخلاق آدمی ہیں اور میں خوش ہوں کہ تم اپنے تعلقات کے لئے ایسے با اخلاق آدمیوں کا انتخاب کرتے ہو۔

چونکہ ۱۹۳۸ء کے شروع ہی سے علامہ پر دمے کے شدید دورے پڑنے لگے۔ لہذا آپریشن ستمبر ۱۹۳۸ء تک ملتوی کر دیا گیا۔ مگر ستمبر کے آنے تک وہ آنکھیں قیامت تک کے لئے بند ہو گئیں۔

(فقیر سید وحید الدین)

آخری لمحات

۱۵ اپریل کو علامہ کی حالت خراب ہونی شروع ہو گئی۔ تھوک میں خون آنے لگا اور نبض بہت ضعیف ہو چکی تھی۔ شام کو جب میں نے اور تین چار ڈاکٹروں نے دیکھا تو حالت اطمینان بخش نہیں تھی۔ تاہم حواس اس طرح صحیح و سالم تھے کہ ظاہری حالت میں کوئی خاص تغیر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں اس رات بارہ بجے تک پاس بیٹھا رہا۔ چودھری محمد حسین صاحب، سید نذیر نیازی صاحب، پروفیسر مظفر الدین صاحب، اور میاں محمد شفیع صاحب بھی موجود تھے۔ ایک آدھ دفعہ میں نے اجازت چاہی تو فرمایا کہ ابھی ٹھہریں۔

جب ڈاکٹر صاحب کی طبیعت قدرے بحال ہو گئی تو میں اجازت لے کر اپنے رفقاء کے ساتھ چلا آیا۔ میرے آنے کے بعد کچھ دیر تک نیند آئی۔ پھر آنکھ کھل گئی اور بے چینی

شروع ہوئی۔ تین بجے کے قریب میاں محمد شفیع صاحب کو میرے پاس بھیجا۔ مکان کا دروازہ بند تھا۔ باہر ملازم سویا ہوا تھا۔ شفیع صاحب نے اسے کوئی غیر معمولی آدمی سمجھ کر نہ جگایا۔ اور چند آوازیں دیں اور جواب نہ پاکر واپس چلے گئے۔ جب شفیع صاحب ویسے ہی واپس چلے گئے تو فرمایا کہ افسوس قرشی صاحب بھی نہیں پہنچ سکے۔ اس کے بعد پونے چار بجے راجہ حسن اختر صاحب کو بلوایا اور ان سے فرمایا کہ قرشی صاحب کو بلالیں۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ رات بہت دیر سے گئے ہیں۔ اس وقت ان کو بیدار کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس پر وہ قطعہ ارشاد فرمایا، جس کی بہت شہرت ہو چکی ہے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب نے اس قطعہ کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا کہ میں ابھی حکیم صاحب کو لا رہا ہوں۔ وہ چار بج کر پانچ منٹ پر جاوید منزل سے نکلے۔ اس کے بعد فرمایا کہ پلنگ، ساتھ کے کمرے میں لے چلو۔ جب اندر پلنگ لے گئے تو فرمایا۔ کندھا دبایا جائے۔ علی بخش نے شانہ دبایا۔ اس کے بعد ہی فرمایا کہ دل پر تکلیف ہے۔ اس کے ساتھ پانچ بجکر چودہ منٹ پر جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

میں جاوید منزل پہنچا تو معلوم ہوا کہ طلوعِ آفتاب کے ساتھ علم و ادب کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا ہے۔

(حکیم محمد حسن قرشی)

تدفین

حکیم الامت کے عقیدت کیش جاں نثار :..... اور دیگر متعلقین نے یہ فیصلہ کیا کہ شاہی مسجد کی سیڑھیوں کے قریب حکیم الامت کی آرام گاہ بنے۔ موزوں ترین مقام یہی ہو

سکتا ہے۔ صوبائی حکومت کے سربراہ سر سکندر حیات خان نے اس فیصلے سے اتفاق نہ کیا وہ پنجاب سے باہر دورہ پر تھے کہ میاں امیرالدین نے ان سے تار کے ذریعے مذکورہ مقام پر تدفین کی اجازت طلب کی۔ لیکن انہوں نے نفی میں جواب دیا اور یہ متبادل تجویز پیش کی کہ اسلامیہ کالج کے میدان میں اس مقصد کے لیے کسی مقام کا انتخاب کیا جاسکتا ہے مگر مسلمانانِ لاہور کی دلی آرزوؤں کا احترام کرتے ہوئے علامہ کے عقیدت کیش اپنے فیصلے پر جمے رہے۔ اس اثنا میں حیرت ناک صورتِ حال یہ پیش آئی کہ خود گورنر صوبہ سرہنری کریک نے بروقت ان کے ساتھ ہمدردانہ تعاون کیا۔ اس شریف النفس انگریز کی مدد سے ان تمام مشکلات پر قابو پا لیا گیا، جو محکمہ آثار قدیمہ سے گفت و شنید کے سلسلے میں پیش آئیں۔ کیونکہ یہ مقام اس محکمے کی زیر نگرانی تھا۔ مختصر یہ کہ حکیم الامت کی تدفین کے لیے مطلوبہ مقام کی اجازت مل گئی۔ اس آرام گاہ کے انتخاب سے حکیم الامت کی وہ آرزو بھی پوری ہو گئی جس کا اظہار موصوف نے اپنی بصیرت کی بنا پر ان اشعار میں کیا ہے

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بے تابِ من
بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغازم انجامم نگر

(خواجہ عبدالرحیم)

زندہ رُود

(۱) قیمت ۵۰ روپے

حیاتِ اقبالؒ کا تشکیلی دور

زندہ رُود

(۲) قیمت ۵۰ روپے

حیاتِ اقبالؒ کا وسطی دور

زندہ رُود

(۳) قیمت ۱۰۰ روپے

حیاتِ اقبالؒ کا اختتامی دور

سوانح اقبالؒ کی ترتیب کا تین جلدوں پر مشتمل یہ سلسلۂ کُتب **جاوید اقبال** کی نو برس کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ تینوں جلدیں علامہ اقبالؒ کی نجی اور فکری زندگی سے حقیقی معنوں میں شناسائی کے لیے ایک کلید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پس حیاتِ اقبالؒ کے موضوع پر اگر آپ کسی مستند تحریر کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اِس سلسلۂ کُتب سے استفادہ کیجیے، کیوں کہ یہ اقبالیاتی ادب میں ایک اچھوتا اضافہ ہے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز

لاہور • حیدر آباد • کراچی

یومِ اقبال کی تقریبات پر
حضرت علامہ کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت

کلیاتِ اقبال

حضرت علامہ اقبال کے اردو و فارسی کلام کے
تمام مجموعوں کو پہلی بار
عمدہ آفسٹ پیپر پر فوٹو آفسٹ کتابت و طباعت کے ساتھ
دو دیدہ زیب جلدوں میں
اشاریہ (انڈکس) کا گراں قدر اضافہ۔ کلام کی
صحت کا خاص اہتمام۔ قیمتیں کم سے کم۔

تاکہ

قارئین زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔

کلیاتِ اقبال اردو -/۷۵ روپے

کلیاتِ اقبال فارسی -/۱۲۰ روپے

ادبی مارکیٹ • چوک انارکلی • لاہور

مئے لالہ فام

سائز: ۵" × ۹½" - صفحات ۴۰۰

از: ڈاکٹر جاوید اقبال

موجودہ مقالات ڈاکٹر صاحب موصوف نے علامہ اقبال کی تعلیمات نیز نظامِ حکومت کے اسلوب کو علی الترتیب اور منظم طور پر جمع کِیا ہے۔

یہ مقالات علامہ اقبالؒ کی ان تعلیمات کے عکاس اور آئینہ دار ہیں جو اب تک سامنے نہ آ سکے تھے۔

کاغذ سفید۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز

لاہور ◉ حیدرآباد

کراچی